قومی اردو کونسل کا کثیر الاشاعتی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ماہنامہ اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

جنوری 2016، قیمت -/15₹

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ◆ کامکس کہانی ◆ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

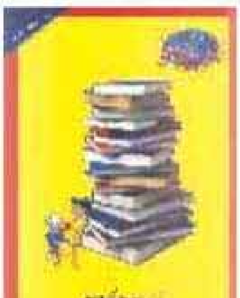

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

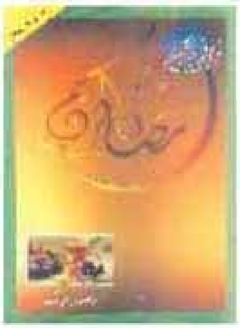
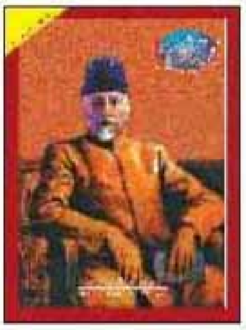

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:18، شمارہ:01، جنوری 2016

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

قیمت-/[illegible] روپے سالانہ-/[illegible] روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in, ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، قصر وقف، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1، چھتر گنج، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

اردو کا سورج کبھی نہیں ڈوبے گا: پروفیسر ظفر حبیب — فاروق اعظم قاسمی 8

کور اسٹوری:

18ویں قومی اردو کتاب میلہ — شاہد اختر انصاری 11

زبان و تعلیم

اردو میں دفتری و انتظامی وضع اصطلاحات کی ضرورت — اسلم جاوداں 21

آموزش بذریعہ امداد باہمی — ریاض احمد 24

سلسلۂ صحافت

جموں و کشمیر میں اردو صحافت — عارفہ بشریٰ 28

خراج عقیدت

حالی کی شاعری میں 'ہندوستانیت' — سراج نقوی 32

ادبی مباحث

احتشام حسین کا تنقیدی نظریہ — شاہد پٹھان 34

عربی و اردو میں فکشن کا آغاز — حدیث انصاری 37

ادبی تحقیق میں خاکہ تحقیق کی اہمیت — اقبال النسا 40

اردو تحقیق کے مسائل — شاہ نواز عالم 42

نقد و نظر

جگت موہن لال رواں کی شاعری — عائشہ پروین 44

رام لعل کی حقیقت نگاری — محمد ثاقب انور 47

تہذیب و ثقافت

روہیل کھنڈ کے مسلم معاشرے میں لوک گیتوں کی روایت — محمد فرقان سنبھلی 50

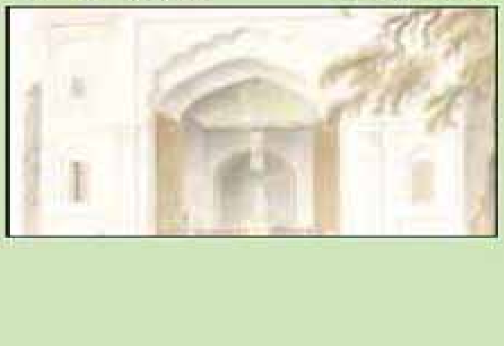

صنعت و حرفت

مرادآباد کی پیتل صنعت — ذاکر فیضی 54

صحت

مقوی قلب غذائیں — شمس الاسلام فاروقی 57

فلم

ہندوستانی سنیما کا آخری مغل کمال امروہی — انیس امروہوی 60

کوئز

ادبی کوئز — زیب النسا سعید 65

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 67

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ 79

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 80

ہماری بات

بیم موج امکانی میں
اگلا پاؤں نئے پانی میں (راجیندر منچندا بانی)

زندگی ایک تسلسل سے عبارت ہے۔ سنہ و سال میں اس کی تقسیم کا مقصد ماضی کا محاسبہ اور مستقبل کے امکانات کے سفر کو جاری رکھنا ہے۔ ہر ایک لمحہ تازہ ہوتا ہے اور ایک فاصلے میں وہ لمحہ پھر پرانی ساعتوں میں مدغم ہو جاتا ہے۔ گزرا ہوا لمحہ ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ ہر ایک لمحہ ہمارے لیے بیش قیمت ہے۔ ان لمحوں کا اگر مثبت استعمال کیا جائے تو زندگی کی نئی منزلوں کا پتہ مل سکتا ہے۔ ہر لمحہ ہمیں ایک مثبت احساس کے ساتھ آگے کی طرف بڑھنے کے لیے مہمیز کرتا ہے کہ مثبت احساس ہی زندگی کی تمام دشواریوں کو آسان کر سکتا ہے۔ ہم اپنے ذہن کی مثبت توانائیوں کا استعمال کرکے اپنے خوابوں میں نیا رنگ بھر سکتے ہیں۔

آج کی زندگی میں انسان مثبت اور منفی قوتوں کی کشمکش کا شکار ہے۔ منفی ذہن کو پوری دنیا ایک سیاہ رات کی مانند نظر آتی ہے جبکہ مثبت ذہن رکھنے والا ہر صبح ایک نئے سورج کی روشنی سے اپنے وجود کو منور کرتا ہے اور مثبت احساس کی قوت سے بڑے سے بڑے چیلنجز کا مقابلہ کرتا ہے۔ امید و یقین کے ساتھ وہ نئی منزلوں کی جستجو میں نکلتا ہے تو ہر محاذ پر سرخرو اور کامران ہوتا ہے۔ مثبت احساس کامرانی کی کلید ہے۔ زبان کے تعلق سے بھی ہمارے لیے مثبت احساس نہ صرف ایک بڑا محرک ہے بلکہ اسی احساس کے ساتھ ہم زبان و ادب کے باب میں ایک نئی تاریخ رقم کر سکتے ہیں۔

اردو زبان نے بھی اپنے مثبت احساس کی وجہ سے ہی ارتقا کی اتنی لمبی مسافت طے کی ہے کہ آج یہ دنیا کی اہم ترین زبانوں میں سے ایک ایسی زبان بھی جاتی ہے جس کے پاس وافر علمی ذخیرہ ہے۔ ادبیات کا خزانہ ہے۔ دنیا کے بیشتر سائنسی، تکنیکی، علوم و فنون بھی اس زبان میں منتقل ہو چکے ہیں اور یہی وہ سخت جان زبان ہے جس نے نامساعد حالات میں بھی نہ صرف اپنے وجود کو برقرار رکھا ہے بلکہ اپنے دائرے کو اتنی وسعت دی ہے کہ اب اردو کی نئی بستیاں آباد ہو گئی ہیں اور ان بستیوں میں اردو کی شمع جل رہی ہے۔ اردو کا چراغ آندھیوں میں بھی روشن ہے۔ دراصل اردو کے پاس وہ مثبت قوت ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے آگ بھی گلزار ہو گئی ہے۔ اردو زبان کی صبر آزما جدوجہد سے سبق لیتے ہوئے نئے سال میں ہمیں بھی منفی قوتوں سے متصادم ہوئے بغیر تحرک اور مثبت سوچ کے ساتھ آگے بڑھنا ہے اور اردو کے فروغ کے لیے نئے منصوبے اور خاکے تیار کرنے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے بھی نئے سال کو ایک نئے چیلنج کے طور پر قبول کیا ہے۔ نئے سال میں کونسل اردو زبان کے فروغ کے لیے کچھ ایسے اقدامات کرے گی جس سے اردو زبان کا نہ صرف دائرہ وسیع ہوگا بلکہ ان علاقوں تک اردو زبان پہنچ گی جو برسوں سے اس شیریں زبان اردو کی راہ تک رہے ہیں۔ جن کے دل میں اردو کے لیے بے پناہ جذبہ ہے مگر کچھ وجوہات کی بنا پر اردو کی رسائی ان علاقوں تک نہیں ہو پائی ہے۔ نئے سال میں قومی کونسل کا یہ عزم بھی ہے کہ مختلف علاقائی زبانوں کے اشتراک سے وہ ایسے منصوبے تیار کرے گی جس سے زبانوں کی دیواریں گر جائیں اور ایک ہی آنگن میں ساری زبانوں کو فطری نمو کی قوت کے ساتھ کھلنے پھولنے کے مواقع ملیں۔ قومی کونسل اردو کے فروغ کے لیے مختلف زبانوں کی اکادمیوں کے اشتراک سے علمی اور ثقافتی تبادلے کی ایک صورت بھی نکالے گی تاکہ ہندوستان کی تمام زبانیں ایک دوسرے کے احساس و اظہار میں شریک ہو کر اپنے لسانی اور فکری دائرے کو وسعت بخش سکیں۔ کتاب کلچر کا احیا اور نئے، نامعلوم قاری کی دریافت بھی کونسل کے منصوبے میں شامل ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ نئے سال میں نئی امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ اردو کا قافلہ آگے بڑھے گا اور ہمارا مثبت احساس ہماری راہ کی تمام دشواریوں کو آسان کر دے گا۔

آیئے نئے سال میں ہم ایسا عہد کریں کہ اردو کی دستک ہر دروازے پر سنائی دے۔
نیک تمناؤں اور خواہشات کے ساتھ اردو دنیا کے قارئین کو نیا سال مبارک!

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

گلشن وبھلاک
کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-1، پٹیالہ

'اردو دنیا' دسمبر 2015 کے شمارے میں اپنے پسندیدہ شاعر عرفان صدیقی پر آشوتوش سریواستو کا مضمون پڑھا اور محظوظ ہوا۔ موصوف کے بموجب عشق کے ضمن میں عرفان صاحب میں مکمل وحدیت، بالخصوص محبوب کی کم سخنی ہی دستیاب ہوتی ہے، جب کہ فراق گورکھپوری صاحب کی شاعری میں بھی کم سخنی تو عاشق میں بھی ملتی ہے۔ فراق کا جدائی سے متعلق یہ ایک شعر سیکڑوں اشعار پر وزنی ثابت ہو سکتا ہے۔ "اس کی رخصت کے وقت اف ری زباں ر اس سے بس اتنا ہی کہہ سکے۔ "اچھا۔""

اس مقالے میں موصوف نے جناب عرفان صدیقی کی تشبیہات کی تحسین کی ہے۔ ان کا شعر لائق حوالہ ہے۔ "کبھی تو کوئی پڑھے گا لکھا ہوا میرا/ کبھی تو کام یہ شوق فضول بھی دے گا۔"

جناب سید اقبال امروہی کا مضمون نرگسیت کے منفی پہلو کا بہت کا حامل ہے۔ ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ سے بھی آگے جا کر ڈاکٹر ایرن جی پلی کے اس بلند خیال کا بھی حاصل لائق ستائش ہے کہ انانیت کے جذبے میں خود اعتمادی بسا اوقات چند اشخاص کو ڈکٹیٹر بنا کر بین الاقوامی شہرت بھی بخش سکتی ہے۔

میں شہرۂ آفاق انگریزی ناول نگار جین آسٹن کے ناول 'پرائڈ اینڈ پریجوڈس' کی بہت سال قبل دہلی دور درشن سے پیشکش 'ترشنا' سیریل نام سے بہت مقبول ہوئی تھی) کی اہم تھیم (Theme) اور ہیرو کی انا پرستی سے وابستہ اس شاندار مرکزی خیال کو یہاں درج کر رہا ہوں کہ "جہاں اصلی بالا دستی یا برتری (superiority) ہوا کرتی ہے وہاں انا یا غرور ہمیشہ اچھے پیرائے میں رہتا ہے۔"

"Where there is a real superiority of mind, pride will be always under good regulation."

مقالہ نگار امروہی صاحب نے خود اعتمادی کی اسی خصوصیت کو 'آمرانہ رجحان پیدا کر سکنے والی' (ص 55) ٹھہرا کر اپنے نفسیاتی مطالعے کو مزید بلند و ارفع کر دیا ہے۔

ادارے نے اس نفسیاتی مضمون کے بعد ہی انا پرست خاتون سروجنی بائی ہیروئین والی مراٹھی کہانی شائع کر کے حیران و ششدر کر دیا ہے۔ دنیا میں بسا اوقات اسی طرح انا پرست وجود ہیں اور نارسیسس فطرت کے اشخاص کسی مسئلے کو حل کرنے میں سروجنی بائی کی طرح قاصر و ناکام ہوتے ہیں۔ اس امر کا نفسیاتی تجزیہ مراٹھی کہانی کار جناب و۔س۔ کھانڈیکر کی اس کہانی میں کیا گیا ہے۔

نومبر ماہ کے شمارے میں شائع میرے مراسلے میں افریقی پوئٹ کی محولہ سطور میں۔ 'بچے میں ایک ماں' کی بجائے ... 'بڑے سو پیڑا (درد زچگی) میں ایک ماں'.. یہ الفاظ درکار ہیں تصحیح کرنے کی زحمت فرمائیں۔

کلی طور پر یہ شمارہ بھی اپنے معیار پر کھرا اترتا ہے۔ 'ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے...!'"

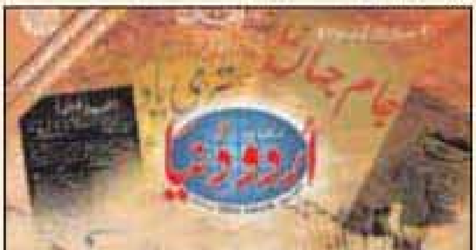

سید معراج جامی
A-301، دوسری منزل، صائمہ شاپنگ سینٹر، گلشن اقبال، بلاک 3، کراچی (پاکستان)

اردو دنیا کا دسمبر 2015 کا شمارہ 'اردو صحافت..... نقش و رفتار' پر مشتمل ہے۔ یہ ایک بہت وقیع اور کارآمد دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود انتہائی جامع ہے۔ ظہیر احمد صدیقی صاحب نے خواجہ احمد فاروقی صاحب پر جو خاکہ لکھا ہے اسے پڑھ کر بہت لطف آیا اور بہت سی باتوں کا علم ہوا۔ ان کی ذاتی زندگی کی تصویر کشی بہت ہی مہذب انداز میں کی گئی ہے۔ ان کے ادبی کارنامے بھی بہت وقیع ہیں۔ نرگسیت کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ سید اقبال امروہوی صاحب نے نرگسیت کے منفی پہلو پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ ویسے نرگسیت خود ایک منفی عمل ہے اور اس پر کاربند انسان سے کسی مثبت انداز فکر کی توقع عبث ہے۔ تاہم نرگسیت کے بارے میں بڑی معلوماتی تحریر پڑھنے کو ملی ہے۔

خورشید حیات
چیف کنٹرولر، ساؤتھ ایسٹ سنٹرل ریلوے زون، بلاسپور

اردو دنیا دسمبر 2015 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اردو صحافت سے جڑے سنہرے حروف چہروں کی یادیں تازہ ہو گئیں کہ ان یادوں میں ہی ادب زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ 'اردو صحافت: نقش و رفتار' کو بہت قریب سے جب دیکھا، ورق ورق کو پڑھا تو میں آرہ بہار پہنچ گیا، جہاں سے 1853 میں اردو کا اخبار 'نور الانوار' نکلا کرتا تھا۔ غدر سے پہلے کا یہ وہ دور تھا جب صحافت کاروبار نہیں، سنہری تہذیب کا ایک جنون تھا۔ 'انقلاب' سے بہت پہلے ہی بہار جو ابتدا تا حال ادب و صحافت کی راجدھانی رہا ہے، مجھے مسلم پور کے یونین پریس، باگی پور کے مولوی شرف الدین، دریاپور کے مولوی رحیم الدین کے سے ڈھیر سارے چہروں کی یاد ستانے لگی، جنھیں میں نے دیکھا نہیں ورق ورق ان صحافی چہروں کو پڑھا ضرور ہے۔ نئی صدی کا آدمی جو ماضی کی طرف پیٹھ کر کے سفر کر رہا ہے، اس کے لیے یہ شمارہ ماضی کی ادبی صحافت دیکھنے کے لیے موقع فراہم کرتا ہے۔

مضامین میں صالحہ رشید، اسد رضا، ظہیر انور اور محمد یوسف وانی نے متاثر کیا۔ پروفیسر اصغر عباس صاحب کا انٹرویو بھی خوب ہے۔ خصوصی شمارہ کے لیے اردو دنیا پریوار مبارکباد کا مستحق ہے۔

سلیم انصاری
ایچ آئی جی 3، آنند نگر، ادھرتال، جبل پور، مدھیہ پردیش

اردو دنیا کا دسمبر 2015 کا شمارہ اردو صحافت کی سمت و رفتار پر مشتمل ہے اور اس اعتبار سے اہمیت کا حامل بھی کہ اس میں اردو صحافت کے تقریباً تمام تر گوشوں پر مضامین شامل ہیں۔ اس شمارے میں جو مضمون زیادہ متاثر کرتا ہے وہ اردو صحافت میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ نہ صرف اردو صحافت بلکہ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں غیر مسلم اردو داں حضرات کی بیش قیمت خدمات رہی ہیں۔ منشی نول کشور، تو بہت سارے نظر، دیا نارائن نگم اور دیوان سنگھ مفتون کی خدمات کو کون فراموش کرسکتا ہے۔ دیا شنکر نسیم، تلوک چند محروم سے لے کر فراق، آنند نرائن ملا، رام لعل اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تک غیر مسلم جیالوں کی ایک طویل فہرست ہے، جن کے دم سے اردو آج بھی ایک زندہ اور تابندہ زبان ہے۔ بلکہ میرا تو ماننا یہ ہے کہ آج بھی اردو شعر و ادب کی شمعیں روشن کرنے میں اردو زبان سے محبت کرنے والے بے شمار غیر مسلم نوجوانوں کا حصہ ہے۔

اسی شمارے میں مرحوم عرفان صدیقی کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے آشوتوش سری واستو کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ اس میں اردو ادب کے کسی بھی طالب علم کو کوئی شک نہیں ہوسکتا ہے کہ عرفان صدیقی جدید شعری منظرنامے کا ایک روشن چہرہ تھے، وہ بہترین انسان اور منفرد شاعر تھے اور نئی شاعری کی ایک توانا آواز بھی تھے اور 1980 کے بعد نمایاں طور پر اپنی موجودگی درج کرانے والی ادبی نسل کے بہت سارے شعرا پر عرفان صدیقی کی شاعری کا عکس محسوس کیا جاسکتا ہے، اور یہ کوئی عیب بھی نہیں مگر عرفان صدیقی جیسا شاعر صدیوں طویل زمانہ گزرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

اسی شمارے میں ایک اور مضمون اردو افسانے میں دلت رجحان بھی شائع ہوا ہے جسے محسن کمار نے تحریر کیا ہے۔ مضمون کے مواد سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے بڑی عرق ریزی کے بعد لکھا گیا ہے مگر میرا اعتراض یہ ہے کہ کیا ادب میں بھی طبقاتی فرق کے اعتبار سے کوئی تقسیم جائز ٹھہرائی جاسکتی ہے؟ خیر اب یہ کام تو ہمارے ناقدین ادب کا ہے، مگر میں اسے ایک غلط رجحان ہی مانتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

اردو دنیا نومبر 2015 کا شمارہ اپنی امتیازی خصوصیتوں یعنی حسن طباعت و کتابت اور محققانہ اور معلوماتی مضامین سے مزین موصول ہوا۔ اس شمارے کے مندرجہ ذیل مضامین زیادہ پسند آئے۔

گوشہ اختر الایمان کے تحت: اختر الایمان کا انفرادی آہنگ، اختر الایمان کی شاعری میں اتحاد اور قومی یکجہتی، روح کے کرب کا بیان، اختر الایمان رومانیت سے آگے کا سفر، اردو ادب میں تہذیبی اشتراک اور رواداری، حاتم طائی کے ملک سے، مشترکہ تہذیب کے فروغ میں چشتی صوفیا کا حصہ، غارہائے ایلورہ: فن سنگ تراشی کا ایک قابل قدر کارنامہ، طب میں علاج بالتدبیر کی اہمیت اور تبصرے۔

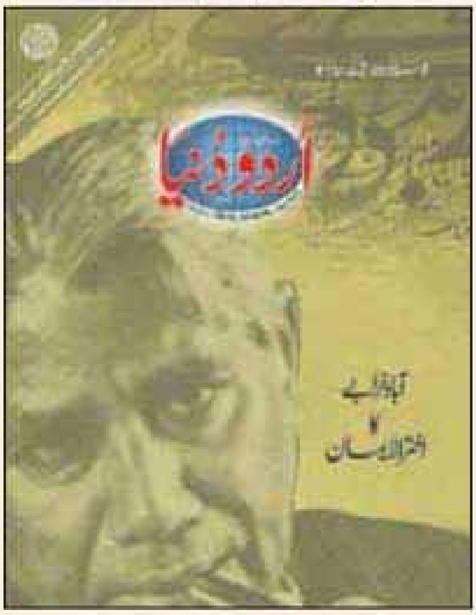

سلیم صبا قریشی
چیف ایڈیٹر: نور جنوب، چنئی

اردو دنیا نومبر کے شمارے میں علامہ ناوک حمزہ پوری صاحب کا انٹرویو ایک نامکمل تعارف نامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت موصوف کے باطن کا علمی اور ادبی خزانہ مخفی پوشیدہ ہے۔ جناب احمد صغیر کے سوالات کی نوعیت بالکل سطحی ہے۔ ایک عالمی شہرت یافتہ فن کار سے یہ سوال کرنا کہاں تک درست ہے کہ "کہنہ مشق شاعر ہونے کے باوجود آپ کو وہ مقام نہیں ملا جو ملنا چاہیے" اس سے صاف ظاہر ہے کہ جناب احمد صغیر کا مطالعہ علامہ ناوک حمزہ پوری سے متعلق مختصر ہے۔ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ احمد صغیر شاعر بھی نہیں ہیں۔ علامہ نے اردو شاعری کے افق کو ایک نیا فکریاتی اور جمالیاتی منظر دیا ہے۔ ان منظر کشا فضاؤں تک احمد صغیر کی رسائی ناممکن ہے۔ بہر کیف علامہ سے متعلق انٹرویو ذہنی طمانیت کا باعث نہ بن سکا۔

مضمون 'ہندوستانی فلموں میں غزل کا جادو' بہت مختصر سہی لیکن جامع اور وقیع ہے۔

حنا فردوس کا مضمون اختر الایمان سے متعلق ان کی کوتاہ معلومات کی غمازی کرتا ہے۔ حنا فردوس نے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے کہ مرحوم محمود ایاز کی خاص فرمائش پر اختر الایمان نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کا آئینہ ان کے چاہنے والوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ سلسلہ موصوف نے غالباً 1992 میں شروع کیا تھا اور اس خودنوشت کی اشاعت کی شہادتیں 'سوغات' کے شماروں میں آج بھی موجود ہیں اور یہ سلسلہ 1995 میں اختتام پذیر ہوا۔

مرحوم اختر الایمان کی خودنوشتوں کا یہ کارنامہ روشن حروف میں رقم ہونا چاہیے کیونکہ موصوف کی تمام تر تحریروں میں انسانوی پن اور جمالیاتی انداز جلوہ افروز تھا۔۔۔ یوں تو آج کل بہت ساری خودنوشتیں منظر ادب پر آرہی ہیں مگر ان میں وہ کشش انگیزی اور متاثر کن کیفیات کا فقدان ہے۔ جیسے مضامین معلوماتی دائرے کے اطراف چکر لگاتے ہیں۔

ایک جگہ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ "ہم اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لیے سنجیدہ تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے" اس سلسلے میں راقم کا خیال یہ ہے کہ "آج کی تحقیق انٹرنیٹ کی بھرپور معاونت دیتی ہے" آج کا کوئی بھی محقق موضوع کے مواد کی تلاش میں کتب خانوں کی الماریوں کی دھول اور وہاں کی کتابوں پر جمی ہوئی خاک سے اپنی سانسوں کو گرد آلود کرنا پسند نہیں کرتا ہے۔

مصطفیٰ ندیم خان غوری
پلاٹ نمبر 4، حضرت منزل، رحمٰن کالونی، قدیم جالنہ، مہاراشٹر

'اردو دنیا' نومبر 2015 دستیاب ہوا، جس میں گوشہ اختر الایمان کو بڑے سلیقے سے سنوارا گیا ہے۔ گوشہ اختر الایمان میں پہلا شہ پارہ پروفیسر منظر اعجاز کا تحریر کردہ ہے اور اپنی مستحق جگہ پر سب سے پہلے دیا گیا ہے۔ باقی مشمولات بھی قابل قدر ہیں جن سے اس موضوع کی کئی سمتیں وا ہوتی ہیں۔ صفحہ 20 پر ذیلی سرخی 'رومانی شاعری سے نفرت' کے ذیل میں اختر الایمان نے غزل میں گھسے پٹے انداز میں ایک ہی لکیر کو پیٹے جانے پر بیزاری کا اظہار کیا ہے کہ ایسے شعرا محبوب کی سالخوردہ لاش سے لپٹے رہتے ہیں جس کے خد و خال تو کیا استخوان بھی باقی نہیں رہے۔ ان پر زمانے کے سرد و گرم کا کوئی اثر نہیں، اور نہ اپنے معاشرے اور معاشی و سیاسی حالات سے کوئی سروکار۔ انھی وجوہات کی بنا پر اختر الایمان غزل کی بجائے نظم کی جانب رجوع ہوئے جس کا دامن نسبتاً وسیع ہے لیکن ان ساری کیفیات میں ایک انتہائی قابل غور نکتہ محسوس ہوا ہے کہ حسن مجازی کو قدرت ازل سے اب تک بار بار اور مسلسل دہرا رہی ہے اور شاید یہ سلسلہ ابد تک جاری و ساری رہے گا۔ حسن و جمال کے اب تک لاتعداد جلوے رونما ہوکر معدوم بھی ہوگئے اور پھر بے شمار ابد تک ظاہر ہوتے رہیں گے۔ اب مزید غور فرمائیے کہ ان میں ہر صنف منفرد اور اپنے آپ میں جاذب نظر ہے۔ وہ کہاں جائیں جن کی مثال سامنے ہے۔ حسن و جمال کا یہ رنگ و روغن اپنے لاتعداد درخشاں مگر

منفرد سائے (Shades) رکھتا ہے۔ اب اگر اسی انفرادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی غزل موزوں کرنے میں مستغرق ہو جائے تو ہر شعر میں ندرت اور انوکھے پن کا خوشگوار احساس ہوگا اور شاعر دبے پاؤں بے خودی سے خودی یعنی عشقِ حقیقی کی جانب گامزن ہوگا اور ظاہر ہے کہ طبیعت میں جھنجھلاہٹ بھی نہ ہوگی۔ جیسی کہ اختر الایمان کو ہوئی تھی۔ ص 63 پر 'ہندوستانی فلموں میں اردو غزل کا جادو' بہت خوب ہے۔ کوئی فلم بہت پسند آئے تو آپ دوبارہ دیکھتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے بھی اس مضمون کو دوبارہ پڑھا بڑا مزہ آیا۔ اس شمارے کے باقی تمام مشمولات لائقِ صد ستائش ہیں۔

محمود الظفر رحمانی

جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو، اتر پردیش

نومبر ماہ کا 'اردو دنیا' 2 نومبر کو مل گیا۔ قابلِ مبارکباد ہیں کہ اب پابندی کے ساتھ ہر ماہ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو ڈاک سے مل جاتا ہے۔ اردو کا یہ ثقافتی، ادبی اور معلوماتی رسالہ جو ملک کے مختلف حصوں کے ساتھ دنیا کے دیگر ممالک میں بڑی شان بان کے ساتھ ہندوستان کا نام روشن کر رہا ہے۔ رسالہ عزت اور قدر کی نظر سے دیکھا، پڑھا اور پسند کیا جاتا ہے۔ سرورق پر اختر الایمان کی دیدہ زیب تصویر نے چار چاند لگا دیے۔ مظفر انجاز، کرشن بھاوک، صدیق محی الدین، حقانی القاسمی، محمد امتیاز اور یوسف رامپوری کے مضامین نے اختر الایمان کی شخصیت کو دوبالا کر دیا۔ محترمہ ثروت خان کے اردو مذاکرے کے 21 نکات نے بہت اہم معلومات فراہم کیں۔

عبداللہ عثمانی

4116 گدریا واڑہ، دیوبند، یوپی

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ ماہ نومبر 2015 نظر نواز ہوا۔ اداریے میں اٹھائے گئے مسائل غور طلب ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ عمل ہیں۔ عصرِ حاضر میں اردو کے لیے جدید رجحانات اور سائنسی فکر سب سے بڑا خطرہ اور چیلنج بنتا جا رہا ہے یہ خوف دیگر زبانوں کے لیے بھی یکساں ہے۔ چنانچہ اداریہ دعوتِ تبلیغ دیتا ہے اہل اردو کو۔ احمد صغیر صاحب کا انٹرویو قابلِ مطالعہ ہے۔ اس شمارے کے صفحہ 14/15 سے صفحہ 35 تک اختر الایمان پر بہترین مضامین شامل ہیں۔ مظفر انجاز کا مضمون بہت عمدہ اور قابلِ مطالعہ ہے۔ کرشن بھاوک کی اردو دوستی قابلِ ستائش ہے۔ اختر الایمان کا نفسیاتی مستند اور سیر حاصل تجزیہ ہے۔ غالب پر محترم یونس اگاسکر کا مقالہ تحقیقی اور شاندار انتخاب ہے۔ غالب واحد فنکار ہیں جن کی ہر تخلیق میں نئی جہات سامنے آ رہی ہیں اور ان کے اشعار کی نئی نئی تعبیریں اور تشریحات دامنِ اردو کو مزید وسیع اور بلند کر رہی ہیں۔ صفحہ 63 پر سنیل بی کولور کا مضمون 'ہندوستانی

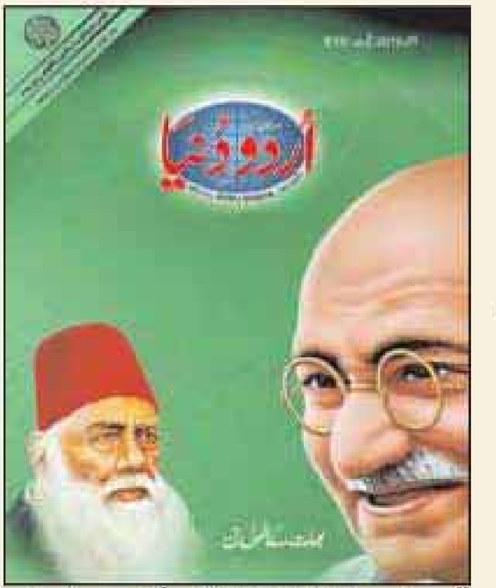

فلموں میں اردو غزل کا جادو' نیا مضمون نہیں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ اردو کا جادو ہندی فلموں میں اب سے چالیس پچاس برس پہلے کی بات کہی جا سکتی ہے۔ عصرِ حاضر میں ہندی فلمیں اب اردو کی چاشنی سے محروم ہوتی جا رہی ہیں۔ اردو کی سرگرمیوں کے حوالے سے صفحہ 67 تا 98 قابلِ مطالعہ ہے۔

رفیق ابراہیم پرکار

حلیمہ منزل، کرجی، کھنڈ، رتن گیری

ماہ نومبر 2015 کا اردو دنیا نظر نواز ہوا۔ مضامین خاص کر 'آباد خرابے کا اختر الایمان' ناوک حمزہ پوری سے انٹرویو، مولوی عبدالحق کے خطبات، طب میں علاج بالغذا کی اہمیت اور دیگر مضامین معلوماتی و توجہ طلب ہیں۔ آپ کی یہ کوشش قابلِ ستائش و حوصلہ افزائی کے لائق ہے۔ آپ سے ایک درخواست ہے کہ مضامین کا فونٹ میں (لکھائی میں حروف کی جسامت) بہت چھوٹے ہیں برائے کرم ایک یا دو فونٹ سائز بڑھا دیں تو بہتر ہوگا کیونکہ مجھ جیسے 61 سال کی عمر کے انسان کو اتنے چھوٹے حروف پڑھنے میں دقت ہو رہی ہے۔

معین الدین

نیا بازار پاڑہ، سیدپور، نیلفاماری (بنگلہ دیش)

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ رسالہ اچھا، کاغذ عمدہ، مضامین بہتر اور معلوماتی، طباعت بھی اچھی صاف ستھری اور قیمت بھی معقول۔

وحید الظفر خان (علیگ)

مسعود کمپاؤنڈ، عبداللہ گرلس کالج روڈ، لال ڈگی، سول لائنس، علی گڑھ

کوئی بھی ادبی جریدہ کسی بھی زبان و ادب میں شائع ہو وہ اساسی طور پر مدیرانہ صلاحیتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مشمولہ مضامین کا انتخاب، ترتیب و تنظیم اور تزئین کا اہتمام اس کے پالیسی شعور کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ مدیر کی فکر و نظر کی سطح پر جس قدر وسیع النظری اور آفاقیت کی صفت سے متصف ہوگا، مضامین کے انتخاب اور ان کی درجہ بندی میں اسی قدر شفافیت نمایاں ہوگی۔ اکتوبر 2015 کا ماہنامہ اس جائزے کا مثبت مظہر ہے جو اس وقت باعثِ انبساط و افتخار ہے۔ ہر مضمون اپنی افادیت کے لحاظ سے ادب کی دنیا میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے جو مدیرانہ صلاحیت کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ گویا ادبی آسمان پر ایک کہکشاں سجا دی گئی ہو۔

سب سے اہم خصوصیت اس ماہنامے کی جو میری نظر میں لائقِ ستائش ہے اور اس جریدہ کی ادبی حیثیت کو مزید نمایاں کرتی ہے وہ نظم و غزل کے انبار سے پرہیز ہے۔ ذاتی طور پر پوری ادارتی ٹیم کو مبارکباد کا مستحق سمجھتا ہوں جو اپنی پوری لگن اور تندہی کے ساتھ اردو زبان و ادب کے فروغ میں ہمہ تن مصروف ہے۔

امیر احمد خلش امیر نہٹوری

(ضلع جنرل سکریٹری)، انجمن ترقی اردو، ضلع بجنور

ماہ اکتوبر 2015 کا شمارہ 'اردو دنیا' نظر سے گزرا، ماشاء اللہ اردو دنیا کا شمارہ ہر اعتبار سے دلکش اور معیاری ہے۔ سرورق جاذبِ نظر ہے اور مضامین آبِ حیات کا کام کرتے ہیں۔ ہماری بات بہت ہی معلوماتی اور متاثر کرنے والی ہے۔ نیز گوشہ سرسید احمد خاںؒ میں ان کی شخصیت، ان کا نظریہ، مدارس کی سرگرمیاں، اردو زبان اور اس کی ترقی وغیرہ سرسید کو قاری کے روبرو کھڑا کرنے میں معاون ہیں۔ ہر ماہ کسی نہ کسی مشہور شاعر یا ادیب پر گوشہ نکالنا اور جدید نسل کو ان کے اجداد کی تاریخ سے آگاہ کرنا قابلِ ستائش اقدام ہیں۔ 'اردو دنیا' میں شامل زبان و تعلیم، ادبی مباحث، نقد و نظر، خراجِ عقیدت، بازیافت، شخصیت، کتابوں کی دنیا اور عالمی اردو نامہ وغیرہ تمام گوشے معیاری، معلوماتی اور عمدہ ہیں۔ قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں بلاشبہ اردو کا معیار بلند و بالا کرنے میں معاون ہیں اور اس کے لیے آپ کی خدمات و فکری صلاحیتیں قابلِ مبارکباد ہیں۔۔۔!

محمد امتیاز احمد

کیریلا، مدرسۃ امام ربانی محمود اشرفی کالج

اکتوبر 2015 کا اردو دنیا موصول ہوا۔ رسالے کے معیاری مضامین پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ اردو دنیا کے مضامین، انٹرویو، کہاسنی وغیرہ کا کالم بہت ہی اچھے ہیں۔

محمد سالم

کوڑوا، ملپرم، کیرلا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا میں ایک نیا قاری ہوں۔ اس رسالے میں نہ صرف مضامین بلکہ خبریں اور تبصرے بھی چھپتے ہیں۔ تازہ شمارے میں بھی مضامین معیاری ہیں۔ اردو دنیا پڑھنے سے ہمیں بہت ساری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

فاروق اعظم قاسمی

اردو کا سورج کبھی نہیں ڈوبے گا

ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر اردو زبان و ادب کی خدمت اور اس کی ثروت میں اضافہ کرنے والوں میں ایک اہم نام ظفر حبیب کا ہے۔ افسانہ نگار، ناقد اور شاعر کی حیثیت سے ان کی اپنی ایک شناخت ہے۔ ادب کے باب میں ان کا ایک واضح نظریہ ہے۔ ادب کی مثبت قدروں پر ان کا یقین ہے اس لیے صالح نظریات کو ہی اپنی تخلیق کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب لہو و لعب نہیں بلکہ انسانی، اخلاقی قدروں کی ترسیل کا ایک اہم اور مؤثر ذریعہ ہے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر فاروق اعظم قاسمی نے ان سے ادب، تحریکات، تخلیق اور تنقید کے رشتے اور اردو کے مستقبل کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ پیش ہیں انٹرویو کے کچھ اقتباسات: (ادارہ)

فاروق اعظم قاسمی: سب سے پہلے میں آپ کے خاندانی پس منظر سے متعارف ہونا چاہوں گا۔

پروفیسر ظفر حبیب: اس سلسلے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے میں اپنی اس آبادی سے آپ کو چند جملوں میں روشناس کرانا چاہوں گا جو صوبۂ بہار ہی نہیں اس سے باہر بھی لکھمنیاں کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ جب پہلی بار شہنشاہ اکبر نے بہار کی باضابطہ سرحد بندی کرکے اسے ایک صوبے کی حیثیت عطا کی تھی تو اس وقت اس پوری ریاست کو انتظامی سہولت کی رو سے سات سرکاروں اور ایک سو ننانوے پرگنوں میں تقسیم کردیا تھا۔ انھیں سرکاروں میں سے ایک سرکار، مونگیر بھی تھا جس کا ایک پرگنہ بلیا تھا۔ یہ واقعہ 1580 کا ہے۔ اسی بلیا سے متصل مشرق میں اورنگ زیب کے زمانے میں 1685 کے آس پاس سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے مشہور زمانہ عالم دین اور مرشد وقت حضرت آدم بنوریؒ خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفہ و مجاز شیخ محمد سلطان بلیاوی کے وجود و ورود نے لکھمنیاں کو آباد کیا جس کا پرانا نام سلطان پور چک لکھمن تھا ان دو متصل آبادیوں (بلیا اور لکھمنیاں) میں اردو شاعری کا جزو مہ 1699 سے 1779 کی درمیانی مدت کا دستیاب ہے۔

جہاں تک ہمارے خانوادے کا تعلق ہے۔ ہمارے پاس نہ تو کوئی قدیم شجرۂ نسب دستیاب ہے اور نہ ہمارے اسلاف واجداد سے لے کر آج تک کسی نے بھی کچھ ہیر پھیر کرکے بھان متی کا پٹارہ تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ جناب خیرات علی کے کئی بیٹوں میں سے ایک جناب رحیم اللہ تھے ان کے تین بیٹوں میں چھوٹے کا نام عبدالحسیب تھا ان کے دو بیٹوں میں بڑے کا نام ڈاکٹر حبیب الرحمٰن تھا۔ جو میرے پدر بزرگوار تھے۔ جناب حبیب الرحمٰن کے چھوٹے بھائی کا نام عبدالصمد تپش اور میرے چھوٹے بھائی محمد نذرالاسلام تھے جو جواں مرگی کے شکار ہوگئے۔ اب اس دنیا میں میرے حصے میں ایک بیٹا ڈاکٹر معراج الاسلام رباب ہیں جو اس وقت مانو کے صدر دفتر حیدرآباد میں شعبۂ علم نباتات میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل رباب پروردگار کی جانب سے ایک فرزند ارجمند الحان سے نوازے گئے ہیں۔ رباب کے ہمراہ کل نو بہنیں تھیں جن میں سب سے بڑی کو خالق حقیقی نے اپنے پاس بلا لیا۔ اور برادر عزیز مرحوم مغفور کو رب العالمین نے تین بیٹوں سے نوازا ہے۔ یہ منہاج الاسلام سحاب، وہاج الاسلام شہمہ اور مصباح الاسلام شاداب ہیں۔ ان کے علاوہ دو بیٹیاں بھی ہیں۔ سب کے سب زیر تعلیم ہیں۔ ظفر حبیب میرا قلمی نام ہے جب کہ اسناد میں میرا نام ایس ایم ظفر الاسلام درج ہے۔

میں یہ جانتا ہوں کہ ہمارے اسلاف کا ذریعہ معاش کاشتکاری تھا۔ زرعی زمین حسب ضرورت ان کے پاس تھی۔ میرے دادا جناب عبدالحسیب مرحوم کے اندر حصول علم کا بالیدہ جذبہ تھا جسے انھوں نے آج سے تقریباً سو سال پہلے آئی۔ کام (کلکتہ یونیورسٹی سے) کی سند لے کر تسکین عطا کی تھی۔

میرے نانا جان ماسٹر سید عارف الحق کا تعلق لکھمنیاں کے معروف چودھری گھرانے سے تھا۔ یہ گھرانہ اپنی زمیندارانہ شان کے لیے مشہور و معروف تھا لیکن میرے نانا کے یہاں کوئی زمینداری نہیں تھی۔ البتہ جہانِ علم کی زمینداری سے سرفراز تھے۔ اپنے وقت کے مشہور استاد اور معلم کی حیثیت سے انھوں نے زندگی بسر کی جس کا اثر ان کے نور نظر ابو محمد شبلی (مقیم لکھنؤ) میں نظر آیا اور جو بطور وراثت ڈاکٹر طیبہ نسرین ایسوسی ایٹ پروفیسر آف اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو علی گڑھ کے پاس محفوظ نظر آرہا ہے۔

ف ا ق: برائے کرم اپنی تعلیم اور مشاغل پر کچھ روشنی ڈال دیں۔

ظفر حبیب: میری تعلیم کا آغاز انتہائی سادہ اور سیدھے انداز میں ہوا۔ حروف شناسی کا آغاز والدہ محترمہ کی زبان مبارک کی تلاوت سے ہوا۔ لکھمنیاں میں ایک انتہائی درویش صفت، ایثار نفس اور فرشتہ خصال استاد ہوا کرتے تھے جن کا نام نامی مولوی تمیز الدین (نور اللہ مرقدہٗ) تھا۔ جمعرات کے دن دو پیسہ (اس زمانے میں چونسٹھ پیسے کا ایک روپیہ ہوا کرتا تھا) اور ہفتے میں ایک دن ایک وقت کا کھانا بھی تھا ان کی علمی خدمت کا صلہ۔ اسی مکتب عرفانی میں تقریباً دو سال رہ کر قرآن کریم ناظرہ مکمل کیا، اردو کی چوتھی کتاب (مطبوعہ انجمن حمایت اسلام لاہور) فارسی کی پہلی، آمد نامہ اور ریاضی کے تمام ابتدائی اسباق جمع تفریق، ضرب، تقسیم وغیرہ مکمل کرکے اسکول چلا گیا۔ یہ معاملہ 1951 سے 1953 تک کا تھا۔ 1962 میں مقامی

ایس اے ایس ہائی اسکول سے میٹریکولیشن کی سند لے کر 1966 میں گنیش دت کالج بیگوسرائے سے انٹرمیڈیٹ اور اردو آنرز کی سند حاصل کی اور تب بہار یونیورسٹی مظفرپور چلا گیا جہاں سے 1968 میں ایم اے پاس کرلیا۔ نتیجۂ امتحان کی اشاعت کے بعد چند ماہ کے اندر ستمبر 1969 میں اے پی ایس ایم کالج برونی ضلع بیگوسرائے میں اردو لکچرار کی جگہ پاکر مطمئن ہوگیا۔ اسی کالج میں رہ کر ریڈر اِن اردو (1981) اور یونیورسٹی پروفیسر آف اردو (1995) تک کی ترقیاتی منزلیں طے ہوگئیں۔ ملازمت کے آخری برسوں میں للت نرائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے شعبۂ اردو (پی جی) کی صدارت کی کرسی پر بیٹھنا مقدر تھا سو وہ بھی ہوگیا۔ وہ زندگی جو ازروئے سند 31 اکتوبر 1947 سے شروع ہوئی تھی اس کے تقریباً 21 سال حصولِ سند میں صرف ہوگئے اور 40 سال تک 'پیشۂ آبا معلمی' سے وابستہ رہا۔ الحمدللہ اپنے واحد نورِ نظر ڈاکٹر معراج الاسلام رباب کے کاندھوں پر اب یہ بارِ امانت ڈال کر مطمئن ہوں۔ گرچہ ان سے پہلے میرے یکتائے معاشرہ برادر عزیز محمد نذرالاسلام یہ بوجھ میرے ساتھ ساتھ ڈھو رہے تھے۔ لیکن خالق ارض وسماوات نے 14 دسمبر 2010 کو انھیں اپنے پاس بلالیا۔ وہ شہر کلکتہ کے ایک سرکاری ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر بن کر فروغ تعلیم کی مہم میں مصروف تھے۔

ف ا ق: میں آپ کی علمی وادبی سرگرمیوں کا پس منظر اور پیش منظر رقم کرنا چاہوں گا؟

ظفر حبیب: میں اس کے لیے بھی آپ کو لکھمنیاں لے چلوں گا کہ جہاں 1944 سے ایک اردو لائبریری الموسوم بہ 'اسٹوڈنٹس اردو لائبریری' تھی۔ اس قدیم علمی وادبی آبادی کی تمام سرگرمیوں کا وہ مرکز ومحور تھی۔ میں عہد طفلی ہی سے اس ادارے کی سرگرمیوں کا حصے دار رہا۔ پہلے بزرگوں کی ایما پر چائے لاؤ، فلاں کو بلاؤ، انتظامیہ کے افراد کو نوٹس پہنچاؤ۔ بدلے میں بچوں کے رسائل اور کتابچے پڑھ لیا کرو کا حکم بجا لاتا رہا۔ اس تعلیم وتربیت نے میرے اندر کی تشنگی کو نمی عطا کردی اور وجود کی زمین میں زرخیزی پیدا کردی۔ اکتوبر کا مہینہ اس لائبریری کے حوالے سے صرف لکھمنیاں ہی نہیں پورے علاقے کی آبادی کے لیے جشن منانے کا مہینہ ہوا کرتا تھا۔ اسی ماہ میں لائبریری کی سالگرہ منائی جاتی تھی جو مختلف النوع علمی، ادبی مقابلوں کے جلو میں صوبائی سطح کے مشاعروں پر ختم ہوا کرتا تھا۔ انھیں سرگرمیوں میں شامل رہ کر میں نے شاعری بھی شروع کی اور افسانہ نویسی بھی۔ تقریباً بارہ برسوں تک اس کی انتظامیہ کا جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹری بھی رہا:

میں کیا بتاؤں تم سے محبانِ علم و فن
لکھمنیاں جو ایک شہر تھا صوبہ میں انتخاب
رہتے جہاں تھے منتخب روزگار کے
اس کو خود ہم نے لوٹ کر برباد کردیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ شاعری اور ادبی سرگرمی ہمارے خانوادے کی خانہ زاد تھی۔ ناموں کی فہرست طویل ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ لکھمنیاں پر ایک طویل عرصہ ایسا گذرا کہ جب درجن بھر سے زیادہ اہلِ قلم اس کی گود میں کھیلتے رہے اور ان میں تین چوتھائی کھلاڑی اسی خانوادے کے چشم وچراغ تھے۔ گذشتہ تقریباً پندرہ برسوں سے یہ ماحول بھی مسلسل طور پر زوال پذیر ہے۔ اس کا واحد سبب لائبریری کی ویرانی ہے۔ ''میں کیا بتاؤں تم کو محبانِ علم وفن''۔

مقالہ نویسی کا آغاز باضابطہ 1967 سے ہوا جب میرا پہلا مقالہ ماہنامہ 'مریخ' پٹنہ (مدیر ڈاکٹر عبدالمغنی) میں 'اختر قادری کی غزل گوئی' کے زیرعنوان شائع ہوا۔ اسی کے آس پاس ایک ادبی مضمون امداد امام اثر کی تنقید نگاری کے موضوع پر آل انڈیا ریڈیو پٹنہ نے نشر کیا۔ اس وقت ڈاکٹر مظہر امام PEX تھے۔ اس کے بعد سے عالمی سطح کے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں شائع ہونا شروع ہوا پھر طبع زاد افسانے شائع ہونے لگے۔ شاعری کم شائع ہوئی، اس کی دنیا مشاعروں کی محفلوں تک تھی جو مقامی سے لے کر چند صوبائی اور ملکی سطح کے مشاعروں تک ہے۔ میں اکثر بڑے مشاعروں کی نظامت بھی کرتا رہا۔ میں نے خود ڈاکٹریٹ کی سند حاصل نہیں کی لیکن تقریباً چالیس سال قبل سے میرا تحقیقی کام چل رہا ہے۔ میں نے اپنے ضلع بیگوسرائے کی جغرافیائی حدود کے اندر زبان وادب کی سرگرمیوں کو منظر عام پر لانے کا بیڑا اٹھالیا ہے۔

میری ان کوششوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اس دور افتادہ علاقے میں 1699 سے شعرگوئی کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ زمانہ ولی دکنی کی معاصرت کا ہے اس موضوع پر میرے تحقیقی مقالے کم شائع ہوئے ہیں۔ البتہ میری نگرانی میں اسکالرس کے مقالے ضبطِ تحریر میں لائے جارہے ہیں۔ چند مقالات کتابی شکل میں شائع ہوچکے ہیں جو سب کے سب تاریخ ساز ہیں۔

میری پہلی تصنیف ترجمہ کردہ افسانوں کا مجموعہ 'آنگن آنگن' 1981 میں منظر عام پر آئی۔ افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'جنگل کا سفر' 1985 میں، تیسرا مجموعہ 'بدلتے رُت کی کہانیاں' 2009 میں، مقالوں کا پہلا مجموعہ 'تفہیمات وتنقیدات' 2008 میں، شعری مجموعہ 'نور، نکہت، نوا' 2014 میں اور مقالوں کا دوسرا مجموعہ 'تنقید اور تفہیم' 2015 میں شائع ہوچکا ہے۔ مقالوں کا تیسرا مجموعہ 'فنکارانِ بہار' اور تبصروں کا پہلا مجموعہ 'المیزان' زیرِ طبع ہے۔ ان کے علاوہ تقریباً ایک سو مختلف النوع تحریریں اشاعت کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ الحمد للہ دو کے سوا تمام تصانیف بہار اردو اکیڈمی پٹنہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہیں۔ تحریر اور تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔

سوانحی خاکہ

نام: ایس ایم ظفرالاسلام
قلمی نام: ظفر حبیب
پدر بزرگوار: ڈاکٹر ایم ایچ رحمان (مرحوم)
مادر مہربان: عائشہ صدیقہ عرف مشتری خاتون (مرحومہ)
تاریخ و مقامِ پیدائش: 21 اکتوبر 1947 (ازروئے سند) لکھمنیاں
ملازمت: • لکچرار شعبۂ اردو (ستمبر 1969) • ریڈر (فروری 1982) • یونیورسٹی پروفیسر (1995) • اے پی ایس ایم کالج، برونی (بیگوسرائے) • ملحقہ ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ (بہار) • صدر شعبۂ اردو (پی جی) (2008) • ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ (بہار)
سبکدوشی: نومبر 2009
علمی سرگرمیاں: شاعری، افسانہ نویسی، مضمون نگاری، مقالہ نویسی اور تحقیق
نشریات: مقالہ، شہرنامہ، شاعری اور افسانہ (از 1969)، مختلف عصری، معاشرتی اور سیاسی موضوعات پر مضامین کی اشاعتیں
مطبوعات: • آنگن آنگن (1981) ترجمہ کردہ افسانے • جنگل کا سفر (1985)، طبع زاد افسانے • تفہیمات و تنقیدات (2008) مجموعہ مقالات • بدلتے رت کی کہانیاں (2009) طبع زاد افسانے • تفہیمات وتنقیدات (2008) مجموعہ مقالات • بدلتے رُت کی کہانیاں (2009) طبع زاد افسانے • نور، نکہت نوا (2014) شعری مجموعہ • تنقید و تفہیم (مجموعہ مقالات)، 2015 • فنکاران بہار (زیرِ طبع) مجموعہ مقالات • المیزان (زیرِ طبع) تبصروں کا مجموعہ
مستقل پتہ: بیت الشرف، عبدالحسیب کالونی، لکھمنیاں 851211 بیگوسرائے (بہار)

ف ا ق: ادبی دنیا میں آپ کی شناخت افسانہ نگار، ناقد اور شاعر تینوں کی حیثیت سے ہے۔ آپ نے زمانۂ طالب علمی ہی میں انگریزی افسانوں کا ترجمہ کیا بھی اور انھیں شائع بھی کرادیا لیکن ان تینوں اصناف میں آپ کی ترجیح کس کو حاصل ہے اور آپ کسے زیادہ مفید سمجھتے ہیں؟

ظفر حبیب: دیکھیے جناب! آپ نے تین جہتوں کی بات کہی ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ ان میں کم از کم ایک کا اضافہ کردیں۔ میرا تحقیقی کام بھی بہت وسیع اور وقیع ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ان شاء اللہ وہ وقت آئے گا اور آپ ہی کے معاصر قلم کاروں کے ہاتھوں آئے گا کہ جب تاریخ ادبیات اردو میں 'تاریخ ادبیات بیگو سرائے' کا ایک باب قائم کیا جائے گا اور اس باب کی تحقیق کا سہرا اسی ناچیز کے سر باندھا جائے گا۔

یہ بھی عرض کروں گا کہ میں عصری مسائل اور موضوعات پر بھی درجنوں مضامین لکھ چکا ہوں جو اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں اور جن پر پسندیدگی کی مہریں لگتی رہی ہیں۔

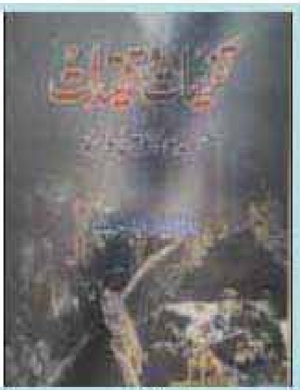
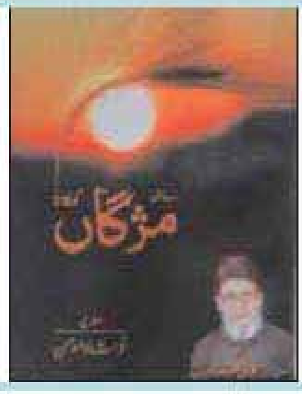

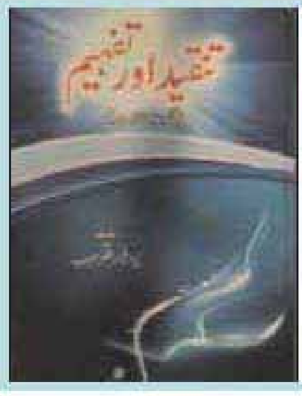

ف ا ق: 'تفہیمات وتنقیدات' (مجموعہ مضامین) میں آپ نے تخلیق وتنقید کو لازم وملزوم اور توأم قرار دیا ہے۔ قلم سے نکلنے کی حد تک تو یہ بات ٹھیک لگتی ہے کہ دونوں قلم کار کے طویل مطالعے ومشاہدے کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن میرے خیال میں ایک تخلیق کار کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے اور ایک ناقد کے لیے بہت پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے اس لیے کہ مالی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ باغ کو سجا دیتا ہے اور ایک نرسری کے ماہر کو اس کے مالہ وماعلیہ سے واقف ہونا بھی ضروری ہوتا ہے؟

ظفر حبیب: تخلیق اور تنقید کے رشتے پر جو بحث میں نے کی ہے اس میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک تنقید نگار بھی تخلیقی ذہن ومزاج کا حامل ہوتا ہے اور ہر تخلیق کار تنقیدی شعور رکھتا ہے۔ آپ دوران مطالعہ یہ محسوس کریں گے کہ جو تنقید نگار وجدان شعری کا مالک ہوتا ہے وہ شعریات پر، اس کی لفظیات پر اور اس کے اندر موجود حسیات پر خوبصورت بحثیں کرتا ہے اور اس کے بخیے بھی سلیقے سے ادھیڑتا ہے۔ اسی طرح ہر تخلیقی فنکار اپنی تخلیق کا خود ناقد ہوتا ہے۔ وہ خود اپنی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ وہ الفاظ کے دروبست کو سمجھ بوجھ کر مناسب مقام پر رکھتا ہے اور اس اعتماد کے ساتھ اسے قاری کے سامنے لاتا ہے کہ اس کا ہر کلام اور ہر جملہ حرف آخر ہے۔ اس کے اندر یہ خود اعتمادی اس کے تنقیدی شعور کی دین ہوتی ہے۔ جہاں تک تخلیق کار کے پڑھا لکھا ہونے کی بات ہے، یہ لازمہ نہیں ہے۔ اس میں مستثنیات بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کالی داس بہت کم پڑھا لکھا تھا اور نظیر اکبرآبادی کے ان مکاتب ومدارس کا سراغ نہیں ملتا جہاں سے انھوں نے اکتساب علم کیا ہو۔ احسان دانش راج مستری تھے اور رمز عظیم آبادی سائیس (گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والا) تھے اور ان کے شاگرد کیف عظیم آبادی کی درزی کی دکان تھی۔ گذشتہ دنوں فریاد بارونی کی حیات اور شاعری پر ایک تحقیقی کتاب منظر عام پر آئی ہے جس کے مطالعے سے یہ اندازہ ملتا ہے کہ موصوف بہت کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اردو کے ایک بڑے اور معتبر شاعر تھے۔ شاعر کی حیثیت سے یہ سب کے سب مستند اور معیاری قرار دیے گئے ہیں۔

جہاں تنقید نگار کا بہت پڑھا لکھا ہونا آپ کی نظر میں ضروری ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس کے اندر تخلیقیت کا عنصر لازم ہے۔ ورنہ وہ تخلیق کے ساتھ انصاف نہیں کرسکے گا۔ اگر یہ ایمان نہیں ہوگا تب بھی اس کی تنقید سکتے کا شکار ہوجائے گی یا پھر حشو وزوائد سے بھر جائے گی۔ سپاس نامہ، خراج عقیدت اور جل کا تاڑ بنانا تنقید نہیں:

تعریف میں قطرے کو سمندر سے ملا دوں
ذرّے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

یہ شاعری ہوسکتی ہے تنقید نہیں۔ تنقید تو انتہائی سنجیدہ اور ذمے دارانہ منصب ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اس منصب پر فائز ہونے کے لیے وسیع المطالعہ ہونا ہی چاہیے۔

ف ا ق: ادب میں آپ کسی خاص نظریے کے قائل ہیں؟

ظفر حبیب: ہاں! اس نظریۂ حیات کے جو ازلی اور ابدی ہے۔ انسان ایک مخلوق ہے جو اپنے خالق کے ہاتھوں کا کھلونا ہے:

چاہا مجھے گھٹا دیا، چاہا مجھے بڑھا دیا

اس لیے انسان کو اپنی اس حیثیت کا استحضار رہنا چاہیے اور خالق کے منشا کو نظر میں رکھ کر اس پر عمل کرنا چاہیے۔ انسان اس کائنات کو فساد زدہ کرنے نہیں آیا بلکہ اس دنیا کو سجا سنوار کر رکھنا اس کا فریضہ ہے تاکہ پوری مخلوق کے لیے یہ دنیا قابل رہائش بنی رہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب انسان کے پیش نظر اس کائنات کی تعمیر کا تصور ہو۔ اس لیے میں 'تعمیر پسند' ادبی تحریک کا مؤید ہوں اور اس کائنات کی تعمیر نو کا آرزومند ہوں۔ میں نے کہا ہے:

یہ متاع لوح وقلم تمھیں جو حضور حق سے عطا ہوئی
وہی تم سے پوچھے گا ایک دن یہ بتا کے شعر لکھا کرو

ف ا ق: اردو کا مستقبل؟

ظفر حبیب:

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اس وسیع وعریض کائنات کے لامتناہی آفاق میں اردو کا سورج ہمیشہ کے لیے کبھی نہیں ڈوبے گا۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ اردو والے اس کی اہمیت سمجھیں اس کا حق پہچانیں اور اسے ادا کرنے کی عملی کاوشوں کا مظاہرہ کریں۔ جس سے اردو والے بے نیاز اور بے فکر ہوکر اپنی نسلوں کو بے جڑ کا پودا بنا رہے ہیں۔ اردو سے ان کی یہ بے تعلقی ان کی نسل کو مستقبل کے عفریت کا لقمۂ تر بنادے گی:

قبضے سے بچاری امت کے دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی

ف ا ق: ادب کے نئے ستاروں کے لیے کچھ پیغام؟

ظفر حبیب: 'ادب کے نئے ستاروں' سے بس یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ عجلت پسندی سے کام نہ لیں۔ سیاسی حمایت اور چاپلوسی وخوشامد سے حاصل کردہ شہرت کی جوانمرگی کے تماشے ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ مطالعہ، مسلسل مطالعہ، گہرا مطالعہ اور ہمہ گیر مطالعہ دانشوری کی مرغوب غذا ہے۔ یہ غذا تواتر سے زیر استعمال رہے اور مذکورہ پرہیز کا اہتمام رہے تو پھر جو صحت مند ادب ان قلم کاروں کے رشحات بن کر قرطاس ابیض پر نمودار ہوں گے دیبا ادب خوش کار بھی ہوگا، خوش گوار بھی ہوگا، توی الجثہ بھی ہوگا، طرحدار بھی ہوگا اور دیرپا تاثیر بھی اسے نصیب ہوگی۔

■

Farooque Azam Qasmi 160, periyar Hostel
JNU, New Delhi - 110067

شاہد اختر انصاری

18 واں قومی اردو کتاب میلہ

میلے کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم، جناب ایم۔جے اکبر، پروفیسر طلعت احمد، ڈاکٹر عبداللہ بٹ اور جناب علی فولادی۔

کتاب کلچر کے فروغ اور اردو کے نئے اور نامعلوم قاری کی دریافت اور اس کے وسیلے سے اردو زبان و ادب کے فروغ کے مقصد سے قومی اردو کونسل ملک کے مختلف حصوں میں گذشتہ کئی برسوں سے کتاب میلے کا انعقاد کرتی رہی ہے۔ دہلی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کیمپس میں اٹھارواں کتاب میلے کا اہتمام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میلے میں ناشرین کی ایک بڑی تعداد نے جہاں شرکت کی وہیں شائقین کتب کے جمِ غفیر نے ان کی شرکت کو ایک مضبوط جواز عطا کیا۔ کتاب میلے سے یہ احساس ہوا کہ اردو پڑھنے والوں کی ایک نئی آبادی تشکیل پا رہی ہے اور ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو اس زبان سے براہ راست تعلق تو نہیں رکھتا مگر اردو شعر و ادب سے والہانہ لگاؤ رکھتا ہے۔ کتاب میلے کے انعقاد کا جو بنیادی مقصد تھا اُس میں کونسل مکمل طور پر کامیاب رہی۔ پورے 9 دن تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سبزہ زار پر جو رونق اور شادابی رہی وہ قابلِ رشک ہے۔ خاص طور پر اسکول کے طلبا و طالبات نے جس طرح کی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا وہ اردو زبان کے مستقبل کے لیے خوش آئند ہے۔ پیش ہے کتاب میلے کی ایک تفصیلی رپورٹ جس میں وہ تمام مناظر قید ہیں جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوچکے ہیں مگر ہمارے ذہنوں میں وہ دلکش منظر اب تک زندہ ہیں۔

دلی کو ہندوستان کا دل یوں ہی نہیں کہا جاتا، دلی ساتھ سارے ہندوستان کا دل دھڑکتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں، زبانوں اور مذاہب کی اصل روح کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے یہ شہر نہ معلوم کتنی تاریخی یادوں کا محافظ خانہ ہے۔ دلی کی گلیوں کا بھی وہ رنگ ہے جس نے استاد ذوق کے پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔ دلی آج بھی اسی شان سے تمام تہذیبی قدروں کو سمیٹے ہوئے روشن اور تابندہ ہے۔ یہ شہر جس تہذیبی اور تمدنی ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے اور گنگا جمنی تہذیب کا عملی مظہر ہے اسی تہذیبی رنگا رنگی کی بقا اور فروغ کے باب میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی قابل قدر خدمات رہی ہیں۔ وہ اپنے تاسیسی مقاصد کو خوش اسلوبی سے پورا کرنے کی سمت گامزن ہے۔

یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ کونسل کا دائرۂ کار بہت وسیع ہے۔ کتابوں کی اشاعت، مصنفین کو مالی امداد، اداروں میں اردو کی پڑھائی کا انتظام، کمپیوٹر سنٹر کا قیام، عربی فارسی زبانوں کے فروغ کے لیے مناسب اقدامات، سیمینار اور سمپوزیم کے لیے مالی اعانت؛ غرض یہ کہ زبان و تہذیب اور خاص طور سے اردو زبان و تہذیب کی بقا اور فروغ کے جتنے امکانی کام ہوسکتے ہیں ان سب میں کونسل کی کسی نہ کسی حیثیت سے حصے داری ہے۔

کتاب سے قاری کا رشتہ استوار کرنے کے لیے کونسل کتاب میلوں کا بھی اہتمام کرتی ہے اور اپنی مطبوعات کو انتہائی ارزاں قیمت پر شائقین کے دروازے تک لے کر خود پہنچتی ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک بڑا کام اور بڑی علمی خدمت ہے۔

اسی سیریز کے تحت قومی اردو کونسل نے تاریخی اردو کتاب میلہ اردو زبان و تہذیب کے ایک اور تاریخ ساز ادارے میں منعقد کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور گرد و نواح کا علاقہ دہلی کی اردو تہذیب کے نئے مرکز کے طور پر اپنی شناخت قائم کرچکا ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اوکھلا اور جامعہ نگر کا علاقہ ایک الگ دانشورانہ پہچان رکھتا ہے۔ جامعہ ملیہ کے وسیع و عریض میدان میں کونسل نے اردو کتاب میلے کا اہتمام کرکے فروغ اردو ثقافت کے سلسلے میں ایک اہم اقدام کیا ہے۔ جہاں تک یاد آتا ہے کونسل نے دہلی شہر میں پہلی بار یہ پروگرام منعقد نہیں کیا ہے۔ قومی کتاب میلے کا آغاز دہلی میں 2000 میں ہوا تھا جو بالترتیب 2012 ,2001 میں بھی کامیابی کے ساتھ انعقاد کیا جاچکا ہے۔ لیکن 2015 کے کتاب میلہ کی اہمیت یہ ہے کہ کتابیں ایک ایسے علاقے میں پہنچانے کا اہتمام کیا گیا جہاں سب سے زیادہ اردو ریڈرشپ موجود ہے۔ یوں تو دہلی میں متعدد یونیورسٹیاں اور کالج ہیں جن میں اردو زبان کی تدریس کی سہولیات موجود ہیں لیکن کونسل نے اس کتاب میلے سے اردو سماج کے آخری آدمی تک اپنی مطبوعات پہنچانے اور اس کو اردو ثقافت سے جوڑنے کی سمت میں قابل قدر کام کیا ہے۔ کلچرل پروگرام کی مدد سے ان لوگوں کو بھی جوڑنے کی کوشش کی گئی جو لوگ براہ راست اردو زبان

کتابوں کا معائنہ کرتے ہوئے

دائیں سے: پروفیسر ارتضیٰ کریم، جناب ایم اے سکو، پروفیسر طلعت احمد اور جناب علی فولادی۔

سے تو واقف ہیں لیکن عملی طور سے اردو تہذیب کے پروردہ و عاشق ہیں۔

قومی اردو کونسل اپنے قیام کے بعد پچھلے کئی برسوں سے ملک کے مختلف حصوں میں کتاب میلے کا انعقاد کرتی رہی ہے۔ ممبئی، مالیگاؤں اور اورنگ آباد میں کتاب میلے کی جو پذیرائی ہوئی ہے وہ قابل رشک ہے۔ ان میلوں کی وجہ سے نہ صرف ناشرین کو مالی فائدہ پہنچا بلکہ کتابوں کی طباعت و اشاعت میں ان کی دلچسپی بھی بڑھی، کتاب خریدنے والوں کو بھی نئے نئے موضوعات پر کم قیمت میں کتابیں دستیاب ہوئیں ان کے اندر بھی مطالعے کا ذوق پروان چڑھا۔ قومی اردو کونسل کے ذریعہ کتاب میلے کے انعقاد کا بنیادی مقصد معاشرے سے کتابوں کا ایک مضبوط رشتہ قائم کرنا ہے کیونکہ کتابیں ہی ہمارے ذہن کی کائنات کو وسعت بخشتی ہیں اور ہماری زندگی کو اقدار و آداب سے روشناس کراتی ہیں۔ قومی اردو کونسل نے اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے جس سے ناشرین کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے اور قارئین کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

اس کتاب میلے میں مختلف علوم و فنون کی اہم کتابیں دستیاب تھیں، مختلف موضوعات پر مستند اور معیاری کتابیں موجود تھیں۔ اردو کے جتنے بھی ممکنہ موضوعات ہو سکتے ہیں ان تمام موضوعات پر مختلف ناشرین کی کتابیں نمائش اور فروخت کے لیے رکھی گئی تھیں۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر کتاب میلے میں کتابیں موجود نہ ہوں۔ ہر طبقے کی ذہنی سطح اور پسند کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی اور عربی کی کتابیں بھی تھیں، شعرا کے دواوین بھی تھے، تراجم کی تعداد بھی خاصی تھی، بچوں کے ادب کا وافر ذخیرہ تھا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پاکستان کی مستند اور معیاری مطبوعات بھی دستیاب تھیں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شائقین کتب کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا جہاں انھیں بغیر کسی دشواری کے کم قیمت پر مطلوبہ کتابیں دستیاب تھیں۔ ناشرین اور مطبوعات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو قومی اردو کونسل کا اٹھارواں اردو کتاب میلہ بہت ہی کامیاب رہا۔

اس کتاب میلے کی ایک انفرادیت یہ بھی تھی کہ فن خطاطی کے نمونے پہلے دن سے ہی عوام کی خصوصی دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ مقبول فدا حسین آرٹ گیلری میں رکھے گئے نادر و نایاب نمونے دیکھنے کے لیے جامعات کے طلبہ و طالبات اور دیگر شعبوں سے وابستہ خواتین و حضرات کی بھی بڑی تعداد میلے میں آ رہی تھی۔ اس نمائش میں خطاطی کے ماہرین پروفیسر ظہور احمد زرگر، انیس صدیقی، پروفیسر صدر عالم، پروفیسر محسن فاطمہ نے آرٹ و ڈیزائننگ کے موضوع پر لیکچر دیے اور خطاطی کے رموز و نکات سے واقف کرایا۔

اس کے علاوہ نو روز تک چلنے والے ثقافتی اور ادبی پروگرام بھی اس طور پر ترتیب دیے گئے تھے کہ اس سے اردو کے تئیں لوگوں کا ذوق و شوق بیدار ہو اور تہذیبی اور تمدنی وراثت سے آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر ان اصناف کے احیا کی کوشش کی گئی جو رفتہ رفتہ معدوم ہو رہی تھیں یا جن کے تئیں دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی۔ بچوں کی تخلیقی صلاحیت کو اجاگر کرنے کے لیے بھی ان کی سطح کے پروگرام مرتب کیے گئے تھے تاکہ بچوں کی زیادہ سے زیادہ شرکت ہو اور ان کے اندر بھی زبان و ادب کے مطالعے کا ذوق پروان چڑھے، قومی اردو کونسل کا بنیادی مقصد ان پروگراموں کے ذریعے زبان و ادب کا فروغ تھا اور اس میلے کے ذریعے کونسل اپنے اس پیغام کی ترسیل میں کامیاب رہی کہ زبانوں کو معاشرے یا عوام سے جوڑے بغیر زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔

واضح رہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت برائے ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کا ایک خود مختار و فعال ادارہ ہے، جو اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور ہمہ جہت ترقی کے لیے ملکی سطح پر بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ صارفیت کے اس عہد میں اردو زبان کی ترقی کے لیے نو بہ نو اسکیموں اور منصوبوں کے ذریعے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین اور ڈائرکٹر قومی اردو کونسل پروفیسر ارتضیٰ کریم کی سربراہی میں سرگرم عمل ہے۔ کونسل کے ڈائرکٹر نے عہدہ سنبھالنے کے بعد جن عزائم کا اظہار کیا تھا وہ ان کی تکمیل کے لیے سرگرم ہیں۔ انھوں نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں

کتاب میلے کا جائزہ لیتے ہوئے

قومی اردو کونسل کے ایک اسٹال پر مہمانانِ ذی وقار

انصاری آڈیٹوریم میں سامعین

اردو ترانے کا ایک منظر

انسان کے روشن مستقبل کی سب سے بڑی ضمانت ہیں۔ کتاب سے ہمارا رشتہ جتنا مضبوط ہوگا، زندگی اتنی ہی خوبصورت اور بامعنی ہوگی۔ عصر حاضر کا آشوب، کتابوں سے ہماری دوری کا نتیجہ ہے۔ تمام اقوام عالم کے مذاہب میں علم کو کلیدی حیثیت دی گئی ہے۔ کونسل کتابوں تک عام آدمی کی رسائی کے لیے کئی جہتوں پر کام کر رہی ہے جس کی ایک کڑی میلہ بھی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس کتاب میلے کے توسط سے اردو کے کتب فروشوں، ناشروں، مصنفوں اور لائبریریوں کے نمائندوں کو ایک جگہ بیٹھ کر تبادلہ خیال کرنے کا موقع حاصل ہوگا۔ نیز ہمارے ناشرین قارئین کی پسند اور ناپسند سے بھی واقف ہوسکیں گے اور بازار کی ضرورتوں سے بھی۔ کونسل عرصہ دراز سے ایسی نایاب اور نادر کتابوں کی اشاعت اور فروغ میں دلچسپی رکھتی ہے انھوں نے کہا کہ ہم ایسے میلوں سے نئی نسل کو مثبت پیغام دینے کی کوشش میں ہیں تاکہ نئی نسل کتابوں سے اپنے رشتے کو زیادہ مضبوط کرسکے۔

اس کتاب میلے کو شائقین سے جوڑنے کے لیے ہر دن الگ الگ نوعیت کے ادبی و ثقافتی پروگرام کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈراما، مشاعرہ، بیت بازی، چہار بیت، تمثیلی مشاعرہ، شام غزل، داستان گوئی اور کتابوں کے جائزے قابل ذکر ہیں:

پہلا دن 14 نومبر 2015

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم کے سبزہ زار پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام 18ویں قومی اردو کتاب میلے کا افتتاح مشہور و معروف صحافی و رکن راجیہ سبھا ایم جے اکبر نے کیا جبکہ خطاطی کی نمائش کا افتتاح علی فولادی (کلچرل کاؤنسلر جمہوری اسلامی سفارت ایران) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریب کا آغاز علی سردار جعفری کی خوبصورت نظم 'ہماری پیاری زبان اردو' کی پیش کش سے ہوا۔ اس موقعے پر سامعین سے خطاب کرتے ہوئے ایم جے اکبر نے کہا کہ سیاست انسان کی طاقت ہوتی ہے لیکن کتاب انسانیت کی طاقت ہوتی ہے اور اس طاقت کو مات نہیں دی جاسکتی۔ انھوں نے مزید کہا کہ لوگ اردو سے محبت کا دعوی کرتے ہیں لیکن محبت اسی وقت قائم رہتی ہے جب اس میں تسکین اور تحسین ہو۔ انھوں نے کتاب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ لوگ شور مچاتے ہیں لیکن شور کسی بھی سوال کا جواب نہیں ہوسکتا، جواب بحث سے دیا جاسکتا ہے اور بحث وہی کرے گا جس کے پاس علم ہو۔ افتتاحی تقریب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے اردو زبان کی تعلیم پر زور دیتے ہوئے کہا کہ آپ کوئی بھی زبان پڑھیں لیکن اردو سے رشتہ ہرگز نہ توڑیں۔ انھوں نے کہا کہ کتاب پڑھنے والوں کو جو اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ دیگر چیزوں میں نہیں۔ قومی اردو کونسل کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ نے کہا کہ زبان کیسے بڑھے اس کا انحصار حکومت پر نہیں۔ انھوں نے نوجوانوں سے اردو کی طرف راغب ہونے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت اردو غریبوں، کمزوروں اور مظلوموں کی زبان ہے اسے ہرگز کم تر نہ سمجھیں۔ انھوں نے کہا کہ جو زبان ڈر اور خوف کا جواب دے سکتی ہے وہ اردو زبان ہے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ کتابوں سے دوری اس دنیا میں فساد اور انتشار کی بڑی وجہ ہے اور جب کتابوں سے دوری اختیار کی گئی معاشرہ انتشار میں مبتلا ہوا ہے۔ انھوں نے حاضرین سے اپیل کی کہ نئی نسل کو کتاب پڑھنے کی ترغیب دیں۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل اس وقت انفارمیشن ٹکنالوجی میں زیادہ مصروف عمل ہے۔ انھوں نے کہا کہ ٹکنالوجی اچھی چیز ہے لیکن اس کا صحیح استعمال ضروری ہے۔ انھوں نے پیرس سانحہ پر دو منٹ کی خاموشی اختیار کرکے مرحومین کو خراج عقیدت بھی پیش کیا۔

اس موقعے پر جناب علی فولادی نے کہا کہ اسلام میں تعلیم کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت انسانیت کی معراج ہوگی جب انسان کے ہاتھ میں اسلحہ کے بجائے قلم ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کا دہشت گردانہ سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ امن کا مذہب ہے۔ فولادی نے کہا کہ ایران ہر اس قدم کا استقبال کرے گا جو دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو وسعت دینے میں معاون ہوگا۔ اس کتاب میلے میں اردو کونسل کے خطاطی مرکز کے طلبا کے نمونۂ خطاطی کی بھی

ڈرامے میں اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آرٹسٹ

نمائش کی گئی۔ ساتھ ہی خطاطی تربیتی پروگرام کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔ اس تربیتی ورکشاپ میں ملک کے مختلف حصوں سے خطاطی کے فن اور اس کے رموز و نکات سیکھنے کے لیے لوگوں نے شرکت کی۔ 28 لوگوں پر مشتمل دو گروپ کی تشکیل کی گئی۔ اس تربیتی ورکشاپ کے لیے خطاطی کے ماہرین کی خدمات بھی لی گئیں۔ خطاطی کے فن پر اب تک صرف مردوں کی اجارہ داری تھی۔ لیکن اب اس میدان میں خواتین بڑی تعداد میں نہ صرف آرہی ہیں بلکہ اسے پیشہ ورانہ طور پر اپنا رہی ہیں۔ اس نمائش میں کئی نمونے خواتین نے بنائے تھے جو شائقین کی توجہ کا مرکز تھے۔

ہر روز شائقین کتب کے لیے ادبی و ثقافتی پروگرام کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میلے کے پہلے دن ڈرامہ بہ عنوان 'میں اردو ہوں' پیش کیا گیا۔ یہ ڈرامے ایس این لال کا تحریر کردہ ٹائٹل نغمہ انور فریدی کا تھا۔ چونکہ اردو زبان کی تشکیل میں دیگر زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اس لیے علامتی طور پر کئی زبانوں کے کردار پیش کیے گئے۔ اس ڈرامے کو اطہر نبی نے پیش کیا۔ حاضرین نے ڈرامے کی بہت تعریف کی اور کہا کہ ایسی کوششیں آج اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔

پروگرام میں پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شاہد حسین، پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی، ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر محمد اختر کے علاوہ بڑی تعداد میں اہل علم و دانش اور محبان اردو نے شرکت کی۔

دوسرا دن 15 نومبر 2015

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جاری قومی اردو کتاب میلے کے دوسرے دن ہندوستان کے مشہور قوال نظامی برادران نے اپنی مسحور کن قوالی سے ماحول کو پرکیف بنا دیا۔ اس سے قبل ادبی پروگرام کے تحت پچھلی بار کتاب میلے میں کتابوں کے جائزے کے عنوان سے ایک تقریب ایم ایف حسین آرٹ گیلری میں منعقد کی گئی جس کی صدارت پروفیسر وہاج الدین علوی (صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور نظامت ڈاکٹر جاوید رحمانی نے کی۔ اس میں کونسل کی شائع شدہ چھ کتابوں کے جائزے لیے گئے، جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز نے حصہ لیا۔ اس میں

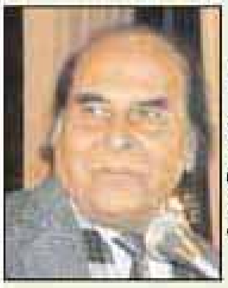

زبیر رضوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے حال ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کیمپس میں جو کتابوں کے میلے کا اہتمام کیا تھا وہ اس اعتبار سے کامیاب کوشش تھی کہ اس میلے سے کتاب پڑھنے کے کلچر کو غیر معمولی تقویت ملی۔ خاص طور سے اس زمانے میں جب کہ طلبا کی زائیدہ کتاب ہمارے مطالعے اور دسترس سے بڑی حد تک دور ہوگئی ہے۔ ایسے میلوں کے انعقاد کو اردو کے نامعلوم قاری کی دریافت کا نام دینا زیادہ صحیح ہوگا۔

قاضی عبیدالرحمن ہاشمی

14 تا 22 نومبر 2016، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں ڈاکٹر انصاری آڈیٹوریم کے وسیع سبزہ زار پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کے ذریعہ آراستہ کیا گیا اردو کتابی میلہ اپنی خوبصورتی اور افادیت دونوں اعتبار سے بے حد یادگار تھا۔ ملک کے مختلف مقامات بشمول دہلی سے آئے ہوئے تقریباً 55 اردو کتب فروشوں کی دہلی میں ایک مرکزی جگہ پر نہایت دیدہ زیب اسٹالوں میں سلیقے سے سجائی گئی مختلف موضوعات پر اردو کتابیں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ اردو کے بارے میں جس طرح کے خدشات کا اظہار ہوتا رہتا ہے، اس میلے میں پورے وقت خریداروں کی کثیر تعداد نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو میں عوام و خواص کی دلچسپی بتدریج بڑھ رہی ہے اور لوگ مشترکہ ثقافت کی نمائندہ اس زبان کے عظیم سرمایۂ علم و دانش سے بھرپور استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں وہاں مختلف اوقات میں متعدد بار گیا اور ہر بار اردو شائقین کا ایک بڑا اژدہام دیکھ کر بہت مسرور ہوا۔ اس میلے کی کشش میں اضافہ کا ایک اہم سبب وہ تو بہ تو ثقافتی، علمی اور ادبی پروگرام بھی تھے جنھیں قومی کونسل کے نہایت فعال اور مخلص ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب کی نگرانی میں بڑی محنت، لگن اور سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔

پروفیسر کوثر مظہری، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے کتاب میلے کا انعقاد کئی لحاظ سے اپنی معنویت رکھتا ہے۔ چونکہ یہ کتاب میلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں لگایا گیا جہاں کہ اردو کا خاص ماحول ہے، اس لیے اس کی افادیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ساتھ ہی کتاب میلے میں کتابوں کے جائزے، ثقافتی پروگرام اور دوسرے کئی اہم پروگرام منعقد کیے گئے۔ اس نوعیت کے پروگرام سے اساتذہ، طلبا اور دوسرے شائقین زبان و ادب مستفیض ہوتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ آئندہ بھی قومی کونسل کتاب میلے اور مذکورہ بالا پروگرام کا انعقاد کرتی رہے گی تاکہ عوام و خواص اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

مشہور قوال نظامی برادران اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے

انصاری آڈیٹوریم کے اوپن تھیٹر میں قوالی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے

عباس تنکی، ذمرد مغل، قمر صدیقی، گلشن اور صبا تحسین نے اپنے مقالے پیش کیے۔ تعطیل کا دن ہونے کی وجہ سے شائقین کتب زیادہ نظر آئے۔ دو چار بک اسٹالز کو چھوڑ کر تقریباً سبھی اسٹالز پر کتابوں کی خریداری دیکھی گئی۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے میڈیا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اردو لوگوں کے دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہماری صرف بول چال کی زبان نہیں ہے بلکہ اس سے ہمارا گہرا تہذیبی تمدنی رشتہ بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کے بولنے والے اور لکھنے والے ہندوستانیوں کی تعداد کروڑوں میں ہے اور آج بھی غیر مسلموں کی بڑی تعداد اردو سے دلچسپی رکھتی ہے۔ انھوں نے میلے میں جم غفیر کو دیکھ کر کہا کہ یہ خوش آئند بات ہے کہ نوجوان اردو پڑھ رہے ہیں کر مختلف موضوعات پر مشتمل کتابوں میں نہ صرف دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے ہیں بلکہ کتابوں کی خریداری میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔

اس میلے میں شائقین کتب کے لیے جو سب سے زیادہ دلچسپی کا موضوع تھا وہ خطاطی کی نمائش تھی۔ ایم ایف حسین آرٹ گیلری میں اس نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ جامعہ کے طلبہ و طالبات کے علاوہ خطاطی سے دلچسپی رکھنے والے سیکڑوں کی تعداد میں لوگ دیکھے گئے۔ اس نمائش میں مرد آہن سردار ولبھ بھائی پٹیل کی زندگی سے وابستہ کچھ نایاب تصاویر بھی شائقین کے لیے رکھی گئیں۔

تیسرا دن 16 نومبر 2015

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد 18ویں کتاب میلے کے تیسرے دن لوگوں کی تعداد گذشتہ دنوں کے مقابلے زیادہ نظر آئی۔ شائقین کتب نے اپنی پسند کی کتابیں خریدیں اور ثقافتی پروگرام سے لطف اندوز ہوئے۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ہماری کوشش ہے کہ بنیادی اردو تعلیم پر اپنی توجہ مبذول کریں تاکہ ہم جلد از جلد اردو قارئین کی نئی پود کو مضبوط بنیاد فراہم کر سکیں۔ انھوں نے کہا جو بھی ثقافتی پروگرام منعقد ہو رہے ہیں ان میں جہاں ملک کے فنکاروں کو یہاں اپنے اپنے فن کے مظاہرہ کے لیے دعوت دی گئی ہے وہیں دلی کے مشہور اردو اسکولوں کے طالب علموں کو بھی ہم نے یہاں مدعو کیا ہے تاکہ بڑے اسٹیج سے ان کی شناسائی ہو اور مستقبل میں وہ کسی قسم کی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔

ثقافتی پروگرام کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسکول کے طلبہ و طالبات نے رنگارنگ ثقافتی پروگرام پیش کیے جس سے قارئین محظوظ ہوتے نظر آئے۔ بچوں نے اپنے ثقافتی پروگرام میں غزل سرائی، قوالی، گروپ نغمہ سرائی، بیت بازی کو بڑے حسن و خوبی سے پیش کیا۔ شائقین آخری لمحے تک بچوں کے پیش کردہ پروگراموں سے پوری یکسوئی کے ساتھ لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس موقعے پر جامعہ

اردو کتابوں کی فروخت کا قومی ریکارڈ

قومی اردو کونسل کے کتب میلوں کا حساب کتاب

	ماہ	سال	مقام	مجموعی فروخت
1	نومبر	2000	لال قلعہ، دہلی	10 لاکھ روپے
2	نومبر	2001	لال قلعہ، دہلی	12 لاکھ روپے
3	جنوری	2003	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	16 لاکھ روپے
4	ستمبر	2003	سری نگر، جموں کشمیر	22 لاکھ روپے
5	جنوری	2004	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	23 لاکھ روپے
6	دسمبر	2004	حیدرآباد، آندھرا پردیش	24 لاکھ روپے
7	دسمبر	2005	لکھنؤ، اترپردیش	23 لاکھ روپے
8	دسمبر	2006	کولکاتہ، مغربی بنگال	16 لاکھ روپے
9	نومبر	2007	پٹنہ، بہار	14 لاکھ روپے
10	جنوری	2009	ممبئی، مہاراشٹر	26 لاکھ روپے
11	فروری-مارچ	2010	حیدرآباد، آندھرا پردیش	52 لاکھ روپے
12	مارچ	2011	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	15 لاکھ روپے
13	جنوری	2012	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	52.4 لاکھ روپے
14	نومبر	2012	لکھنؤ، اترپردیش	25 لاکھ روپے
15	ستمبر	2013	شیواجی، چھوٹا میدان، بنگلور، کرناٹک	31 لاکھ روپے
16	دسمبر-جنوری	2013-14	مالیگاؤں	87 لاکھ روپے
17	دسمبر-جنوری	2014-15	عام خاص میدان، اورنگ آباد	1,29,40,722 روپے
18	نومبر	2015	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	ایک کروڑ سے زائد

بچوں کا ثقافتی پروگرام

تمثیلی مشاعرے کا ایک منظر

شائقین کتاب خریدتے ہوئے

مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ظہیر احمد انصاری نے پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے کونسل کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس نے میلے میں جامعہ مڈل اسکول کے بچوں کو ثقافتی پروگرام پیش کرنے کا موقع دیا۔ شام میں تمثیلی مشاعرے کا اہتمام انصاری آڈیٹوریم کے اوپن تھیٹر میں بڑے تزک واحتشام کے ساتھ کیا گیا۔ اس تمثیلی مشاعرے کی پیش کش سعید عالم اینڈ گروپ ممبئی نے کی۔ اس تمثیلی مشاعرے کا عنوان لال قلعہ کا آخری مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرے کا سب سے اہم کردار محب اردو، فلم، ڈرامہ اور ٹی وی کے مشہور فنکار ٹام آلٹر نے بہادر شاہ ظفر کا رول ادا کیا۔ یہ تمثیلی مشاعرہ گزشتہ کئی سالوں سے ملک کے مختلف حصوں میں پیش کیا گیا جہاں بھرپور پذیرائی ملی۔ ٹام آلٹر نے سامعین سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس کامیابی کے پس پردہ اردو زبان کی شیرینی اور لطافت کارفرما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان کبھی نہیں مرسکتی بلکہ اردو اپنی کشش کی بنیاد پر ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس تمثیلی مشاعرے میں بہادر شاہ ظفر، غالب، مومن، ذوق اور دیگر شعرا کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا۔ مشاعرے سے خواتین وحضرات بہت محظوظ ہوئے اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

اس موقعے پر کئی ناشرین سے کتاب میلے کی بابت جب رابطہ قائم کیا گیا تو الحسنات پبلی کیشن کے انچارج نے بتایا کہ ہم نے اس کتاب میلے میں 16 اسٹال لگائے ہیں، جن میں ادبی کتابوں کے ساتھ ساتھ بچوں کا ادب اور پاکستانی کتابیں بھی شامل ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتابیں قارئین تک پہنچیں اور ان سے استفادہ کیا جائے۔ دہلی اردو اکادمی اسٹال کے انچارج عزیز حسن نے بتایا کہ ہمارے یہاں ادبی کتابیں ہی ہیں۔ اس کے علاوہ صحافت اور ادبی رسالے بھی دستیاب ہیں۔ ریکس ریمیڈیز کے سرکولیشن منیجر تسیم اختر نے کہا کہ میلے میں اسٹال لگانے کا مقصد ریکس طبی میگزین کی اشاعت عام و سلیس زبان میں یونانی طبی مضامین کے ذریعے اردو داں طبقے میں جڑی بوٹیوں کی اہمیت، تحقیقات، ادویات کی تیاری اور ان سے بیماریوں کے علاج کی تفصیلات منظر عام پر لانا ہے۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز کے اسٹاف معراج خالد نے بتایا کہ ہمارے اسٹال پر مذہبی کتابیں بڑی تعداد میں ہیں۔ اس کے علاوہ سیرت، معاشیات، میراث وغیرہ پر بھی کتابیں دستیاب ہیں۔ ہمارے اسٹال کی دو کتابوں کو سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے۔ ایک آداب زندگی اور دوسری خطبات۔

چوتھا دن 17 نومبر 2015

قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام اٹھارویں قومی اردو کتاب میلے کے انعقاد سے لوگوں میں خوشی کا ماحول ہے، جامعہ نگر سمیت دہلی کے دور دراز علاقوں کی ایک بڑی تعداد دس بجے سے لے کر رات آٹھ بجے تک رہی۔ کتابوں کی فروخت بھی جاری تھی۔ اردو خطاطی کی نمائش محبان اردو کو اپنی طرف کھینچے جارہی تھی، لوگوں کی بڑی تعداد جسے نادر و نایاب کتابوں کی کمی کی شکایت تھی اردو زبان وادب کے اس خزانے کو دیکھ کر اس کی گرویدہ ہوتی جارہی تھی۔ گویا اردو کتاب میلہ ایک پرکیف منظر پیش کررہا تھا۔ حسب معمول آج بھی شائقین کے لیے ادبی اور ثقافتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ "کتابوں کے جائزے" پروگرام کے تحت کونسل سے شائع شدہ چھ کتابوں کا جائزہ لیا گیا۔ اس مباحثے میں دہلی کی تین بڑی یونیورسٹیوں جے این یو، ڈی یو، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ نے حصہ لیا۔ مقالہ نگاروں میں محترمہ قمر جہاں، ضیاء اللہ، ڈاکٹر شعیب رضا وارثی، ڈاکٹر قمر تبریز شامل تھے۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر معین الدین جینابڑے اور پروفیسر کوثر مظہری نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر جاوید رحمانی نے ادا کیے۔ پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے اس پروگرام کو بے حد اہم اور اچھی شروعات بتاتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ارباب حل وعقد سے یہ درخواست کی کہ کیا ہی بہتر ہوا گر کونسل اپنے کتاب میلوں میں مصنف سے ملاقات کا پروگرام بھی شروع کرے جس میں مصنفین اور قارئین کے درمیان مکالمے کی زیادہ راست شکل سامنے آئے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام ہے جس کی غایت یہ ہے کہ ہماری اہم کتابوں پر اسکالرس سیر حاصل تبصرہ کرسکیں اور ڈائس پر موجود صدور اپنے تاثرات کا اظہار کریں۔ اس کا مقصد قارئین اور مصنفین

تبصروں پیش پروگرام کا منظر

خطاطی کے رموز ونکات بتاتے ہوئے پروفیسر ظہور زرگر

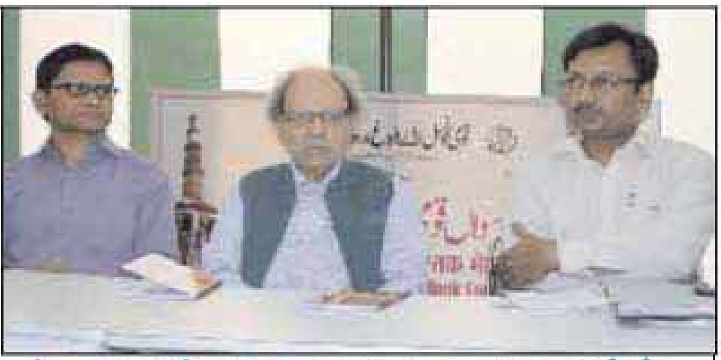

پروفیسر شمیم حنفی کتابوں کے جائزے کی صدارت کرتے ہوئے۔ ساتھ میں ابوبکر عباد اور جاوید رحمانی

داستان گوئی کا ایک دلچسپ منظر

کے درمیان مکالمے کی فضا قائم کرنا ہے جو ہمارے سیمیناروں سے دھیرے دھیرے رخصت ہورہی ہے۔

کتاب میلے کے تحت کل ہند گیلی گرافی آرٹ نمائش اور تربیتی پروگرام برائے خطاطی میں جن ماہرین کی خدمات لی گئیں ان میں پروفیسر ظہور زرگر، ڈاکٹر حفیظ احمد اور جناب انیس صدیقی کے علاوہ شاہ ابوالخیر بھی شامل تھے۔ ملک بھر سے تشریف لائے خطاط نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کونسل کی جانب سے ایسے تربیتی پروگرام کا انعقاد فن خطاطی کے لیے خوش آئند ہے۔ اعظم گڑھ کی خطاط ثنا پروین نے کہا کہ یہ فن اتنا خوبصورت ہے کہ لوگوں کی توجہ خود بخود اس فن کی طرف مبذول ہوجاتی ہے۔ اس فن میں بڑی نزاکت اور تقدس ہے۔ آندھرا پردیش کنور ضلع کی خطاط سیدہ فاطمہ نے کہا کہ اس فن سے ہماری تہذیبی وابستگی ہے اور اتنا پیارا اور پرکشش فن ہے کہ جو اس کو اختیار کرتا ہے اس کا گرویدہ ہوجاتا ہے۔

پانچواں دن 18 نومبر 2015

میلے کے پانچویں دن حسب روایت شائقین کتب کے چہرے پر جوش و خروش دیکھا گیا۔ جہاں ملک کے معروف اشاعتی اداروں کی مختلف موضوعات پر مشتمل مطبوعات شائقین کتب کے لیے دلچسپی کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ وہیں دوسری طرف فن خطاطی کی نمائش بھی لوگوں کو اپنی طرف مبذول کرنے میں کامیاب ہے۔

ادبی و ثقافتی پروگرام کے تحت چہار بیت کا انعقاد عمل میں آیا جسے ایک زمانے میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ فن عصر حاضر میں تقریباً معدوم ہوتا جارہا تھا اس کی بازیافت کی غرض سے قومی اردو کونسل نے کتاب میلے میں چہار بیت کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ اردو کا ایک کلاسیکی آرٹ ہے جسے از سر نو تقویت دینے کی ضرورت ہے تاکہ عوام و خواص کی اس سے شناسائی ہو۔ اس چہار بیت کو خلیفہ اقبال الدین اور ہمنواؤں نے بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا۔ محفل میں شریک خواتین و حضرات کے علاوہ جی کونسل اس کلاسیکی آرٹ سے بے حد محظوظ ہوئی۔

دوسرے ثقافتی پروگرام میں ہمدرد پبلک اسکول کی جانب سے رنگارنگ اور دلوں کو مسحور کرنے والے پروگرام پیش کیے گئے۔ اس پروگرام کا آغاز محمد احسان کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ اس موقعے پر بچوں نے ثقافتی پروگرام میں غزل سرائی، ڈرامہ، مولو ایکٹنگ، گروپ نغمہ اور لوک گیت پیش کیے۔ پروگرام کا اختتام قومی ترانے پر ہوا۔

کل ہند گیلی گرافی آرٹ نمائش اور تربیتی پروگرام برائے خطاط کے پیش کردہ نمونے کی ندرت اور دلکشی شائقین کی نظروں کو خیرہ کررہی تھی۔ تربیتی پروگرام کے تحت چلنے والے پہلے بیچ کا کورس مکمل ہوگیا۔ اس موقعے پر کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال کے ہاتھوں تربیتی پروگرام میں شریک حضرات کو مومنٹو اور سند دیے گئے۔

میلے میں خطاطی کی نمائش دیکھنے آئے ایران کے ایک وفد جس کی قیادت حجت اللہ عابدی کررہے تھے، نے کہا کہ کمپیوٹر اور اطلاعاتی ٹکنالوجی کے اس عہد میں بھی خطاطی کا فن ایران میں عروج پر ہے اور مستقبل میں بھی اس فن کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ انھوں نے کونسل کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں اس فن کا زندہ رہنا قابل قدر ہے اور اس کثیری ملک میں جتنی اس پر توجہ دی جارہی ہے وہ قابل تحسین ہے۔

اس موقعے پر کتاب میلے کی رونق دیکھ کر ناہید بشیر نے اپنے تاثرات کچھ اس انداز میں پیش کیے کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے ایسی کوششیں بے حد ضروری ہیں۔ اردو میں مختلف موضوعات پر ایسی کتابیں ہیں کہ جسے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ہما ناز نے کہا کہ گرچہ میری پڑھائی کانونٹ میں ہوئی ہے لیکن اردو کی ابتدائی تعلیم میرے والدین نے دی ہے۔ میں اردو پڑھنا لکھنا بہت زیادہ تو نہیں تھوڑا بہت جانتی ہوں۔ یہ بہت پیاری زبان ہے۔ جامعہ ہمدرد کی شہلا توفیق اور ایمن توفیق نے بتایا کہ یہاں آکر اردو کتابوں کا ذخیرہ دیکھنے کو ملا۔ ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں۔ ایسے پروگرام کے انعقاد پر کونسل کے لیے میری نیک خواہشات ہیں اور میں امید کرتی ہوں کہ کونسل کی جانب سے ایسے پروگرام کا انعقاد وقتاً فوقتاً ہوتا رہے گا۔ زیب النسا اور نصرت جبیں جو پٹنہ کی رہنے والی ہیں، نے کہا کہ ہمیں کتاب میلے میں آکر بہت خوشی ہورہی ہے۔ اپنی تہذیب کی بقا کے لیے یہ کوشش قابل تحسین ہے۔

چہار بیت پیش کرتے ہوئے فنکار

کتابوں کی خریداری کرتے ہوئے

اسٹیج پر شعرائے کرام

خطاطی کے پروگرام کی تصویر

چھٹا دن 19 نومبر 2015

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم کے سبزہ زار پر منعقد قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے منعقد اٹھارویں قومی اردو کتاب میلے میں چھٹے دن بھی ادبی و ثقافتی پروگرام پیش کیے گئے۔ کتابوں کے جائزے کے عنوان کی تقریب میں دہلی کے مختلف اداروں کے اسکالرس نے مختلف شخصیات، موضوعات پر تبصرے پیش کیے۔ اس پروگرام میں 5 کتابوں پر تبصرے پیش کیے گئے۔ پروگرام میں اردو ادب کے مشہور نقاد و ادیب پروفیسر شمیم حنفی نے بحیثیت صدر شرکت کی جبکہ دوسرے صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر ابوبکر عباد شامل ہوئے۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر جاوید رحمانی نے انجام دیے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ادب ہرگز نہیں سکھاتا کہ ہم اختلافات کو قبول نہ کریں۔ اختلافات ہی ہمیں آگے بڑھنے اور بہتر ادب کی تخلیق کا موقع دیتے ہیں۔ انھوں نے فضیل جعفری کی تنقید کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے درمیان ایسے افراد ہونے چاہئیں جو ہمارے خیالات سے اختلاف اور ہم پر تنقید کریں۔ اگر ایسے لوگ اور نقاد نہ ہوں تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ انھوں نے کہا کہ بعض تبصرہ نگار ایسے ہیں جن کا تعلق درس گاہوں میں پڑھنے پڑھانے سے نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کے تبصرے ہمیں بے حد متاثر کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ غیر اردو والے جو تبصرے پیش کر رہے ہیں وہ اردو والے طبقہ کے تبصروں سے بہتر ہیں۔ اس موقعے پر دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر ابوبکر عباد نے پانچوں تبصرہ نگاروں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے تبصرہ ایسا ہونا چاہیے جس میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کی طرف نشاندہی کی جائے۔ انھوں نے مبصرین کی غلطیوں کی طرف بھی اشارے کیے۔ جناب عباد نے قومی اردو کونسل کے اس پروگرام کو سراہتے ہوئے کہا کہ اس سے فن تبصرہ نگاری کو فروغ ملے گا۔

کتابوں کے جائزے پروگرام میں قومی اردو کونسل کی طبع شدہ پانچ کتابوں کا جائزہ لیا گیا۔ کلیات سجاد ظہیر پر تبصرہ کرتے ہوئے ریسرچ اسکالر نوشاد منظر نے سجاد ظہیر کی اہم کتاب 'روشنائی' کا بھرپور جائزہ پیش کیا۔ اسی کے ساتھ ریسرچ اسکالر عرفان احمد نے فضیل جعفری کی دو کتابوں 'آبشار' اور 'آتش فشاں' پر تبصرہ کیا۔ یہ دونوں کتابیں تنقیدی مضامین پر مشتمل ہیں۔ مشہور صحافی سراج نقوی نے خواجہ احمد فاروقی کی کتاب 'مکتوبات اردو کا تاریخی و ادبی ارتقا' کا جائزہ لیتے ہوئے اسے مکتوب نگاری کے ضمن میں تنقید کی اہم کتاب قرار دیا۔ اس کے علاوہ اردو بک ریویو کے ایڈیٹر عارف اقبال نے مسٹر اوناوالے کی مشہور کتاب 'تعلیم سماج اور کلچر' پر بہترین تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم کا سماج اور کلچر سے گہرا تعلق ہے۔ محسن علی حق نے حنیف نقوی کی کتاب 'تحقیق و تعارف' کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ کتابوں کے جائزے کے پروگرام کو اہل علم نے بے حد پسند کیا۔

ادبی و ثقافتی پروگرام کے تحت 'داستان گوئی' کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام کو تھرڈ ورلڈ فلم پرائیویٹ لمیٹڈ نے پیش کیا۔ داستانوں میں بات سے بات پیدا کرکے، اتنا دلکش سماں باندھا جاتا ہے کہ قارئین حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک کلاسیکی فن ہے جو اب وقت کی کمی کو لے کر معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ اس پروگرام میں عرفان صدیقی، عامر احمد، پونم گرومانی، اور انکت چڈھا نے داستان امیر حمزہ کو بہت ہی پر اثر انداز میں پیش کیا۔ سامعین اس پروگرام سے بہت لطف اندوز ہوئے۔

اس موقعے پر کل ہند کیلی گرافی آرٹ نمائش اور ترغیبی پروگرام برائے خطاطی کے دوسرے ترغیبی گروپ کا آغاز کیا گیا۔ خطاطی ٹریننگ میں شرکت کرنے والوں کا کونسل کے ریسرچ آفیسر جناب انتخاب احمد نے والہانہ استقبال کیا۔

ساتواں دن 20 نومبر 2015

18 ویں قومی اردو کتاب میلے کے ساتویں دن بھی لوگوں کی گہما گہمی دیکھی گئی خاص کر جامعات کے طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد تھی۔ مختلف موضوعات پر اردو کتابیں شائقین کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ خصوصاً بچوں کی ذہنی نشو و نما اور اخلاق و کردار کو سنوارنے والی مفید اور معلومات سے بھرپور دلچسپ کتابیں دستیاب تھیں۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مشاعرے کے شائقین اور شعرا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی جڑیں عوام کے درمیان ہیں اور جب تک

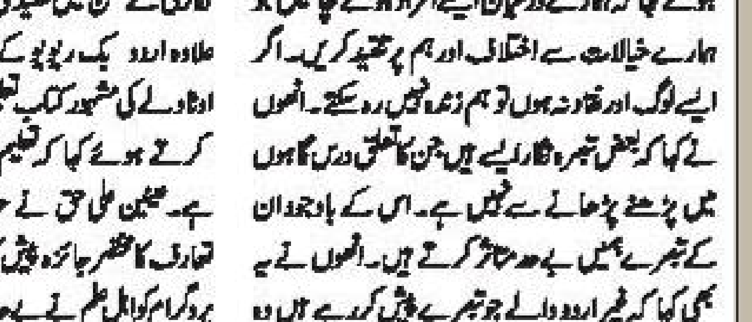

مدرسہ حضرت نظام الدین کے بچے تمثیلی مشاعرہ پیش کرتے ہوئے

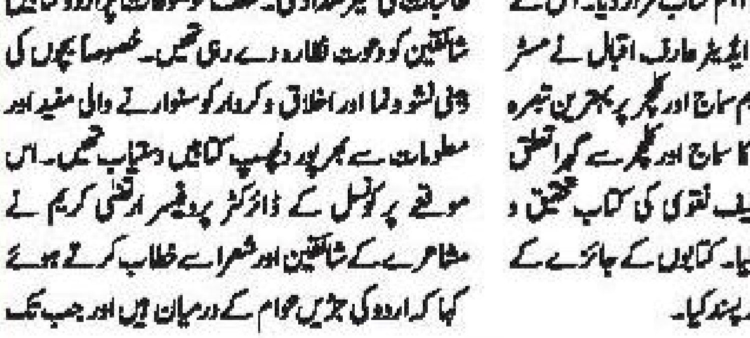

کتاب میلے کا ایک منظر

اسلامی کوئز میں حصہ لیتے ہوئے مدرسے کے طلبا

بیت بازی جیوری کے ممبران

اردو ادارے عوام سے رابطے میں کامیاب نہیں ہوں گے اردو کی کامیابی ناممکن ہے، خدا کا شکر ہے میں نے اپنی مختصر سی مدت کار میں ہی اس سلسلے کو آگے بڑھایا ہے اور اس میں مجھے کامیابی ملی ہے۔ اردو کونسل نے اپنے دائرہ کار کو کافی وسعت دی ہے اور ہم کو ہر طبقے سے تعاون مل رہا ہے۔ اس کتاب میلے میں شامل ناشرین بھی کتابوں کی شاندار فروخت سے بہت خوش ہیں اور یہ بھرم ٹوٹا ہے کہ اردو کی کتابیں خریدنے والے کم ہوئے ہیں۔ قومی اردو کتاب میلے میں ریکارڈ خریداری ہوئی ہے۔

آج کے دن کی انفرادیت یہ تھی کہ الفاروق انٹرنیشنل کے مالک جناب فاروق صاحب اور عراق سے تشریف لائے جناب عبدالرحیم صاحب کے علاوہ آسٹریلیا سڈنی سے تشریف لائے مہمانان نے اس موقعے پر میلے میں موجود پبلشرز، مجبوری پبلی کیشن، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مرکزی مکتبہ اسلامی، ایم آر پبلشرز، فرید بک ڈپو، الحسنات بک اسٹال کا معائنہ کیا اور لگ بھگ 75 لاکھ سے زائد کی کتابوں کے آرڈر دیے۔ یہ اس کتاب میلے کی بڑی کامیابی تھی۔

ان سب کے ساتھ کیلی گرافی اور خصوصاً اردو کیلی گرافی و خطاطی آرٹ کا نمائشی پروگرام سب کی توجہ کا مرکز رہا۔ نمائش میں شامل فنکاروں کے تخلیقی فن پارے اپنے اندر اس قدر جاذبیت سموئے ہوئے تھے کہ آنے والے مہمان ان کی طرف دیوانہ وار کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو رسم الخط میں تیار کیے گئے فن کو طغروں کی شکل دی گئی جن میں ماضی اور حال کے مشہور و معروف شاعروں کے منتخب کلام، مفکرین کے اقوال زریں، احادیث نبوی اور قرآن کریم کی سورت و آیات کو نہایت خوبصورت انداز میں تحریر کیا گیا تھا۔ حسب روایت ثقافتی پروگرام کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم کے اوپن تھیٹر میں مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت وقار مانوی نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ اس مشاعرے میں دہلی اور اس کے گرد و نواح کے شعرائے کرام نے شرکت کی۔ اس موقعے پر جن شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان میں قابل ذکر نام اسد رضا، ڈاکٹر وسیم راشد، محترمہ ممتاز تبسم، شمس رمزی، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، ملک زادہ جاوید، اقبال اشہر، جاوید قمر، امیر امروہوی، انور غازی آبادی، پاپولر میرٹھی، احمد علوی، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، سلیم صدیقی، منیر ہمدم، ذکی طارق، ڈاکٹر رحمان مصور، ڈاکٹر مشتاق صدف ہیں۔

آٹھواں دن 21 نومبر 2015

اردو کتاب میلے کا آٹھواں دن نہایت کامیاب رہا۔ شہر اور اطراف کے متعدد اسکولوں کے طلبہ، اساتذہ اور دوسرے اداروں نے کتاب میلے میں شرکت کی اور کتابوں کی خریداری میں منہمک نظر آئے۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے میلے کی گہما گہمی کو دیکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مادیت اور صارفیت کے عہد میں بھی ہمارے معاشرے کا رشتہ کتابوں سے قائم ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ شائقین کتب کی بھیڑ سے ہمیں اندازہ ہوگیا کہ معاشرے کو آج بھی اپنی تہذیب و کلچر کو زندہ رکھنے کے لیے کتابوں کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسکول اور جامعات کے علاوہ بھی ایک بڑی آبادی ہے جو شوق سے کتابیں خریدنا اور پڑھنا چاہتی ہے۔ اس نئی آبادی کو اور وسعت دینے کے لیے ہمیں اور زیادہ سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے اور دیگر اداروں اور تنظیموں کو بھی اس نئی آبادی کے مسائل اور مطالبات پر غور کرنا ہوگا۔ قومی اردو کتاب میلے میں اردو تہذیب اور وراثت سے روشناس کرانے کے لیے مختلف نوع کے ادبی و ثقافتی پروگرام بھی منعقد کیے گئے۔ اسی پروگرام میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے طلبہ نے مختلف کلاسیکی و مشہور شعرا کے نام سے گروپ بنایا جن میں آٹھ ٹیموں نے حصہ لیا۔ ہر ٹیم تین افراد پر مشتمل تھی۔ اسی میں کامیاب ٹیم کو انعامات سے نوازا گیا۔ اس زمرے میں جو انعامات طے کیے گئے تھے بالترتیب 10000، 6000، 4000 اور الگ سے ہر حصہ لینے والے کو ایک ایک ہزار دیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دو اساتذہ جیوری کے لیے نامزد کیے گئے تھے۔ پروفیسر احمد محفوظ اور ڈاکٹر ندیم احمد۔ اس موقعے پر پروفیسر احمد محفوظ نے بیت بازی مقابلے کے مقصد اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اشعار کی جو قرأت ہوتی ہے وہ بہت اہم چیز ہے۔ شاعری کی تفہیم، تشریح کا جو سلسلہ ہے وہ اسی پر منحصر ہے۔ بیت بازی مقابلے میں

بیت بازی کا منظر

صبیح بخاری کا استقبال کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم

خطاطی کے مصورین کو ایوارڈ دیتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم اور ڈاکٹر شمس اقبال

اوّل پوزیشن مومن خاں مومن ٹیم نے حاصل کی۔ یہ ٹیم محمد مشرف رضا، حسن اکرم اور فیصل نظیر پر مشتمل تھی۔ دوسری پوزیشن حاصل کرنے والی ٹیم میر تقی میر جس میں صدیقہ یاسمین، میرہ فاطمہ اور محفوظ الرحمٰن نے حصہ لیا اور تیسری پوزیشن کے لیے ناسخ دہلوی کی ٹیم کامیاب ہوئی جس میں حصہ لینے والوں میں محمد نسیم عابد، شہواز، احتشام الحق کے نام قابل ذکر ہیں۔ جبکہ نظامت کے فرائض جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر نوشاد منظر نے بہ حسن وخوبی انجام دیے۔ بیت بازی پروگرام کو لوگوں نے کافی پسند کیا۔ اس پروگرام میں قطر کے جناب صبیح بخاری تشریف لائے جن کا خیر مقدم کرتے ہوئے ڈائرکٹر قومی اردو کونسل پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ یہ اردو کے بہت اچھے دوست ہیں ان کی موجودگی سے ہمارے بزم میں رونق آگئی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو ایک عجیب زبان ہے اس کی بے پناہ مقبولیت نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک میں بھی ہے۔ یواے ای میں اردو زبان کو تیسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جاچکا ہے۔ اس موقعے پر جناب صبیح بخاری نے کہا کہ ہماری زبان کسی سرحد، کسی ملک، کسی قوم یا کسی مذہب کی پابند نہیں ہے بلکہ یہ ساری دنیا کی زبان بن کر رہے گی۔

نواں دن 22 نومبر 2015

اردو کتاب میلے کا نواں اور آخری دن انتہائی کامیابی اور خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہوا۔ شائقین کتب کے جوش وخروش کو دیکھتے ہوئے میلے کے وقفہ میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس موقعے پر محبانِ اردو نے نظم وضبط کا پورا خیال رکھا اور انتہائی شائستگی کا مظاہرہ کیا۔ آخری دن ہونے کے سبب شہر اور قرب وجوار کی کثیر تعداد نے کتابوں کی خریداری میں خوب دلچسپی لی۔ اردو سے تعلق اور محبت کا جادو لوگوں کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قومی اردو کتاب میلہ اتنا کامیاب نہ ہوتا۔ یہ بات قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اختتامی پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ اس میلے کا آغاز 14 نومبر کو ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ 2013 میں جہاں اردو کے 35 ناشرین شریک ہوئے تھے وہیں 2015 میں 55 ناشرین شریک ہوئے ہیں اور اسٹالز کی تعداد بڑھ کر 87 ہوگئی۔ انھوں نے کہا کہ 2013 میں جہاں 30 لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئی تھیں وہیں 2015 میں ایک کروڑ سے زائد کی کتابیں فروخت ہوچکی ہیں۔ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اردو سے محبت اور لگاؤ میں عوام میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اردو کی اہمیت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اس موقعے پر خطاطوں کو سند اور مومنٹو بھی تقسیم کیے گئے۔ انھوں نے میڈیا کے کردار کو سراہتے ہوئے کہا کہ کسی بھی سرگرمی کی کامیابی میں میڈیا کا اہم رول ہوتا ہے۔ میڈیا کے ذریعے ہی عوام تک اپنی بات پہنچائی جاسکتی ہے۔ بہتر اور شفاف خبرنویسی اور پیشہ ورانہ صلاحیت کے فروغ کے لیے انھوں نے اردو اخبارات کے صحافیوں کے لیے ہر تین مہینے پر مشتمل ایک ریفریشر کورس شروع کرنے کی بات کہی۔

اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ہم جو آرٹ دیکھ رہے ہیں وہ کونسل کی بیداری اور بہتر نگرانی کا نتیجہ ہے۔ اس موقعے پر بہترین ناشر کا انعام الحسنات بک ڈپو کو دیا گیا جبکہ بہترین کلکشن کا ایوارڈ مشترکہ طور پر مکتبہ جامعہ اور نیشنل بک ٹرسٹ کو دیا گیا۔ اختتامی تقریب میں معصوم مرادآبادی، مولانا اکبر علی فاروقی، انجم عثمانی، ملک زادہ جاوید، شیر خاں ریاض، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری، عارف اقبال، مولانا سید جلال حیدر نقوی کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ شریک تھے۔

اس نو روزہ قومی اردو کتاب میلے کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں کونسل کے فعال اور متحرک افسران کے علاوہ اسٹاف نے جس ٹیم اسپرٹ کا ثبوت دیا وہ قابل رشک ہے۔ میلے میں جن کی خدمات لی گئیں ان میں پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر انتظامیہ جناب کمل سنگھ، اجمل سعید، فیروز عالم، انتخاب احمد، شعیب رضا فاطمی، محمد احمد خاں، محمد احمد، شیر انجم، توفیق احمد، مولانا قاسم، محمد علی، نوشاد عالم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر ارکان کی مشترکہ کوششوں سے یہ میلہ بے حد کامیاب رہا۔

■

Dr. Shahid Akhtar Ansari 38/7, Noor Nagar, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

ثقافتی پروگرام پیش کرتے ہوئے جامعات کے طلبا

اردو میں دفتری وانتظامی وضع اصطلاحات کی ضرورت

اسلم جلوداں

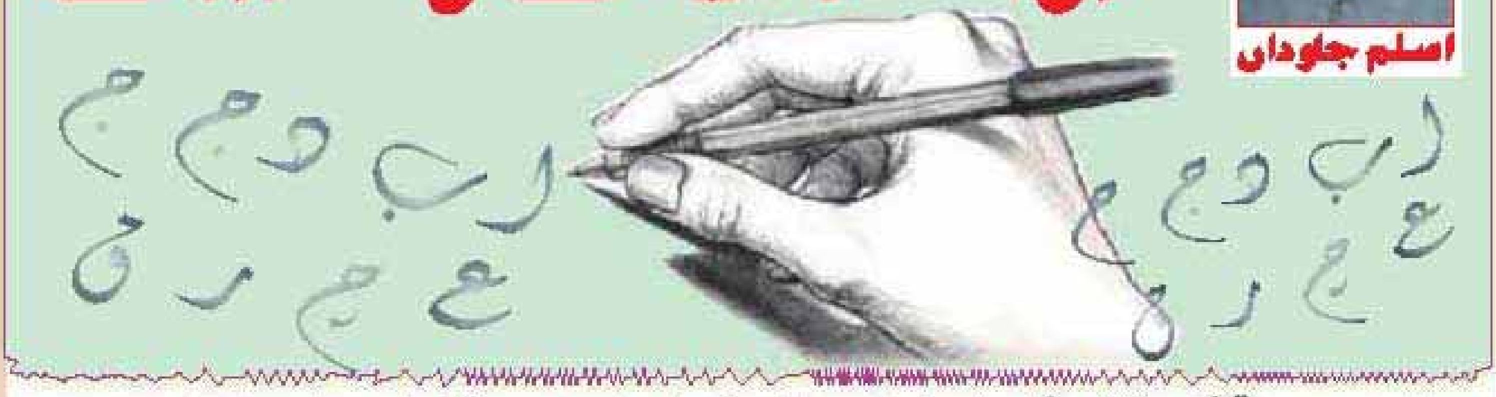

اہل زبان سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ آج دنیا کی بہت ساری زبانیں دم توڑ رہی ہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی زبان مر رہی ہے۔ ایسے میں چھوٹی زبانوں کو گمشدگی کا خطرہ لاحق ہے۔ کوئی بھی زبان اُسی وقت زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا حق رکھتی ہے اور دعویٰ کر سکتی ہے، جب اس میں انتظامی اور تعلیمی اصطلاحات کی فراوانی ہو اور وہ زمانے کے تقاضے وضرورت کے عین مطابق اپنے دامن کو وسیع کرتی رہتی ہو۔ 10 ستمبر 2015 کو بھوپال میں ہونے والی '10ویں عالمی ہندی کانفرنس' میں وزیر اعظم نریندر مودی نے کہا کہ آنے والے وقت میں ڈیجیٹل ورلڈ میں صرف تین زبانیں انگریزی، ہندی اور چینی باقی رہیں گی۔ زبانوں کی موت اور گم شدگی کی خبر نے بالغ النظر اہل زبانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ لہٰذا اب زبانوں کی ترقی اور وسعت پر توجہ دی جارہی ہے۔ پاکستان کے مشہور انگریزی اخبار 'The Nation' (مورخہ 8 ستمبر 2015) کے مطابق وہاں کی عدالت عظمیٰ نے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اردو کو عملی طور پر سرکاری زبان بنائیں اور سرکاری معاملات سے جڑے ہوئے سارے کام اردو ہی میں کیے جائیں۔

اردو بہار، اتر پردیش، جھارکھنڈ، دہلی، مغربی بنگال، آندھرا پردیش کی دوسری سرکاری اور دفتری زبان ہے مگر کہیں بھی اس کا عملی نفاذ نہیں ہو رہا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اردو زبان میں ہندی کی طرح انتظامی اور دفتری اصطلاحات کی کوئی مستند اور مفصل فرہنگ آج تک نہیں تیار کی گئی ہے۔

اگر ہم اردو زبان کو زندہ اور عملی زبان بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں دفتری اور انتظامی اصطلاحات کی فوری تدوین کرنے اور اس کے نفاذ کے لیے متواتر اور وسیع تر 'اردو عمل گاہوں' (Urdu Workshops) کے انعقاد کی ضرورت ہے۔

جہاں تک وضع اصطلاحات کا سوال ہے، اردو زبان میں مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی نے 1922 میں 'وضع اصطلاحات' کے نام سے جو ایک کتاب لکھی تھی، وہ اس فن پر اب تک کی اول اور آخر کتاب ہے۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے شعر وشاعری اور ادب کی مشاطگی پر ہی توجہ صرف کی ہے، اردو زبان کے فروغ اور توسیع میں کماحقہٗ حصہ نہیں لیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو میں اصطلاحوں کی کم مائگی کا شدید احساس ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ اس کے استعمال میں بالعموم بے راہ روی بھی دیکھی جارہی ہے۔

خاص طور سے دفتری اصطلاحات اور الفاظ کے سلسلے میں اردو زبان تقریباً تہی دامن ہے اور اگر دوست داران اردو کی غفلت کی یہی حالت رہی تو آئندہ دو دہائیوں میں اصطلاحات اور الفاظ کی تنگی کے سبب اردو دوسری سرکاری زبان ہونے کا دعویٰ اور صلاحیت دونوں کھو دے گی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں بھی ہندی زبان کی طرح سنجیدہ، منظم اور اجتماعی طریقے سے اصطلاحات سازی کا کام شروع کیا جائے۔ اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور انجمن ترقی اردو، دہلی کی کاوشیں لائق تحسین ہیں، جنھوں نے اس سمت کوشش کی ہے، لیکن 'انتظامیہ' کے نام سے شائع شدہ انتظامی فرہنگ بے حد مختصر اور تنگ دامن ہے۔ زمانے کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں اصطلاحات کی قلت کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جارہا ہے۔

اصطلاحات دو طرح کی ہوتی ہیں: (1) مفرد اصطلاحات (2) مرکب اصطلاحات

مفرد اصطلاحات: مفرد اصطلاحات کے لیے عام طور پر انگریزی اور ہندی اصطلاح کے مقابل ایک اردو لفظ لایا جاتا ہے۔ مثلاً حکومت = Government، ریاست = State، صوبہ = Province وغیرہ۔ لیکن مفرد اصطلاحات کا وضع کرنا یا ان کا تعین کرنا بڑی صلاحیت، تحقیق اور احتیاط کا متقاضی ہے۔ بعض حضرات اس میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں اور ہر اصطلاح کی تخصیص اور تفریق نہیں کر پاتے ہیں، جس کے سبب وہ ایک ہی اصطلاح کو مختلف معنوں میں استعمال کرکے اردو میں اصطلاحی بے راہ روی کو راہ دے رہے ہیں۔ مثلاً ذیل کے مجموعہ الفاظ پر غور کریں کہ مفرد اصطلاحات کے استعمال میں کتنی احتیاط اور وقت نظر کی ضرورت ہے:

مجموعہ نمبر – 1

Progress, Development, Promotion.

مجموعہ نمبر – 2

Change, Modification, Amendment, Alteration.

مجموعہ نمبر – 3

Sanction, Acceptance, Approval.

مجموعہ نمبر – 4

Pension, Stipend, Scholarship, Allowance.

مجموعہ نمبر – 5

Act, Law, Constitution, Statute, Code.

مجموعہ نمبر - 6

Loan, Borrow, Lend.

گویا مفرد اصطلاحات کی توضیع کا معاملہ پیچیدہ اور مشکل ترین اس لیے بھی ہوجاتا ہے کہ مختلف اصطلاحات کے لیے الفاظ طے شدہ نہیں ہیں جس کے سبب اس میں بڑی بے احتیاطی اور بے راہ روی پائی جاتی ہے۔

مرکب اصطلاحات:

مرکب اصطلاحات کا معاملہ اور بھی پیچیدہ اور دشوار گزار ہے۔ اس کا زیادہ انحصار سابقوں اور لاحقوں پر ہے۔ ہند آریائی خاندان کی زبانوں میں مرکب اصطلاحات وضع کرنے کے لیے سابقے اور لاحقے کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ سامی خاندان کی زبانوں میں یہ معاملہ اشتقاق کے ذریعے طے ہوجاتا ہے۔ عربی سامی خاندان کی زبان ہے۔ اس سلسلے کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

(1) اختیار یافتہ — Authorised

(ہند آریائی خاندان کی زبان کے قاعدے کے مطابق)

تجاوز شدہ — Exceeded

قانون سازیہ — Legislative

(2) مختار — Authorised

(سامی خاندان کی زبان کے قاعدے کے مطابق)

متجاوز — Exceeded

مقننہ — Legislative

اردو چونکہ ہند آریائی خاندان کی زبان ہے، اس لیے مرکب اصطلاحات کے وضع کرتے وقت سابقے اور لاحقے کا استعمال حتی الامکان کیا جانا چاہیے اور کیا بھی جاتا ہے۔ مثلاً انگریزی کے لاحقے 'Logy' کے لیے اردو میں 'یات' کا استعمال کرکے مرکب اصطلاح وضع کی جاتی ہے:

سماجیات — Sociology

حیاتیات — Biology

نفسیات — Psychology

لیکن مشکل امر یہ ہے کہ یہ سابقے اور لاحقے طے نہیں ہیں۔ مثلاً انگریزی کے ایک لاحقے 'Ation' کے لیے اردو میں لاحقوں کی صورت حال ملاحظہ ہو:

قومیانہ — Nationalization

شجرکاری — Plantation

سماجیات — Socialization

درجہ بندی — Classification

طبقہ واریت — Startification

اب آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سابقے اور لاحقے کی مدد سے مرکب اصطلاحات وضع کرنے کا کام یا ان کی تدوین جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جب بہار، یوپی، دہلی، جھارکھنڈ، مغربی بنگال اور آندھرا پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا تو اس کو ایک عملی، وقیع اور زندہ زبان بنانے اور دفتروں میں اردو کے کامیاب اطلاق و استعمال کے لیے سرکاری مستند اداروں کے ذریعے ایک سہ لسانی 'فرہنگ دفتری و انتظامی اصطلاحات' کی تدوین کی جائے اور اس کام کے لیے لائق و فائق اور فعال حضرات پر مشتمل ایک 'وضع اصطلاحات کمیٹی' کی تشکیل کی جائے جو اردو میں اصطلاحات کی کم مائگی اور بے راہ روی کا خاتمہ کرکے اس زبان کو دفتروں میں استعمال کے اہل بنا سکے اور اردو کا شمار زندہ زبانوں میں ہو سکے۔

اصطلاحات سازی کے چند بنیادی اصول:

اصول نمبر (1): وضع اصطلاحات کے وقت درج ذیل نکات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(الف) اصطلاحات سہل ہوں۔

(ب) بولنے سننے میں خوشگوار معلوم ہوں۔

(ج) یہ جن معنوں کو واضح کرنے کے لیے بنائے گئے ہوں، ان کا کما حقہٗ ساتھ دیں۔

(د) یہ قواعد کے اصول وضوابط کے مطابق ہوں۔

(ہ) ان کے وجود سے اردو زبان میں ایک اضافے کا احساس ہو نہ کہ ثقالت اور بوجھل پن کا۔

اصول نمبر (2): انگریزی کی جو اصطلاحات اردو زبان میں دخیل، مروج اور مقبول عام ہیں، ان کے مقابل خواہ مخواہ اصطلاحات وضع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً ٹیلی فون، اسٹیشن، ٹکٹ، موٹر سائیکل، کار، بلب، ریوالور، راکٹ، میزائل، کمپیوٹر، موبائل فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ای میل، چارجر، ڈیزل، پٹرول، بل، اسمبلی، کونسل، سکریٹریٹ، تھرمامیٹر، بریف کیس، ڈاکٹر، پروفیسر، پائلٹ، ڈرائیور وغیرہ، لیکن اگر توسیع زبان کی غرض سے کچھ انگریزی اصطلاحات کو اُردوانے کا کام کیا جائے تو یہ مستحسن قدم ہوگا۔ مثلاً: سکریٹریٹ (Secretariat) سے سکریتاریہ، پرولٹریٹ (Proletariat) سے پرولتاریہ، ڈائرکٹوریٹ (Directorate) سے ڈائرکتوریہ، کلکٹریٹ (Collectorate) سے کلکتوریہ، گزٹ (Gazzette) سے غزت، کمپیوٹر (Computer) سے کمپوطار، ڈاکٹر (Doctor) سے دکتور وغیرہ۔

اصول نمبر (3): وضع اصطلاحات کے وقت اس بات کا بھی بھرپور لحاظ رکھا جائے کہ جن مفاہیم کو ادا کرنے کے لیے پہلے سے اصطلاحات وضع شدہ ہیں، ان کے لیے خواہ مخواہ نئے اصطلاح وضع نہ کیے جائیں۔ ہاں، جن وضع شدہ اصطلاحات میں غلطیاں ہوچکی ہیں، ان کے بارے میں ماہرین نئے سرے سے غور کرسکتے ہیں۔

مثلاً: دوربین Telescope (Telescope= Tele+scope) کی صحیح اصطلاح دوربین کی بجائے دورنما ہونی چاہیے، کیونکہ Scope لاحقہ کے لیے اردو میں 'نما' لاحقہ لایا جاتا ہے۔ جیسے برق نما (Electroscope =Electro+scope)۔

'بین' کا تعلق دیکھنے سے ہے اور 'نما' کا تعلق دکھانے سے ہے۔ لہٰذا 'بین' لاحقے کا استعمال 'Vision' کے لیے ہونا چاہیے۔ اس کے مطابق Television کے لیے دوربین ہونا چاہیے۔ اور اسی طرح Microscope کے لیے 'خردبین' کی بجائے 'خردنما' ہونا چاہیے۔ لہٰذا اس طرح کی غلطیوں پر مشتمل رائج اصطلاحات کی از سر نو تصحیح و تعیین کا کام ماہرینِ زبان اور صائب الرائے حضرات کے ذریعے کیا جانا چاہیے۔

اصول نمبر (4): وضع اصطلاحات کے وقت اشتقاق کا بھرپور لحاظ رکھا جائے۔ مثلاً ایک لفظ ''Print'' کو لیں۔ اس سے درج ذیل الفاظ بن سکتے ہیں:

(1) Print (2) Printing (3) Printer (4) Printing Press (5) Printed (6) Printable

ان کے لیے اردو اصطلاحات درج ذیل ہیں:

(1) طبع (2) طباعت (3) طابع (4) طباعت خانہ (مطبع) (5) مطبوعہ (6) قابلِ طبع۔

اگر ہم ذرا سی غفلت اور بے احتیاطی سے Printing Press کے لیے طباعت خانہ کی بجائے طبع خانہ لکھ دیں گے تو یہ اصطلاح سازی کا نقص ہوگا اور مشتقات بناتے وقت اس کا یہ نقص ظاہر ہوجائے گا۔ انگریزی کے ایک لفظ ''Honour'' کو بھی لیں اور اس کے مشتقات پر بھی غور کریں۔

(1) Honour (2) Honourably (3) Honarary (4) Honorarium (5) Honarable

جن کا ترجمہ حسب ذیل ہوگا:

(1) اعزاز (2) بطور اعزاز (3) اعزازی (4) اعزازیہ (5) معزز۔ اگر ہم نے Honourably کا ترجمہ غلطی سے بطور اعزاز کی بجائے اعزازی کردیا تو پھر Honorary کا کیا ہوگا؟

اصول نمبر (5): مشتقات بناتے وقت اس بات

کا بھی خیال رکھا جائے کہ معنی کی بھرپور ادائگی اگر بنیادی لفظ سے نکلنے والے مشتقات سے نہیں ہو رہی ہے یا کوئی اور اشکال سامنے ہو تو پھر دوسرے الفاظ سے بھی کام لینا چاہیے۔ مثلاً:

(1) ترتیب: Editing۔ مرتّب: Edit۔ ادارت: Editorial۔ مدیر: Editor۔ اشاعت: Edition۔

(2) ماموری/ ماموریت: Deputation۔ نائب: Deputy۔ مامور: Depute۔

(3) تشہیر: Publicity۔ مشتہر: Publicise۔ شائع: Publish۔ اشاعت: Publication۔ مطبوعات: Publications۔

اصول نمبر (6): اردو بنیادی طور پر ہند آریائی خاندان کی زبان ہے، جس میں اصطلاح سازی کے لیے سابقے اور لاحقے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ فارسی بھی اسی خاندان کی زبان ہے، اس لیے اس زبان میں بھی اصطلاحات بنانے کے لیے یہی اصول اپنایا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ عربی، سامی خاندان کی زبان ہے جس میں سابقوں اور لاحقوں کا وجود ہی نہیں ہے، بلکہ اس میں اصطلاحات مشتقات کے ذریعے بنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ اصول یا رواج اردو میں بھی پایا جاتا ہے جس کے سبب ہم اصطلاح سازی کے وقت کسی ایک اصول پر کاربند نہیں رہ سکتے اور ایسے موقع پر جب دونوں قاعدوں کے مطابق ہمارے سامنے اصطلاحات آئیں تو ہمارے لیے ترک و قبول کا معاملہ بڑا نازک اور احتیاط کا متقاضی ہوگا۔ ایسے موقعوں پر ہم درج ذیل اصولوں کو سامنے رکھ سکتے ہیں:

(الف) ان میں جو اصطلاحات رائج الوقت ہوں، انھیں ترجیح دیں۔

(ب) ان میں جو اصطلاحات زیادہ خوبصورت، خوشگوار اور چست ہوں، اسے ترجیح دیں۔

(ج) جو اصطلاحات ہمارے نفسِ مطلب کو زیادہ اچھے ڈھنگ سے واضح کریں، اسے ترجیح دیں۔

مثلاً:- Authorised کے لیے 'اختیار یافتہ' اور 'مختار' دو اصطلاحات ہیں۔ ایک آریائی خاندان کی زبان کے اصول یعنی لاحقہ کے ساتھ اور دوسرا سامی خاندان کی زبان کے اصول کے مطابق ہے۔ اب اگر ہمیں Authorised Dealer لکھنا ہے تو ہمارے سامنے دو الفاظ ہیں: اختیار یافتہ فروشندہ اور مختار فروشندہ۔

اب یہیں ہمارے سامنے ترک و قبول کا معاملہ ہے۔ یہ ہمارے ذوقِ سلیم اور صوابدید پر ہے کہ ہم کسے ترجیح دیں۔ میرے خیال میں اختیار یافتہ فروشندہ کے مقابلے مختار فروشندہ زیادہ سبک، مختصر اور سہل لفظ ہے، لہٰذا اسے ترجیح دینی چاہیے۔

اسی طرح Legislative Assembly کے لیے مجلس قانون ساز اور مجلس مقننہ دونوں اصطلاحات ہیں۔ ان میں مجلس قانون ساز، زیادہ باوقار، خوبصورت اور عام فہم ہے، لہٰذا اسے ترجیح دی جائے۔

اصول نمبر (7): اصطلاح سازی کے وقت یہ اصول بھی پیش نظر رہے کہ ہم انگریزی یا ہندی اصطلاحات کا لفظی ترجمہ نہ کریں، یعنی اصطلاح سازی برائے اصطلاح سازی ہو نہ کہ برائے ترجمہ و نقل۔

مثلاً: وزیر اعلیٰ کا ترجمہ ہندی میں مکھیہ منتری اور انگلش میں Chief Minister ہے اور ظاہری بات ہے کہ یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ اگر لفظی ترجمہ ہوتا تو وزیر خصوصی ہوتا۔ ہم اسی اصول کو سامنے رکھیں گے تو اعلیٰ اور معیاری اصطلاحات وجود میں آسکیں گے، ورنہ ہم نقل اور ترجمے کے چکر میں پڑ کر درست اور چست اصطلاح وضع کرنے سے قاصر رہیں گے۔ ایک اور مثال لیں کہ Book Depot کا ترجمہ 'کتب گاہ' ہوگا، لیکن اس کے لیے ایک ہی لفظ 'مکتبہ' کافی اور بہتر ہے۔ اسی طرح Daily Wages کے لیے 'روزانہ اُجرت' کی بجائے اگر 'یومیہ' لکھیں (جس کے معنی 'روزانہ کی اُجرت' ہے) تو زیادہ بہتر اور مناسب ہوگا۔

اصول نمبر (8): جس انگریزی یا ہندی اصطلاح کا ترجمہ کیا جا رہا ہو یا اس کی اردو اصطلاح وضع کی جا رہی ہو، اس کی مکمل جانکاری لازمی ہے۔ مثلاً Hypnotism کے معنی مصنوعی طور پر ایک شخص کے ذریعے دوسرے شخص کو سُلا دینا اور اس پر اپنا کنٹرول رکھنا ہے۔ لہٰذا ترجمہ ''تنویمیت'' ('تنویم' بمعنی سلانے اور 'یت' لاحقہ 'ism' کے لیے) ہوگا۔ لیکن Mesmerism جس کے معنی بھی سُلا دینے کا عمل ہوتا ہے، اس کا لفظی ترجمہ نہیں ہوسکتا کیونکہ Mesmer ایک شخص کا نام ہے جس نے اس علم کو ایجاد کیا۔ لہٰذا اسم معرفہ کا ترجمہ نہیں ہوگا، اس کی اصطلاح مسمر+یت ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اصطلاح سازی کے وقت لفظ کے ماخذ اور اس کی اصل کا جاننا اور اسے پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔

اصول نمبر (9): اصطلاح سازی کے وقت یہ نکتہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ انگریزی اور ہندی میں بہت سارے اصطلاحات کے مرادفات بھی ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ تمام مرادفات کے لیے اصطلاح سازی کی جائے اور سب کے لیے ایک ایک لفظ وضع کیے جائیں بلکہ ایک ہی اصطلاح مختلف مرادفات کے لیے طے کی جائے۔

مثلاً: Fridge اور Refrigerator دونوں ایک ہی طرح کی مشین کے دو نام ہیں، لہٰذا ان کے لیے عربی او رفارسی میں رائج ایک اصطلاح 'ثلاجہ' کافی ہے (لیکن 'Freezer' جس کے معنی 'برف جمانے والی مشین' ہوا، اس کے لیے 'برفندہ' کی اصطلاح استعمال کی جائے)۔

اسی طرح Propaganda اور Publicity دونوں کے لیے ایک ہی اصطلاح 'تشہیر' کافی ہے۔ (لیکن Advertisement کے لیے معروف اصطلاح 'اشتہار' کو رائج رکھا جائے)۔ لیکن اگر ان میں لطیف فرق ہو تو ان کے لیے ضرور الگ الگ اصطلاحات وضع کی جائیں۔ جیسے: Term (طے شدہ مدت)، Period (غیر طے شدہ مدت)۔ ان کے لیے بالترتیب 'میعاد' اور 'مدت' کی اصطلاح ہونی چاہیے۔

اصول نمبر (10): انگریزی میں کچھ اصطلاحات ایسی ہیں جو کئی معنوں میں استعمال کی جاتی ہیں:

مثلاً: ☆ Charge (1) محصول، (2) ذمہ [ذمہ داری]۔ ☆ Issue (1) ارسال، (2) موضوع، (3) اجراء، (4) اولاد۔ ☆ Table (1) جدول، (2) میز۔ ☆ Statement (10 بیان، (2) گوشوارہ۔ ☆ Head (1) صدر/ سربراہ، (2) مد، (3) سر۔ اسی طرح اردو میں بھی اگر ایک اصطلاح کئی معنوں میں مستعمل ہے یا ہوسکتی ہے تو اس کو روا رکھا جائے۔

مثلاً: ☆ اشاعت (1) Edition، (2) Publicatoin۔ ☆ انتخاب/ انتخابات (1) Election (2) Selection۔ ☆ مجلس: (1) Assembly (2) Committee۔ ☆ جرم: (1) Crime (2) Offence وغیرہ۔

یوں تو اصطلاحات سازی کے اور بھی بہت سارے اصول ہیں اور ہو سکتے ہیں، لیکن ایک مختصر سے مقالے میں ان کا مفصل اور مبسوط بیان ممکن نہیں۔ میرا مقصد صاحبِ علم و نظر کی اس طرف توجہ مبذول کرانا ہے۔ یہ فرد واحد کے بس کا کام نہیں ہے، بلکہ اہلِ علم کی ایک وقیع جماعت ہی اس کام کو انجام دے سکتی ہے۔

■

Dr. Aslam Jawedan, 'Darul Gheyas', Urdu Gali (Jammun Gali), Sabzi Bagh, Patna - 800004 (Bihar), Mob.: 9334050215

ریاض احمد

آموزش بذریعہ امداد باہمی
اردو تدریس کے حوالے سے

بچہ جب چند سال کا ہوتا ہے تو وہ خود اپنی تفریح کا سامان بنانا چاہتا ہے۔ اپنے لیے طرح طرح کے کھیل کا طریقہ وضع کرتا ہے مختلف طرح کے گیم پلان کرتا ہے۔ ان کھیلوں میں کھلاڑیوں کی تعداد اور ان کی جگہ اپنی خواہش کے مطابق طے کرتا ہے۔ شرکا کی تعداد میں کمی بیشی، آؤٹ ہونے، پوائنٹ گننے، دائرہ کار طے کرنے غرض کہ وہ اپنے فریڈم کا مالک خود ہوتا ہے خواہ وہ کھیل دوڑ بھاگ کا ہو، تتلیاں پکڑنے کا ہو، شکار کرنا ہو یا پھر روایتی کھیل کبڈی، فٹبال، کرکٹ، کھوکھو وغیرہ۔ مگر ان ساری سرگرمیوں اور مشغلوں سے وہ پورا لطف تب اٹھاتا ہے جب اس کے ساتھ اس کے من پسند ساتھی ہوتے ہیں جن کا انتخاب وہ بغیر کسی دباؤ، بھید بھاؤ، بڑے چھوٹے، امیر غریب اور رنگ و نسل کی تمیز کے کرتا ہے۔ وہ اس عمر میں اپنی ضد اور ملکیت کا خود مالک رہنا چاہتا ہے بغیر کسی رشتہ اور دباؤ کے۔ مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے اسے اپنے خاندان اور سماج کے طے کردہ قوانین و اقدار (Values) کی پاسداری کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ گویا بہت بچپن میں جو آزادی اسے حاصل رہتی ہے، عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بتدریج کم ہوتی جاتی ہے اور ہماری عمر میں آتے آتے وہ مختلف قسم کی پابندیوں میں جکڑ جاتا ہے۔ حالانکہ ایک بچے کا ذہن تو اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا لیکن بڑے اس کو پابند کرنے کی تگ و دو ضرور کرتے ہیں۔ اس کام میں والدین اور اساتذہ پیش پیش ہوتے ہیں۔ انھیں بچے کے بہتر مستقبل کی فکر ہوتی ہے اور بچے کو اپنی آزادی اور بچپنا چھن جانے کا دکھ۔

تعلیمی اداروں میں مختلف نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعے ہم بچے کی ہمہ جہت ترقی کا انتظام کرتے ہیں اور اس کی مثبت نشوونما کے حصول کے لیے بہت سے تدریسی و تربیتی اصول بنائے گئے ہیں۔ لیکن وہی اصول زیادہ کارآمد ثابت ہوتے ہیں جن کے ذریعے بچوں کی فطری صلاحیتوں کا فروغ ان کی آزادی اور فریڈم کو نقصان پہنچائے بغیر ہو سکے کیونکہ اسی عمر میں بچے کی جسمانی و ذہنی نشوونما بہت تیزی سے ہوتی ہے اور اس کا Socialization بھی۔ اس مسئلے پر مدلل اظہار خیال قومی درسیات کا خاکہ 2005 کے دوسرے باب 'آموزش اور علم' میں کیا گیا ہے:

"بچپن سے نوجوانی تک کا عرصہ تیز رفتار نشوونما اور تبدیلی کا ہوتا ہے۔ درسیات کو آموزش اور نشوونما کے بارے میں ایسا کلی طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے جو درمیانی رابطوں کا لحاظ رکھ سکے اور جسمانی اور ذہنی نشوونما کے درمیان اور دوسروں کے ساتھ تعامل کے درمیان کی جانے والی تفریق سے اوپر اٹھ کر کام کر سکے"۔

(قومی درسیات کا خاکہ 2005، باب دوم، صفحہ نمبر 16)

عام طور سے ہم یادداشت کی صلاحیت کو آموزش سے تعبیر کرتے ہیں۔ درحقیقت آموزش کا یہ تصور جہاں ایک طرف بہت ہی قدیم ہے وہیں ناقص بھی۔ آموزش و اکتساب تو بچے کے رویے میں مثبت تبدیلی ہے جو اس کی شخصیت کے تینوں میدانوں Domains میں محسوس کی جائے۔ انسانی فطرت میں دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ یہ عناصر بھی شامل ہیں کہ وہ اپنی کارکردگی سے دوسروں کو متاثر کرنا چاہتا ہے اور دوسروں کی کارکردگی کے ذریعے ہونے والی تبدیلی سے متاثر بھی ہوتا ہے یہ تاثر کبھی انفرادی ہوتا ہے اور کبھی اجتماعی۔ اجتماعی طور پر اثر انداز ہونا اور اثر ڈالنا، انفرادی عمل سے بہتر اور دیرپا ہوتا ہے۔ آموزش کا یہ طریقہ تقریباً ہر عمر کے طلبا کے لیے مفید و کارآمد ہے۔ بچہ انفرادی طور پر اپنے دل و دماغ سے جو چیز تخلیق کرتا ہے اس کا اثر دوسرے لوگوں پر دیکھنا چاہتا ہے اور ان سے تعامل، تبادلہ خیال اور بحث و مباحثہ کرکے اس کی تصدیق و تائید چاہتا ہے جو باہم اشتراک و تعاون سے ہی ممکن ہے۔ بعض طلبا اپنی نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں میں اپنے ساتھیوں کی مدد لینا چاہتے ہیں اور بعض مدد کرنا چاہتے ہیں۔ کئی بار کتابی اصول و ضوابط اس کام میں زیادہ معاون ثابت نہیں ہوتے بلکہ مشترکہ تجربے اور نتیجے زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ باہمی اشتراک اور تعاون سے طلبا جب متعدد ہم خیال گروپوں میں تقسیم ہو کر کسی تعلیمی و تجربی مسئلے پر غور و خوض کرتے ہیں اور اتفاق

سامنے سے کسی بہتر نتیجے پر پہنچتے ہیں تو اس سے ہونے والی آموزش دیرپا اور پراثر ہوتی ہے۔ خواہ وہ ریاضی، سائنس اور سماجی علوم کے اکتسابی اعمال ہوں یا پھر زبان و لسان سے متعلق مسئلے۔ باہم اشتراک، بحث و مباحثے اور تعامل سے ہونے والی آموزش کو 'آموزش بذریعہ امداد باہمی' یا Co-operative Learning سے موسوم کیا جاتا ہے۔

گذشتہ صدی کی آخری دہائی سے اب تک اس طریقہ تدریس کو کم و بیش مغرب و مشرق کے بہت سارے اسکولوں نے کئی مضامین کی تدریس کے لیے اپنایا ہے اور اس کی افادیت کی بنا پر اس کا دائرہ کار مسلسل بڑھ رہا ہے۔ یہ خیال کر لینا بہت حد تک درست نہیں ہے کہ یہ طریقہ تدریس مغرب کی دین ہے کیونکہ مشرقی ممالک بالخصوص برصغیر میں گرو کل اور مدارس کے تعلیمی نظام میں اس طریقہ تدریس کے استعمال کی روایت موجود ہے۔ ممکن ہے آموزش بذریعہ امداد باہمی کا طریقہ ہمارے انہیں قدیم طرز تعلیم کی نکھری ہوئی شکل ہو۔ گو کہ آج کل کے انٹرنیشنل اور ماڈرن اسکولوں میں اس طریقہ تدریس کا ڈھول بہت پیٹا جا رہا ہے۔ مگر ہماری تعلیمی و تہذیبی تاریخ بتاتی ہے کہ مدارس اور گرو کل نے سب سے پہلے اس طریقہ تدریس کو اپنایا۔ اس طریقے کے ذریعے نہ صرف کتابی علم کی آموزش ہوتی تھی بلکہ طلبا کو بہتر طریقے سے جینے کا ہنر بھی سکھایا جاتا تھا۔

آموزش بذریعہ امداد باہمی کے لیے شرط یہ ہے کہ گروپ میں کام کرنے والے سبھی طلبا ایک دوسرے سے ذہنی ہم آہنگی اور تعاون و اشتراک کے لیے تیار ہوں۔ گویا اس طریقہ تدریس کی پہلی شرط طلبا میں تعاون اور اشتراک کا جذبہ پیدا کرنا ہے تاکہ مقررہ ہدف کو حاصل کرنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ دوسری شرط ان کے تعامل سے گروپ کے لیے طے کردہ متعین ہدف کا حاصل ہونا ہے۔ تیسری شرط باہمی اشتراک کے عمل اور تعاون کے جذبے کا اس وقت تک جاری رہنا ہے، جب تک موجودہ گروپ کے لیے طے شدہ علوم کی آموزش کا نشانہ حاصل نہ کر لیا جائے۔ اس طریقہ تدریس میں اس بات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کہ طلبا کو ذرہ دیتی ایک ساتھ بٹھا دینا آموزش بذریعہ امداد باہمی نہیں ہے بلکہ ان کا ذہنی طور پر ہم آہنگ ہونا۔ اس طریقہ تدریس کے کامیابی کی دلیل ہے۔

اہمیت:

آموزش بذریعہ امداد باہمی کسی بھی روایتی طریقہ تدریس کے مقابلے میں ذہنی اور داخلی ترغیب و تحریک کا تقاضا کرتی ہے۔ اس طریقہ تدریس سے تنقیدی و استدلالی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی مہارت پیدا ہوتی ہے۔ تمام طلبا کو بغیر کسی رکاوٹ، انفرادی و اجتماعی طور پر باہمی تعاون کے جذبے کے ساتھ اکتساب

کا موقع ملتا ہے۔ امداد باہمی سبھی طلبا کو فطری طور پر آموزش کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس طریقہ تدریس میں شرکا کو مجموعی و مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے اشتراک و تعاون کے ماحول میں یکسوئی و دلجمعی سے کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ طلبا کو یہ طریقہ تدریس ایک دوسرے سے مل کر کام کرنے کے لیے ورکار مثبت رویے کو فروغ دیتا ہے۔ یہ طریقہ تدریس مجموعی طور پر طلبا میں اساتذہ، مضامین، عنوانات، مسائل و تجربات

امداد باہمی سبھی طلبا کو فطری طور پر آموزش کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس طریقہ تدریس میں شرکا کو مجموعی و مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے اشتراک و تعاون کے ماحول میں یکسوئی و دلجمعی سے کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ طلبا کو یہ طریقہ تدریس ایک دوسرے سے مل کر کام کرنے کے لیے درکار مثبت رویے کو فروغ دیتا ہے۔

اور اسکول کے تئیں مثبت رویہ پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے چنانچہ طلبا کے مثبت رویے کے فروغ کے لیے مختلف مشغلوں پر مبنی سرگرمیاں اس طرح ترتیب دینی چاہیے کہ ان کے اندر کی چھپی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آجائیں قومی درسیات کا خاکہ 2005 اس کی صراحت ان لفظوں میں کرتا ہے:

"سرگرمی ہی بچے کی تمام تر کوششوں کی اصل ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے آس پاس کی دنیا کی معنویت پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا ہر وسیلے کا استعمال اس طرح کرنا چاہیے کہ بچے اظہار ذات کرنے میں، چیزوں کا استعمال کرنے میں اور اپنے قدرتی اور معاشرتی ماحول کی چھان بین کرنے میں صحت مند طور پر نشو و نما پانے کے قابل ہو سکیں۔"

آموزش بذریعہ امداد باہمی کے طریقہ تدریس کو مفید بنانے کے لیے مذکورہ پہلوؤں کی عمل آوری کے ساتھ اساتذہ کو پانچ اہم نکات پر توجہ مبذول کرنی چاہیے:

1. گروپ کی تشکیل
2. مضامین/مقاصد کا تعین
3. توضیحی ہدایات کی فراہمی
4. مواقع کی فراہمی اور مثبت سمت میں آگے بڑھنے کو یقینی بنانا
5. آموزشی مقاصد کو تمام طلبا کے لیے قابل حصول بنانا

1. گروپ کی تشکیل:

اس طریقہ تدریس کے ذریعے مقاصد کے حصول کے لیے اساتذہ کا پہلا کام کمرہ جماعت میں موجود طلبا کو مختلف گروپوں میں اس طرح تقسیم کرنا ہوتا ہے کہ ہر گروپ میں علمی، لسانی، سماجی اور معاشی اعتبار سے الگ الگ استعداد و معیار کے حامل طلبا ہوں۔ طلبا نہ تو ایک دوسرے کے جگری دوست ہوں اور نہ حریف۔

2. مضامین/مقاصد کا تعین:

اساتذہ کو امداد باہمی کے طریقہ تدریس کا انتخاب کرنے کے بعد ان امور کی واضح نشاندہی کرنی چاہیے جو کمرہ جماعت میں طلبا کے مختلف گروپوں کو تفویض کیے جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان مقاصد کا تعین بھی کر لینا استاد

کے لیے ضروری ہوتا ہے جن کے حصول کے بعد طلبا کے رویے میں مثبت تبدیلی ہوگی۔

3. توضیحی ہدایات فراہم کرنا:

ترتیب دیے گئے گروپوں کو ان کے اکتسابی ہدف کے حصول کے لیے اساتذہ کو چاہیے کہ ان ہدایات کی وضاحت کردیں۔ مثلاً ہر ایک گروپ کو ان کا الگ الگ کام سپرد کرنا، اکتسابی حصول کے لیے اجتماعی وانفرادی ذمے داری دینا، ہدف کے حصول کے لیے درکار معلومات وساز وسامان مہیا کرنا اور ممکنہ سہل طریقوں کی طرف اشارہ کرنا، ہدف کے حصول کے پس منظر میں آپسی تعاون اور انفرادی ذمے داریوں کی افادیت سے طلبا کو آگاہ کرنا۔

4. مواقع کی فراہمی اور مثبت سمت میں آگے بڑھنے کو یقینی بنانا:

مطلوبہ ہدف کے لیے مختلف گروپ کو مختص کیے گئے کام کی ذیلی ذمے داریاں گروپ کے سبھی ممبران کے سپرد کرنا مثلاً تدریس انشا میں مضمون نگاری کے عنوان سے اگر کسی گروپ کے لیے کھیل کا عنوان تجویز کیا جائے تو گروپ کے طلبا میں سے کسی کو معلومات جمع کرنے، کسی کو اس کی تصاویر اکٹھا کرنے اور کسی کو اس کھیل کے تئیں عوامی دلچسپی معلوم کرنے کی ذمے داری دی جائے اور یہ سب معلومات وتصاویر حاصل کرنے کے بعد پوری ٹیم تبادلہ خیال اور بحث ومباحثے کے بعد کسی بہتر نتیجے پر پہنچے۔ اساتذہ کو دوران تفاعل سبھی طلبا پر نظر رکھنا چاہیے اور اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ سب کو برابر مواقع ملیں اور شروع سے آخر تک مل کر کام کرنے کا جذبہ قائم رہے۔ دوران کار استاد کو طلبا پر اعتماد، بہتر انتظام، تضاد کا تصفیہ، تعمیری تنقید اور حوصلہ افزائی کرتے رہنا چاہیے اگر کام کرنے کے دوران مہارتوں اور جذبوں کی کمی محسوس ہو تو اساتذہ طلبا کی حوصلہ افزائی بھی کریں اور اس پر بھی نظر رکھیں کہ کوئی بھی طالب علم احساس برتری اور احساس کمتری کا شکار نہ ہو بلکہ سب کو یکساں موقع اور وقت ملے۔

5. آموزشی مقاصد کو تمام طلبا کے لیے قابل حصول بنانا:

کسی بھی تدریسی طریقے کا اصل مقصد طلبا کا حصول علم ہے آموزش بذریعہ امداد باہمی میں گروپ میں کام کرتے وقت اس بات کا بطور خاص خیال رکھا جائے کہ صرف ذہین طلبا بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لیں بلکہ سبھی طلبا کا آپسی اشتراک آموزش کو یقینی بنانے میں شامل ہو۔ سبھی کو تفاعل کے دوران اپنے شک وشبہات کو دور کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے اور اس دوران گروپ کے تمام طلبا ایک دوسرے کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے آمادہ رہیں۔ اس طرح ہر گروپ کا تفویض کردہ کام ایک

اساتذہ کو دوران تفاعل سبھی طلبا پر نظر رکھنا چاہیے اور اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ سب کو برابر مواقع ملیں اور شروع سے آخر تک مل کر کام کرنے کا جذبہ قائم رہے۔ دوران کار استاد کو طلبا پر اعتماد، بہتر انتظام، تضاد کا تصفیہ، تعمیری تنقیداور حوصلہ افزائی کرتے رہنا چاہیے اگر کام کرنے کے دوران مہارتوں اور جذبوں کی کمی محسوس ہوتو اساتذہ طلبا کی حوصلہ افزائی بھی کریں اور اس پر بھی نظر رکھیں کہ کوئی بھی طالب علم احساس برتری اور احساس کمتری کا شکار نہ ہو بلکہ سب کو یکساں موقع اور وقت ملے۔

دوسرے کے آپسی تعاون اور اشتراک سے پورا ہو اور ہر طالب علم کی آموزش یقینی ہو جائے رپورٹ کی تیاری اور اس کا کمرہ جماعت میں پیش کیا جانا بھی آموزش بذریعہ امداد باہمی کا ایک اہم حصہ ہے۔

یوں تو درس وتدریس میں متعدد طریقے رائج ہیں۔ کچھ کا موزوں استعمال اسکولی تعلیم کے اولین درجات میں ہوتا ہے تو کچھ کا بہتر استعمال ثانوی درجات میں کیا جاتا ہے حالانکہ کچھ ایسے طریقہ ہائے تدریس بھی ہیں جن کا استعمال خصوصی طور سے اعلیٰ تعلیم میں ہوتا ہے مختلف تدریسی طریقوں کے استعمال کی درجات ومعیار کے لحاظ سے الگ الگ افادیت تو ہے ہی، مضامین کے لحاظ سے بھی طریقہ تدریس کا موزوں انتخاب آموزش واکتساب کو سہل ودیرپا بنانے میں معاون ہوتا ہے۔ چنانچہ درجات ومعیار کے لحاظ سے زبان کی تدریس بالخصوص اردو زبان و ادب کی تدریس میں کچھ طریقے کم موثر ہوتے ہیں تو کچھ طریقے اپنا دیرپا اثر ڈالتے ہیں۔ آموزش بذریعہ امداد باہمی اردو زبان وادب کی تقریباً سبھی سطحوں کے طلبا کے لیے دیرپا اور پر اثر طریقہ تدریس ہے۔

تخلیقی صلاحیت ابھرنے کے بعد ہی عام طور سے کوئی بھی بولی زبان کی شکل اختیار کرتی ہے گویا کسی زبان کی پہچان اس کی ادبی تخلیق سے کی جاتی ہے عام طور سے ہم سمجھتے ہیں کہ بچوں میں تخلیقی صلاحیت نہیں ہوتی، یہ تو بڑوں کا کام ہے۔ لیکن تقریباً سبھی بچوں میں ابتدائی درجات سے ہی تخلیقی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے اس کا انحصار اساتذہ پر ہے کہ وہ کس حد تک اور تدریس کے کن طریقوں کو اپنا کر بچوں کے تخیل کو جلا بخشتے ہیں۔ نیشنل کیری کولم فریم ورک فار اسکول ایجوکیشن (NCFSE) 2005 اور اس کا نیشنل فوکس گروپ کا پوزیشن پیپر برائے ہندوستانی زبانوں کی تدریس 2010 اپنے دستاویز میں اس کی صراحت کرتا ہے۔ چنانچہ آموزش بذریعہ امداد باہمی کے طریقے سے اردو زبان کی تدریس میں طلبا کی مختلف سطحوں اور درجات کے لیے تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مختلف طریقے کے ٹیچنگ آئیٹمس اور تفویض کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

تخلیقی تحریر:

آموزش بذریعہ امداد باہمی میں ابتدائی درجات کے مختلف گروپوں کو زبان کی تحریری استعداد بڑھانے اور تخلیقی ذہن سازی کرنے کے لیے تصویری کہانیاں بغیر کسی تحریری علامت یا تحریر کے دی جائیں اور گروپ کے بچوں سے یہ کہا جائے کہ تصاویر دیکھ کر واقعات کو اپنے

لفظوں میں کہانی کی صورت میں بیان کریں۔ یہ کام یکے بعد دیگرے کئی گروپوں کو تفویض کیا جائے اور کہانی لکھنے کے بعد اسے طلبا کے گروپ کے سامنے بہ آواز بلند بالترتیب پڑھا جائے۔ طلبا کو اس کی خامیاں معلوم کرنے اور کہانی کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑنے کے لیے رہنمائی کی جائے اس پورے کام میں استاد اپنی تخیلی تخلیقی مہارتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے طلبا کی مشاورت کریں۔ اسی طرح لکھی ہوئی کہانی کے مختلف حصوں کے ذریعے طلبا کی تخیلی قوت کو بڑھانے کی غرض سے اس کہانی کے مختلف اجزا پر مبنی تصاویر بنانے کو کہا جائے اور اساتذہ طلبا کے گروپوں کی رہنمائی کریں۔

ابتدائی جماعتوں کی کامیابی کے بعد ثانوی جماعتوں مثلاً نویں، دسویں جماعت کو تخلیقی اور تخیلی نظمیں اور چھوٹے چھوٹے واقعاتی مضامین کے لیے مختلف طرح کے عنوان تفویض کیا جانا چاہیے۔ مثلاً ماحول کا تحفظ، تعلیم کے فوائد، بڑوں کی عزت، استاذ کی رہنمائی وغیرہ اس سطح کے طلبا کے لیے دوسرے زمرے میں زبان کی پختگی اور بہتر استعداد کی غرض سے مختلف گروپوں کو مختلف طرح کے لسانی فروغ سے متعلق کام دیا جانا چاہیے مثلاً مختلف حروف سے شروع ہونے والے اشعار، محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتیں، شعرا کے نام، ان کے تخلص، مختلف شعرا کی نظمیں یا پھر ذخیرہ الفاظ کو بڑھانے کے لیے لسانی معمے۔

ابتدائی جماعتوں کی کامیابی کے بعد ثانوی جماعتوں مثلاً نویں، دسویں جماعت کو تخلیقی اور تخیلی نظمیں اور چھوٹے چھوٹے واقعاتی مضامین کے لیے مختلف طرح کے عنوان تفویض کیا جانا چاہیے۔ مثلاً ماحول کا تحفظ، تعلیم کے فوائد، بڑوں کی عزت، استاذ کی رہنمائی وغیرہ اس سطح کے طلبا کے لیے دوسرے زمرے میں زبان کی پختگی اور بہتر استعداد کی غرض سے مختلف گروپوں کو مختلف طرح کے لسانی فروغ سے متعلق کام دیا جانا چاہیے۔

ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعہ ادبی استعداد میں پختگی:

اعلیٰ ثانوی سطح پر اردو زبان کی بہتر آموزش کے لیے طلبا کے مختلف گروپوں کو نصابی اسباق کے علاوہ ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعے ان میں ادبی و لسانی استعداد کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اس سطح پر وال میگزین کی ادارت، مختصر کہانیوں اور Collection، ادبی معمے حل کرنا، سرسری مطالعے کے لیے ادبیات، مختلف موضوعات پر مختصر نظمیں لکھنا، شعرا و ادبا کا سوانحی خاکہ تیار کرنا، مرکب الفاظ کی تشکیل کرنا اور معنی دریافت کرنا اور محاورے و ضرب الامثال کا پس منظر بیان کرنا آموزش بذریعہ امداد باہمی کے توسط سے ثانوی سطح کے علاوہ اس سے پہلے کسی سطح یعنی ابتدائی سطح اور اس کے بعد اعلیٰ ثانوی سطح کے لیے بھی لسانی استعداد کی تقویت کے لیے مختلف طرح کی ہم نصابی سرگرمیوں کا انعقاد کیا جا سکتا ہے۔

طرز نگارش کا فروغ:

ہمارے ملک میں اعلیٰ ثانوی سطح سے طلبا کو اپنی پسند کے مضامین کا انتخاب کرنے اور تعلیمی اداروں میں اس کا انتظام کرنے کی سہولت ہے یعنی آرٹس، سائنس، کامرس وغیرہ جو طلبا اردو زبان و ادب کا انتخاب لازمی (Compulsary) اور اختیاری (Optional) مضامین کے طور پر کرتے ہوں، ان کے لیے بھی آموزش بذریعہ امداد باہمی کے طریقۂ تدریس کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اس سطح پر اس طریقے سے طرز نگارش کی تعلیم بہتر طور پر دی جا سکتی ہے۔ طرز نگارش کا مثبت اثر طلبا کے آئندہ علمی و ادبی نشوونما میں مفید ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طریقہ تدریس کے تحت مختلف عنوانات طلبا کے گروپ کو تفویض کیے جائیں۔ عنوانات دینے کے بعد اساتذہ کو چاہیے کہ وہ عنوان اور طریقہ کار سے متعلق نکات و اشارے دیں۔ مثلاً عنوانات کے تحت مشہور واقعات صلح حدیبیہ، ہجرت، فرانس کا انقلاب، روس کا انقلاب پہلی اور دوسری عالمی جنگ، ہندپاک کی تقسیم وغیرہ معروف شخصیات مثلاً، نیوٹن، ٹیپو سلطان، تیمور لنگ، مذہبی و سماجی مصلح حضرت محمدؐ، عیسیٰ مسیح، ابراہیم لنکن، مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، سرسید احمد خاں وغیرہ۔ سائنسی ایجادات، ٹیلیفون کی ایجاد، کمپیوٹر کی ایجاد، کاغذ کی ایجاد، چھاپہ خانے کی ایجاد وغیرہ ان موضوعات کے علاوہ مختصر ادبی اشاریہ تیار کرنا، نثری اصناف اور شعری اصناف کے مختلف شعرا و ادبا کی تاریخی فہرست ان کی شاہکار نگارشات کے ساتھ تیار کرنا۔ جدید طریقے سے محاوروں کا اشاریہ تیار کرنا اور مختصر موضوعی لغات تیار کرنا بھی شامل ہے۔

زیر تربیت اساتذہ کی سرگرمیاں:

ان درجات کے علاوہ زیر تربیت اساتذہ مثلاً D. Ed. اور B. Ed. کے طلبا کی تدریس میں بھی آموزش بذریعہ امداد باہمی کا طریقہ اپنایا جا سکتا ہے D. Ed. کے لیے مختلف موضوعات کے لحاظ سے گروپوں کی تشکیل کی جائے اور ان کو سوالنامہ، سوالات کی قسمیں، سوالات کی درجہ بندی، سوالات میں مختلف مہارتوں کا استعمال، سوالات کی نوعیت مثلاً معلومات، تفہیم، تجزیہ، تشریح و توضیح اور انداز قدر وغیرہ جیسے موضوعات تفویض کیے جائیں۔

اسی طرح B. Ed. کے طلبا کے لیے درسی مواد کی جانچ، درسی کتاب، مختلف نصابات، ظاہری و باطنی خوبیاں ایک ہی عمر یا درجے کے لیے مرتب کی گئی مختلف ریاستوں کی درسی کتابوں کا تجزیہ، ان کے مشقی اسباق کی جانچ اور ان سے طلبا کی آموزش پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ آموزش بذریعہ امداد باہمی کے طریقے سے لیا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ آموزش بذریعہ امداد باہمی بیک وقت اساتذہ، طلبا اور Teacher Educators سبھی کے لیے کئی معنوں میں درس و تدریس کا موثر طریقہ ہے اگر اس کے طریقہ کار اور منہاج و مقاصد کو سامنے رکھ کر اسباق اور طلبا کے گروپ کا انتخاب کیا جائے اس کی افادیت کو سامنے رکھا جائے، تعین قدر، مقاصد، ہدایات اور رہنمائی اس آموزشی طریقے کی جان ہیں چنانچہ نکات پر توجہ دے کر ہر درجے کے مضامین کی تدریس کی جا سکتی ہے اور طلبا میں آموزش کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

حوالے:

1. محمد اختر صدیقی، تدریسی و آموزشی حکمت عملیاں، شعبۂ تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 2004
2. ڈاکٹر ریاض احمد، اردو تدریس جدید طریقے اور تقاضے، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، 2013
3. قومی درسیات کا خاکہ 2005، نیشنل فوکس گروپ کا پوزیشن پیپر برائے ہندوستانی زبانوں کی تدریس، NCERT، نئی دہلی، 2010
4. ڈاکٹر ریاض احمد، تعلیم و تدریس کے روشن پہلو، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، 2011
5. Jett Stenlev, Cooperative Learinig in foreign language teaching: Day and Evening College of Teacher Training, Copenhagen, 2003

■

Dr.Reyaz Ahmad Assistant Professor, (School of Education & Training)
Maulana Azad National Urdu University,
Tarin Campus Behjoi Road Sambhal-244302
Email:reyazahmed045@gmail.com

عارفہ بشریٰ

ریاستِ جموں و کشمیر میں اردو صحافت

صحافت یا اخبار نویسی ایک قدیم فن اور پیشہ ہے۔ چھاپہ خانے کی ایجاد سے پہلے مختلف ممالک میں خبر رسانی کا کام سرکاری جاسوسوں اور کارندوں کے ذمے ہوا کرتا تھا، یا لوگ زبانی خبروں کو ایک دوسرے تک منتقل کرتے تھے۔ پریس کی ایجاد نے صحافت میں ایک زبردست انقلاب کی ابتدا کی اور اخبار نویسی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اخبار نویسی نے بہت جلد ثقافت کے اہم شعبے کا درجہ حاصل کیا۔ اخبار کے ذریعے آئے دن کے حالات و واقعات کی خبریں شائع ہونے لگیں۔ اس کے علاوہ اخبار کے مدیر یا ادارے کی طرف سے مختلف خبروں پر تبصرے شائع ہونے لگے۔ موجودہ صدی میں اخبار نویسی کو بے پناہ مقبولیت ملی۔ رائے عامہ کو بنانے اور بگاڑنے، حکومتوں کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرنے، سماجی اور دینی معاملات کی تعمیر میں صحافت کے رول کو تسلیم کیا گیا۔ اب دنیا کے کسی کونے یا کسی پس ماندہ ملک سے نکلنے والے اخبار کی بھی ایک بین الاقوامی اہمیت تسلیم کی جانے لگی ہے کیونکہ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے دنیا بھر کے واقعات کی خبریں اخبار نویسوں تک پہنچتی ہیں اور وہ ان کو اپنے اخبار کے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کے بعد اب ای میل نے خبروں کی بھر پور ترسیل کو ممکن بنا دیا ہے۔

کشمیر میں اردو صحافت کی تاریخ اردو زبان کی سرکاری سطح پر مروج ہونے سے پہلے سے منسلک ہے۔ کشمیر میں لوگ کشمیری زبان بولتے ہیں اور جموں میں لوگ ڈوگری زبان بولتے ہیں۔ ریاست میں اور بھی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لداخ میں لداخی زبان مروج ہے۔ ریاست کے تینوں خطوں اور ریاست کے مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں بولنے والوں کے لیے اردو رابطے اور ترسیل کی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے انیسویں صدی کے آخری حصے میں ریاست میں اردو کی مقبولیت کے پیش نظر ڈوگرہ حکمرانوں نے اردو کو عدالتی زبان کا درجہ دیا تو ریاست میں اردو کی مقبولیت کا راستہ ہموار ہو گیا۔ 1879 میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ اس سے پہلے ملک کے مختلف حصوں سے اردو بولنے والے اور اردو میں شاعری کرنے والے شعرا ریاست میں آتے تھے۔ خود ریاست کے پڑھے لکھے لوگ ملک کے مختلف حصوں میں جاتے اور باہمی تہذیبی اور لسانی روابط قائم ہوتے تھے۔ یہاں کے پڑھے لکھے لوگ اردو بولتے تھے اور جہاں تک ان پڑھ لوگوں کا تعلق ہے، ان میں وہ لوگ مثلاً ہانجی وغیرہ جن کا رابطہ سیاحوں سے رہتا تھا، وہ بھی ٹوٹی پھوٹی اردو سے کام چلاتے تھے۔ سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اردو کے رائج ہونے کے بعد اردو زبان تیزی سے پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول ہونے لگی۔ اس زمانے میں کئی لوگوں نے ریاست میں اردو اخبار نکالنے کی کوششیں کیں، لیکن حکومت کی سخت گیر پالیسی کی وجہ سے وہ کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں۔

1858 میں ریاست میں پریس کا آغاز ہوا۔ یہ احمدی پریس کہلاتا تھا۔ اس کے بعد سرکار نے 'وکرم ولاس' پریس قائم کیا لیکن کسی اردو اخبار کی اشاعت کی اجازت نہ دی گئی۔ تاہم خود مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت میں 'بدیا بلاس' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا گیا۔ یہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں چھپتا تھا اور تاریخی لحاظ سے یہ ریاست کا پہلا اخبار ہے۔ اسی دور میں ایک اور اخبار 'محقق کشمیر' کے نام سے جاری ہوا، لیکن یہ دونوں اخبارات زیادہ دنوں تک نہ چل سکے۔

اسی دور میں سالک رام سالک نے اردو اخبار نکالنے کی جدوجہد کی لیکن وہ اپنی جدوجہد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر میں وہ کشمیر سے ہجرت کر کے لاہور گئے اور وہاں سے 'خیر خواہ کشمیر' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ سالک رام کے بھائی پنڈت ہرگوپال کول خستہ نے اس اخبار کی سرپرستی کی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد حکومت میں بھی اخبار نویسی پر پابندی جاری رہی۔ اس دوران کشمیر کے مشہور مورخ اور ادیب محمد دین فوق نے ریاست سے اردو اخبار نکالنے کی تگ و دو کی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو انھوں نے کئی عرض داشتیں دیں۔ لیکن حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر میں وہ بھی دوسرے صحافیوں کی طرح لاہور میں صحافتی سرگرمیوں کو جاری رکھنے پر مجبور ہوئے۔

بہر حال، اردو صحافت کے ابتدائی دور میں متعدد

ذیل اخبارات ریاست سے شائع ہوتے رہے۔

1. بدیا بلاس 1842
2. دھرم درپن 1873
3. ڈوگرہ گزٹ 1911

ان کے علاوہ تحفۂ کشمیر 1876 اور جموں گزٹ 1884 میں شائع ہوئے۔ تحفۂ کشمیر سری نگر سے شائع ہوتا رہا۔ لیکن یہ باقاعدہ اخبار نہ تھا، بلکہ اس میں گورنمنٹ کی کارکردگی کے بارے میں خبریں شائع ہوتی تھیں۔ جموں گزٹ بھی سری نگر سے نکلتا تھا۔ یہ بھی سرکاری گزٹ تھا۔

ریاست میں اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز 1944 میں ہوا۔ جب لالہ ملک راج صراف نے متواتر کوششوں کے بعد 'رنبیر' جاری کیا۔ ابتدا میں یہ ہفت روزہ تھا۔ اس اخبار کو حکومت نے بعض شرائط کے تحت منظر عام پر آنے کی اجازت دی۔ اسے ہدایت کی گئی کہ وہ سیاسی معاملات پر خاموش رہے گا اور صرف تعلیمی اور اقتصادی مسائل پر اظہار خیال کرے گا۔ ان پابندیوں کے باوجود اخبار نکلتا رہا اور عوام میں مقبولیت حاصل کرتا رہا۔ اس کے بعد جموں ہی سے ہفت روزہ 'پاسبان' نکلتا رہا، جسے معراج الدین احمد نکالتے تھے۔ یہ اخبار مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرتا تھا۔

بیسویں صدی کے ربع اوّل تک جن کشمیریوں نے وادی سے باہر رہ کر کشمیر کے بارے میں اخبارات شائع کیے اُن کی تفصیل درج ذیل ہیں:

1.	مراسلۂ کشمیر	1872
2.	اخبار عام	1881
3.	کشمیری پرکاش	1898
4.	پنجۂ فولاد	1911
5.	کشمیری گزٹ	1901
6.	کشمیر مخزن	1905
7.	گلشن کشمیر	1901
8.	کشمیر درپن	1898
9.	کشمیر میگزین	1906
10.	سفیر	1914
11.	صبح کشمیر	1914
12.	کشمیر	1924

یہ اخبارات ریاست کے باہر لاہور، امرتسر اور لکھنؤ سے شائع ہوتے تھے۔ زیادہ تر اخبار لاہور ہی سے چھپتے تھے۔ ان میں زیادہ تر کشمیریوں کی اقتصادی بدحالی، سیاسی بے چینی اور سماجی اونچ نیچ کے بارے میں خبریں اور تبصرے چھپتے تھے۔ چونکہ یہ اخبارات کشمیر سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ریاست میں اردو صحافت کے تاریخی ارتقا میں ان کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

'رنبیر' شائع ہونے کے بعد ریاست میں اخبار نویسی کی ضرورت کا احساس بڑھنے لگا۔ لیکن جاگیردارانہ نظام حکومت نے کسی اخبار کو نکالنے کی اجازت نہ دی۔ لالہ ملک رام صراف نے چونکہ ایک پریس بھی کھولا تھا، اس لیے وہ بچوں کے لیے ایک رسالہ 'رتن' بھی شائع کرتے تھے اور یہ رسالہ اردو صحافت کی مقبولیت میں اضافے کا باعث ہوا۔

1931 میں حکومت نے مڈلٹن کمیشن کی سفارش پر پریس ایکٹ میں تبدیلی کی۔ چنانچہ 1932 سے اخبارات

یہ اخبار صحافت کے تقاضوں کی تکمیل کرتا رہا اس نے کئی خاص نمبر نکالے۔ یہ اخبار پنڈت برادری کے مسائل کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی تہذیب، بھائی چارہ اور سماجی یگانگت کی آئینہ داری کرتا رہا اس اخبار سے پنڈت گنگا دھر دیہاتی بھی وابستہ ہوئے اور انہوں نے اس کے معیار کو مزید بلند کیا۔ یہ اخبارات مجموعی طور پرتعلیم کی ضرورت، لوگوں کی پسماندگی، جاگیرشاہی، عورتوں کی مظلومیت، جہیز کی لعنت، نوجوانوں کی بیکاری وغیرہ کے مسائل پر مضامین، تبصرے اور شذرات شائع کرتے رہے۔

کے اجرا سے پابندی ہٹا دی گئی اور تیزی سے اخبارات نکلنے لگے۔ یہاں تک کہ 1947 تک اخبارات کی تعداد 48 کو تجاوز کر گئی۔ سب سے پہلا اخبار پنڈت پریم ناتھ بزاز نے 1932 میں 'وتستا' کے نام سے جاری کیا۔ 'وتستا' سے پنڈت پریم ناتھ بزاز کی مدیرانہ صلاحیت کا اعتراف کیا جانے لگا۔ لوگ ذوق وشوق سے اس اخبار کو پڑھنے لگے۔ تین برسوں کے بعد پریم ناتھ بزاز نے شیخ محمد عبداللہ کی رفاقت میں 'ہمدرد' کے نام سے سری نگر سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا۔ اس کی روز افزوں مقبولیت کو دیکھ کر جولائی 1943 سے اسے روزنامہ بنایا گیا۔ 'ہمدرد' کے ادارۂ تحریر میں مولانا مسعودی بھی شامل ہوگئے۔ 'ہمدرد' خبروں کی تازگی، مضامین کی رنگارنگی اور گٹ اَپ سے ریاست میں اخبار نویسی کے اچھے معیار کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس اخبار میں ریاست کے نامور لکھنے والوں کی نظم ونثر کی نگارشات بھی چھپتی رہیں۔ قلمکاروں کے تعاون سے 'ہمدرد' نے ادبی ایڈیشن نکالے اور ریاستی ادب اور ثقافت کے فروغ کے امکانات روشن ہوگئے۔ ساتھ ہی نئے ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

''ادبی ایڈیشنوں سے دو فائدے ہوئے۔ اولاً یہ کہ کشمیر میں اردو کی ترویج واشاعت میں اضافہ ہوا اور دوئم یہ کہ یہاں بھی لوگوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا۔'' (جموں وکشمیر میں اردو صحافت، کشمیر کے مضامین، ص 193)

'ہمدرد' کا یہ کارنامہ ناقابل فراموش ہے کہ اس نے ریاست میں سیاسی بیداری میں اہم حصہ ادا کیا۔ اس میں شخصی حکومت کا پردہ چاک کیا گیا۔ اپریل 1941 میں پریم ناتھ بزاز نے قانون، اسلحہ جات اور ہندی رسم الخط کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرکے شیخ محمد عبداللہ کے خیالات سے اختلاف کیا، نتیجے میں شیخ محمد عبداللہ 'ہمدرد' سے الگ ہوگئے۔ 1943 میں 'ہمدرد' نئی آب وتاب کے ساتھ چھپنے لگا، لیکن یہ بہت جلد سیاسی اختلافات کی بھینٹ چڑھ گیا اور 1950 میں 'ہمدرد' بند ہوگیا۔

اسی زمانے میں کشمیری پنڈتوں کی جماعت 'یووک سبھا' نے اخبار 'مارتنڈ' جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر پنڈت کشپ بندھو تھے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ 'مارتنڈ' سے الگ ہوگئے اور انھوں نے 'کیسری' اور 'دیش' کی ادارت کی۔ 'مارتنڈ' کی ادارت کے فرائض پنڈت گاشہ لال کول اور پنڈت پریم ناتھ کنہ نے ادا کیے۔ یہ اخبار صحافت کے تقاضوں کی تکمیل کرتا رہا۔ اس نے کئی خاص نمبر نکالے۔ یہ اخبار پنڈت برادری کے مسائل کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی تہذیب، بھائی چارہ اور سماجی یگانگت کی آئینہ داری کرتا رہا۔ اس اخبار سے پنڈت گنگا دھر دیہاتی بھی وابستہ ہوئے اور انھوں نے اس کے معیار کو مزید بلند کیا۔ یہ اخبارات مجموعی طور پر تعلیم کی ضرورت، لوگوں کی پسماندگی، جاگیرشاہی، عورتوں کی مظلومیت، جہیز کی لعنت، نوجوانوں کی بیکاری وغیرہ کے مسائل پر مضامین، تبصرے اور شذرات شائع کرتے رہے، 1932 سے 1947 تک ریاست میں اردو صحافت کا ایک بارآور دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ ریاست کے مختلف حصوں مثلاً سری نگر، سوپور، جموں، میرپور سے اخبارات نکلتے رہے۔ ان اخبارات کی فائلوں پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اخباروں میں خاصی دلچسپی لینے لگے تھے۔ اخبار

نویس بھی اپنے فرائض تن دہی، فرض شناسی اور پیشہ ورانہ قابلیت سے انجام دیتے تھے، بعض اخبارات آزادانہ طور پر نکلتے تھے اور کئی اخبار بعض سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی ترجمانی کا کام کرتے تھے۔ چنانچہ جہاں گیر (1932) انجمن تبلیغ الاسلام، اصلاح (1935) ذوالفقار (1935)، روشنی (1943) مختلف مذہبی جماعتوں کے نظریات کے ترجمان تھے، سیاسی جماعتوں میں 'رہبر' (1933) مسلم کانفرنس، کشمیر گارڈین (1933) پنڈتوں، حقیقت (1936) مسلم کانفرنس خالد (1938)، نیشنل کانفرنس، خدمت (1939) نیشنل کانفرنس کے آرگن تھے۔ سری نگر ہی کی طرح جموں میں بھی کئی اخبارات شائع ہوئے۔ ان میں امر (1932)، شہدرام گپتا، آنند (1932) گردھاری لعل آنند، وطن (1934) سردار مہندر سنگھ، جمہورہ (1935) اللہ رکھا ساغر، چاند (1939) نرسنگھ داس نرگس، کشمیر سنسار، (1941) جتیندر دیو نکالتے تھے۔ میر پور سے راجہ محمد اکبر خان 'سچ' 1941 چودھری گیان چند، صداقت 1942 اور ہمت (1944) عبدالوہاب شائع کرتے رہے۔

حکومت جموں و کشمیر نے اخبارات کی مقبولیت کو دیکھ کر 1940 میں 'تعلیم جدید' کا ماہنامہ اجرا کیا۔ اس کے مدیر پیرزادہ غلام رسول تھے۔ اس رسالے میں ریاست کی تعلیمی پس ماندگی، اساتذہ کی تربیت، تعلیمی مقاصد وغیرہ کے موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے کے علاوہ بچوں کے رسالے 'رتن' کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے علاوہ ماہنامہ 'پریم' اور 'فردوس' کو بھی خاصی مقبولیت ملی۔ نرسنگھ داس نرگس نے اقبال تمنائی اور گلزار احمد فدا کے ساتھ مل کر 'پریم' کو جاری کیا اور قیس شروانی فردوس کی ادارت کرتے رہے۔ اس طرح سے ریاست میں ادبی صحافت کو فروغ ملنے لگا۔ ادبی صحافت کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ ریاست میں ادبی سرگرمیوں کو بڑھاوا ملا۔ کئی شعرا اور نثر نگار سامنے آئے۔

مجموعی حیثیت سے اردو صحافت کا یہ پہلا دور تھا۔ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ تسلی بخش نہیں تھا، جیسا کہ ڈاکٹر برج پریمی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے، درست ہے۔ جن حالات میں وادی میں اردو صحافت کی ابتدا ہوئی اور پھر مالی مشکلوں، ناخواندگی، پس ماندگی اور سیاسی محکومیت کے ہوتے ہوئے جس ہمت اور استقلال سے اخبار نویسوں نے اخبار نکالے اور پڑھنے والوں نے انھیں پسند کیا، اس کی بنا پر یہ صحافت کی اچھی شروعات قرار دی جاسکتی ہے۔ خاص کر اس حقیقت کے پیش نظر کہ حکومت ہر اخبار پر کڑی نظر رکھتی تھی اور اخبار کی طرف سے حق گوئی کی بنا پر عتاب کا شکار ہونا معمول کی بات تھی، البتہ یہ صحیح ہے کہ اس دور میں اخبار کی ترتیب وتہذیب، تذکرہ نگاری، خبروں کے انتخاب، سرخیوں کے جماؤ، ایڈیٹوریل، مزاحیہ و طنزیہ کالم، کالم نگاری، اشتہارات وغیرہ میں سلیقہ اور آگہی نظر نہیں آتی، جو آج کے دور صحافت کا خاصہ ہے۔

1947 کے بعد ریاست عوامی حکومت برسر اقتدار آگئی، چونکہ یہ دور اقتصادی بدحالی، سیاسی عدم استحکام، رسل ورسائل کے ذرائع کے فقدان، پاور سپلائی کی عدم فراہمی، نیوز پرنٹ کی قلت اور لیتھو کی مشکلوں کا دور تھا۔ اس لیے فوری طور پر اردو صحافت آگے نہ بڑھ سکی۔ ان دشواریوں کے باوجود کئی باصلاحیت لوگوں نے اخبار نویسی

> **'شیرازہ' نے ریاست میں اردو ادب کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اکادمی کی طرف سے ایک خبرنامہ اکادمی بھی گاھے گاھے شائع ہوتا رہا۔ 'شیرازہ' کے مدیر محمد احمد اندرابی ہیں۔ محکمہ اطلاعات کے زیراہتمام ماہنامہ 'تعمیر' بھی پوری آب و تاب کے ساتھ چھپتا رہا۔ 'تعمیر' نے کشمیری زبان اور ثقافت کی گراں قدر خدمت انجام دی ہیں۔ کئی سربرآوردہ شعرا مثلاً آزاد، مہجور سے متعلق خاص نمبر شائع کیے گئے۔ اس محکمے سے خبرنامہ 'مکتوب' بھی شائع ہوتا رہا۔**

کو اپنا پیشہ بنایا اور اخبارات جاری ہونے لگے۔ 1948 میں ہفت روزہ 'جیوتی' جاری ہوا۔ محمد عمر بٹ نے 1948 میں اخبار 'اپ لفٹ' نکالا، لیکن یہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا۔ 1951 میں غلام رسول عرفانی اور بنسی نردوش نے سنسار جاری کیا۔ 1952 میں عزیز ہارون نے ہفت روزہ 'نئی لہر' جاری کیا۔ عزیز ہارون مارکسی نظریے کے حامی تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار کو بھی کمیونسٹ خیالات کی تشہیر کا ذریعہ بنایا۔ 1951 میں کامریڈ نور محمد، عالم سرتاج اور رگھوناتھ وشنوی نے ہفت روزہ 'جمہور' شائع کیا۔ کمیونسٹ نظریے کا علمبردار ہفت روزہ 'مشعل' موتی لال مصری اور خواجہ غلام محمد صادق نے اجرا کیا۔ 1952 میں ہفت روزہ 'الحق' کشمیر پولیٹکل کانفرنس کا ترجمان بن گیا۔ اسے پیر عبدالاحد شائع کرتے رہے۔ 1952 ہی کو رشید تاثیر اور محمد یٰسین منظر نے ہفت روزہ 'فنکار' جاری کیا۔

اخبارات کے ساتھ ساتھ ان برسوں میں بعض معیاری ادبی ماہنامے بھی جاری ہوئے۔ ان میں کشمیری ماہنامہ 'گلریز' بدری ناتھ کوثر کا 'آزاد' محکمہ اطلاعات کا 'تعمیر' ویدراہی کا 'سویرا' موہن یاور کا 'سنگم' اور محکمہ دیہات سدھار کا 'دیہات سدھار' قابل ذکر ہیں۔ 1953 میں غلام رسول نے سری نگر سے ہفت روزہ 'ہمدرد' جاری کیا۔ 1971 میں یہ روزنامہ میں مبدل ہوگیا اور پوری بے باکی اور حق گوئی سے سیاسی اور سماجی مسائل پر اظہار خیال کرتا رہا۔ صوبہ جموں بھی 1947 کے بعد صحافت کے میدان میں آگے بڑھتا رہا۔ 1950 میں ایس، ایل رازدان نے ہفت روزہ 'شاردا' جاری کیا جو روزنامہ کی صورت میں زندہ ہے۔ ہرچرن سنگھ نے ہفت روزہ 'وقت' وید گپتا نے ہفت روزہ 'سویرا' ڈی سی دیوان نے ہفت روزہ 'شہر ڈگر' وید بھسین نے ہفت روزہ 'لوک راج' سرم دت شرما نے ہفت روزہ 'اجالا' 1952 میں موہن یاور نے ہفت روزہ 'رفتار' جاری کیا۔ ان میں کئی اخبار روزنامے بن گئے اور جموں میں خاصے مقبول ہیں۔

ریاست میں 1957 میں کلچرل اکادمی قائم ہوئی، اکادمی کے زیراہتمام ریاست کی مختلف زبانوں یعنی کشمیری، ڈوگرہ اور اردو میں رسالے جاری ہوئے۔ 1962 میں اکادمی نے اردو رسالہ 'شیرازہ' شائع کیا۔ جو اس وقت تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے متواتر خصوصی نمبر ادبی صحافت کو بلندیوں سے ہمکنار کر چکے ہیں۔ اس میں ریاست کے ادیبوں، نقادوں اور شاعروں کے علاوہ بیرون ریاست کے نامور قلمکاروں کی نگارشات شائع ہوتی ہیں۔ 'شیرازہ' نے ریاست میں اردو ادب کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اکادمی کی طرف سے ایک خبرنامہ اکادمی بھی گاہے گاہے شائع ہوتا رہا۔ محکمہ اطلاعات کے زیراہتمام ماہنامہ 'تعمیر' بھی پوری آب و تاب کے ساتھ چھپتا رہا۔ 'تعمیر' نے کشمیری زبان اور ثقافت کی گراں قدر خدمت انجام دی ہیں۔ کئی سربرآوردہ شعرا مثلاً آزاد، مہجور سے متعلق خاص نمبر شائع کیے گئے۔ اس محکمے سے خبرنامہ 'مکتوب' بھی شائع ہوتا رہا۔

جموں میں صحافت کا عمل سرگرمی سے جاری رہا۔ 1954 میں گوجر برادری کا ترجمان 'نوائے قوم' جاری ہوا۔ اسی سال سردار رگھبیر سنگھ مکتا نے ہفت روزہ 'لوک سندیش' جاری کیا۔ 1955 میں روشن لال نے ہفت روزہ 'مساوات' اور اقبال نرگس نے ہفت روزہ 'خورشید' کا اجرا کیا۔ 1956 میں لالہ آنند صراف نے ہفت روزہ 'حقیقت' متعارف کیا۔ اس کے بعد کئی اخبارات منظر عام پر آئے۔ ان میں

وجے سمن کا 'چٹان' سردار اجیت سنگھ کا 'کشمیر ٹرانسپورٹ' بابورام گپتا کا 'عمارت' اور پی ٹھاکر کا 'چناب' اور سردار تارا سنگھ کا 'امن' قابل ذکر ہیں۔

دسمبر 1963 میں موئے مبارک کو اپنی مقدس جگہ سے منتقلی کے بعد خواجہ غلام محمد صادق برسر اقتدار آئے۔ انھوں نے فوراً پریس اور پلیٹ فارم سے تمام پابندیاں ختم کیں۔ انھوں نے 1964 میں حکومت ہند سے استدعا کی، کہ وہ ریاست میں پریس کے قوانین لاگو کرے۔ چنانچہ 1966 میں ریاست پر مرکزی پریس ایکٹ لاگو ہوا۔ اس کے نتیجے میں ریاست میں کئی لوگ اخبار نویسی کی جانب مائل ہوئے۔ 1964 کو ہفت روزہ 'محافظ' ہفت روزہ 'کارواں' ہفت روزہ 'آئینہ' اور 'میزان' جاری ہوئے۔ ان اخبارات میں 'آئینہ' تیزی سے ترقی کے مراحل طے کرتا گیا۔ 'آئینہ' شمیم احمد شمیم کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس نے صحافت میں ایک نیا معیار قائم کیا۔ شمیم احمد شمیم ایک بے باک اور حق پسند صحافی تھے۔ انھوں نے سیاسی بے ایمانیوں اور سماجی مسائل پر زوردار ایڈیٹوریل لکھے۔ 'آئینہ' کا ہر شمارہ سیاسی دنیا میں ہلچل پیدا کرتا تھا۔

اس کے بعد طاہر مضطر نے ہفت روزہ 'آہنگ' اور 'سلسبیل' غیاث الدین نے 'چنار' غلام محی الدین نے 'رہبر' عبدالستار رنجور نے 'ہمارا کشمیر' محمد فاروق رحمانی نے ہفت روزہ 'چٹان' قاری سیف الدین نے 'اذان' شفیع سنانی نے 'زمیندار' صوفی غلام محمد نے ہفت روزہ 'نوائے کشمیر' نکالا۔ غلام نبی خیال کا 'اقبال' عبدالرحمٰن آزاد کا 'سرچشمۂ حیات' طاہر ہمدانی کا 'نیا دور' بلال نازکی کا 'الغفران' قابل ذکر ہیں۔

1967 میں 'سری نگر ٹائمز' کو صوفی غلام محمد نے جاری کیا۔ 'سری نگر ٹائمز' عوام میں بے حد مقبول ہے۔ اس میں بشیر احمد بشیر کا کارٹون شامل ہوتا ہے، جو سیاسی اور سماجی بے ضابطگیوں پر طنز کا کام کرتا ہے۔ 1970 کے بعد جو مشہور اخبار سامنے آئے ان میں 'انڈین ٹائمز'، 'سری نگر ایکسپریس' اور مارننگ ٹائمز، کرم ویر، تقویم، کوہستان، صداقت، انقلاب اور لالہ رخ قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک ادبی ماہناموں کا تعلق ہے، اس میں کشمیری اور اردو میں نکلنے والا ماہنامہ گلریز، وکیل، جھرنا، کینواس، ادبیات، دھنک، العطش، ہما وغیرہ قابل ذکر ہیں، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی سے خبرنامہ کے علاوہ رسالہ ادبیات، بازیافت اور نیا شعور شائع ہوتے رہے۔ کالجوں سے پرتاپ، لالہ رخ، زون اور ہمپوش نکلتے رہے۔ اکادمی سے سال کی بہترین نگارشات کا انتخاب ہمارا ادب چھپتا رہا۔

گزشتہ تیس برسوں میں ریاست میں اردو صحافت نے حیران کن ترقی کی ہے اور متعدد روزنامے ہفت روزہ اور ماہنامے معرض وجود میں آئے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ریاست میں تعلیم کے پھیلاؤ نے لوگوں کو اخبار بینی کی طرف مائل کیا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ کئی نوجوانوں نے صحافت کو روزگار کا وسیلہ بنایا۔ چنانچہ اخبارات کی ایک کثیر تعداد سامنے آنے لگی۔ ان میں اہم اخباروں کی تفصیل درج ذیل ہیں:

ہفت روزہ	پیام کشمیر	محمد فاروق بڈھو
ہفت روزہ	نقشبند	ابوالقاسم
ہفت روزہ	کشمیر سماچار	نور محمد
ہفت روزہ	کینواس	محمد یوسف
ہفت روزہ	سری نگر نیوز	معراج الدین
ہفت روزہ	تسکین	مقبول حسین کاظمی
ہفت روزہ	کوہ ہمالیہ	مدن سنگھ
ہفت روزہ	آواز جموں	موہن لال
ہفت روزہ	صدائے کشمیر	طاہر ہمدانی
ہفت روزہ	نیا ولولہ	محمد یوسف میر
ہفت روزہ	برگ سبز	شیخ غلام نبی
ہفت روزہ	دبستان	امداد ساقی
ہفت روزہ	سلطان الاولیا	مفتی جلال الدین

1980 کے بعد اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ زور وشور سے جاری رہا۔ چنانچہ پتامبر ناتھ درفانی نے نئی نظر، نئے زاویے، شش ناگ، آتش چنار، تجلی، غلام نبی بلدیو، اپنا پرچم، سیف الدین سوز، وادی کی آواز، غلام نبی شیدا، کشمیر نما، غلام نبی لون آفاق، محمد یوسف قادری ہفت روزہ 'چٹان' منظر عام پر آئے۔ ان کے علاوہ ماہنامہ توحید، سرکتا آنچل، اولیا، ظہور اسلام جیسے رسالے سامنے آئے۔ آج کل الصفا، ندائے مشرق، عقاب، آفاق، صبح کشمیر، سری نگر نیوز جیسے اخبارات صحافتی تقاضوں کو پورا کررہے ہیں۔

بہرحال کشمیر میں اردو صحافت اپنی کم عمری کے باوجود اپنے پھیلاؤ اور رنگارنگی کا احساس دلاتی ہے۔ یوں تو انیسویں صدی کے اواخر سے ہی اردو صحافت کا آغاز ہوا ہے۔ لیکن دراصل باقاعدگی سے اس کی شروعات موجودہ صدی میں ہوتی ہے اور یہ برابر ملک میں اردو صحافت کے شانہ بہ شانہ پیش قدمی کررہی ہے، اور آج اردو صحافت اپنی اہمیت منوا چکی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اب اردو اخبار لیتھو سے نجات پاکر آفسیٹ پر چھپ رہے ہیں اور مدیروں کو ادارتی ذمے داریوں کا احساس بڑھ رہا ہے۔

اخباروں میں اب رنگا رنگ فیچرس، تبصرے، طنزیہ اور مزاحیہ کالم، نظمیں، ادب پارے نمایاں جگہ پاتے ہیں۔ اخباروں میں کارٹون بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ طباعت کی جدید سہولیات سے فائدہ اٹھا کر مدیران اخبارات اخباروں کے گٹ اپ، سجاوٹ اور رنگارنگی میں اضافہ کررہے ہیں اور امید کی جاسکتی ہے کہ اخبارات، ریاست میں تیزی سے ترقی کے منازل طے کریں گے۔ تاہم بعض ایسے امور بھی ہیں جو اخبارات کا معیار بلند کرنے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک حد سے بڑھتی ہوئی کاروباریت بھی ہے۔ اخبار نویس زیادہ سے زیادہ اشتہارات چھاپنے کی فکر میں رہتے ہیں اور آج کل اخبار اشتہارات کا پلندہ ہوتے جارہے ہیں۔ تقریباً سارے روزنامے اشتہارات کی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لینا چاہتے ہیں۔ اس سے اخبارات کا معیار گھٹتا جارہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اخبارات زیادہ سے زیادہ آئے دن کے سیاسی واقعات کی رپورٹنگ پر بھی ساری توجہ مبذول کرتے ہیں اور ملک یا ریاست کی قدیم ثقافتی میراث، ادبی روایات، مذہبی خیالات، سماجی ضروریات سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

اس طرح سے اخبارات اپنے فرائض منصبی سے کوتاہی برتنے کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔ اس بات کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ نہیں دی جارہی ہے کہ اخباروں کے صفحات کا ایک حصہ نئی نسلوں کے مسائل کے لیے وقف کیا جاتا۔ قوم کا سرمایہ اس کے نوجوان ہوتے ہیں۔ چنانچہ ماہرین تعلیم سیاست دانوں اور سماجی علوم کے ماہرین کے ساتھ ساتھ صحافیوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ قوم کے مستقبل یعنی نئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی طرف توجہ دیں۔

کتابیات

1. جموں وکشمیر میں اردو صحافت: صوفی محی الدین
2. کشمیر میں اردو صحافت: رشید تاثیر (شیرازہ جلد 27، شمارہ 5)
3. جموں وکشمیر میں اردو صحافت: منظور احمد بابا (شیرازہ جلد 24، شمارہ 2)
4. جموں وکشمیر میں اردو صحافت: ڈاکٹر برج پریمی (کشمیر کے مضامین)
5. اردو صحافت اور عصری تقاضے: ڈاکٹر مصطفیٰ کمال (فصیل)
6. کشمیر میں اردو: ڈاکٹر عبدالقادر سروری (جلد 1، 2، 3)

■

Prof. Arifa Bushra Dept. of Urdu, Kashmir University, (J&K)

سراج نقوی

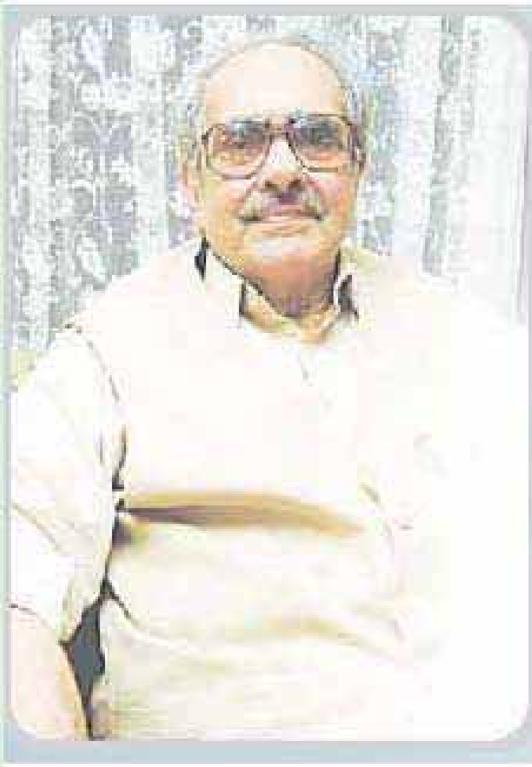

حالی کی شاعری میں 'ہندوستانیت'

23 نومبر 2015 کو اردو ادب و شاعری کا ایک اور 'ہلالِ امتیاز' ڈوب گیا۔ پاکستانی عوام کے درمیان اپنے قومی نغموں کے سبب بے حد مقبولیت حاصل کرنے والے جمیل الدین عالی انتقال کر گئے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اے وطن کے سجیلے جوانو، جیوے جیوے پاکستان، میرا پیغام پاکستان، جو نام وہی پہچان پاکستان پاکستان اور 'اتنے بڑے جیون ساگر میں تو نے پاکستان دیا' جیسے حب الوطنی سے سرشار قومی نغموں کے خالق کی شاعری میں حب الوطنی کے اس جذبے کے متوازی ایک دوسرا جذبہ بھی پوری آب و تاب کے ساتھ کام کرتا رہا، اور یہ جذبہ تھا 'ہندوستانیت'۔ ظاہر ہے اس کا سبب یہ تھا کہ تقسیم وطن کے بعد پاکستان ہجرت کرنے کے باوجود دل والوں کی دلّی کے اس البیلے شاعر، ادیب، کالم نگار اور صحافی کے ذہن کے نہاں خانوں میں غیر منقسم ہندوستان اور اس کا کلچر زندہ رہا۔ گنگا جمنی تہذیب زندہ رہی، اردو زبان کی وہ لسانی اور سماجی روایات اور وراثت زندہ رہی جو برصغیر کی پہچان ہے۔ ان کا دل بھلے ہی پاکستانی ہو گیا، لیکن روح ہندوستانی ہی رہی۔

دراصل تقسیم وطن کے بعد وجود میں آنے والے ادب کو تقسیم کے المیے نے کئی طرح سے متاثر کیا۔ کچھ شاعر، ادیب اور فنکار اس سے راست طور پر متاثر نظر آتے ہیں اور ان کے یہاں ہجرت کے اس درد کی واضح تصویریں ملتی ہیں۔ شاعری میں جون ایلیا اور فکشن میں انتظار حسین و سعادت حسن منٹو سمیت ایسے بے شمار نام ہیں کہ جو اسی زمرے میں آتے ہیں۔ لیکن قلم کاروں کا دوسرا گروہ وہ ہے کہ جن کے یہاں ہجرت کے اس غم کی کیفیت مختلف ہے۔ ان کے یہاں ہجرت کے مضامین بھلے ہی نظر نہ آئیں لیکن تحریروں کی فضا اور ماحول پوری طرح منظر ہندوستانی ہے اور زبان پر 'ہندوستانیت' کے اثرات کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جمیل الدین عالی کا تعلق اس دوسرے گروہ سے تھا۔

عالی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، وہ بیک وقت ایک اچھے منتظم، ماہر معاشیات اور سیاست داں بھی تھے، لیکن ان کی پہچان ان کا وہ قلم ہی تھا کہ جس کا سفر کم و بیش تقریباً 6 دہائیوں تک جاری رہا۔ انھوں نے نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے تک پاکستان کے سب سے بڑے اخبار 'جنگ' (اردو) کے لیے کالم لکھے۔ ان کا کالم 'نقار خانے میں...' اردو حلقوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا اور اس میں انھوں نے ادب سے لے کر صحافت، سیاست، ثقافت، اقتصادیات، سماجیات غرضیکہ ہر موضوع پر لکھا۔ مختلف سماجی مسائل پر ان کی تحریریں ان کی انسانی دردمندی اور سیاسی و سماجی شعور کا ثبوت ہیں۔ ان کے مستقل کالموں میں پاکستان اور اس کے داخلی مسائل کے تعلق سے وہ تشویش اور احساس موجود ہے جو کسی بھی سچے محب وطن قلم کار کی تحریروں میں عام طور پر ہوتا ہے۔ 9 دسمبر 2012 کے 'جنگ' میں تحریر کیے گئے مذکورہ کالم کی یہ سطور دیکھیں: "کبھی کبھی میں اس موقف کا حامی بھی ہو جاتا ہوں کہ انسان واقعی درندے کی ایک حد تک ترقی یافتہ شکل ہے۔ میں اس کے دماغ میں اب بھی بعض وہ اجزا زندہ اور متحرک دیکھتا ہوں جو اسے قتل و غارت گری پر آمادہ رکھتے ہیں۔" ٹارگٹ کلنگ، انتہا پسندی، حکومت اور انتظامیہ کی ناکامی و عدم فعالیت اور پاکستانی سماج و دنیا کے دیگر سنگین مسائل پر بھی انھوں نے کالم لکھے۔ مختلف مواقع پر دیے گئے ان کے انٹرویو بھی عالی کے اس سیاسی و سماجی شعور اور عالمی و قومی مسائل پر ان کے ایماندارانہ موقف کا ثبوت ہیں۔ 20 جنوری 2010 کو اپنے بیٹے اور مشہور ٹی وی آرٹسٹ راجو جمیل سے اپنی بات چیت میں انھوں نے یہ اعتراف کیا تھا کہ پاکستان نے مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ پاکستان میں بڑھ رہی مسلکی منافرت، علاقائیت اور علیحدگی پسندی پر بھی انھوں نے اس بات چیت میں اپنی بے چینی کا اظہار کیا تھا۔ 'انسان' کے عنوان سے لکھی جا رہی ان کی طویل ترین لیکن نامکمل نظم بھی دراصل آج کے انسان کے مختلف مسائل کے ارد گرد ہی گھومتی ہے۔ اس نظم کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا کہ "شاید میں اسے مکمل نہ کر پاؤں" اور ایسا ہی ہوا بھی۔ اس کا سبب دراصل یہ ہے کہ انسانی معاشرہ روز ایک نئے مسئلے سے دوچار ہوتا ہے اور ان مسائل پر لکھنے والے کی فکر کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ جمیل الدین عالی کی مذکورہ نظم نامکمل رہنے کا سبب بھی انسانی مسائل کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ "قومی و عالمی مسائل حاضرہ پر ادیب کی نظر ہونی چاہیے، نہ صرف ان پر نظر ہونی چاہیے بلکہ جہاں تک ممکن ہو اس سلسلہ میں اسے اتنی دلچسپی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے احساسات و

جذبات کے ذریعے ہر بار ایک نئی قوت، نیا لہجہ، الفاظ، استعارے اور امیجز حاصل کرتا رہے۔" جمیل الدین عالی اس کسوٹی پر کھرے اترتے تھے۔ ان کے کالم اور شاعری اس بات کا ثبوت ہیں۔

عالی کا تعلق دلّی کے ایک علمی و ادبی اور متمول گھرانے سے تھا۔ ان کے دادا نواب علاء الدین احمد خاں غالب کے دوست اور شاگرد تھے۔ والد سر امین الدین خاں بھی شاعر تھے اور والدہ سیدہ جمیلہ بیگم کا تعلق خواجہ میر درد کے گھرانے سے تھا۔ اس طرح علم وادب اور شاعری انھیں ورثے میں ملے تھے۔ عالی کی ابتدائی تعلیم پرانی دلّی کے اینگلوعربک اسکول میں ہوئی اور دلّی یونیورسٹی سے انھوں نے گریجویشن کیا۔ ان کی شادی طیبہ بیگم سے ہوئی جو عمر میں ان سے 5 سال بڑی تھیں، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ طیبہ بیگم سے انھوں نے اپنی پسند سے شادی کی اور اپنے والدین کو اس شادی کے لیے رضامند کیا۔ تقسیم وطن کے بعد عالی نے پاکستان کا رخ کیا اور یہاں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، لیکن اپنی بے حد مصروف دفتری زندگی کے باوجود ان کے قلم کا سفر بھی جاری رہا۔ ملک کی علمی وادبی سرگرمیوں میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ اردو کی ترقی اور اردو والوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ ہوسکتا تھا۔ وہ انھوں نے کیا۔ اردو روزنامہ 'جنگ' میں کالم لکھنے کے علاوہ انجمن ترقی اردو، پاکستان کے مجلّہ 'قومی زبان' کی ادارت بھی کی۔ وہ نقاد بھی تھے اور صحافی بھی۔ مٹی سے محبت کا حق ادا کرنے کے لیے انھوں نے حب الوطنی پر مبنی نغمے لکھے اور ان کی بھرپور پذیرائی بھی ہوئی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود برصغیر کے اردو حلقوں میں انھیں اپنے دوہوں کے سبب پہچان ملی۔ یہ دوہے ہی دراصل ان کی شاعری میں 'ہندوستانیت' کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان دوہوں میں عالی کا دلّی اور اس کی ٹکسالی اردو اور ہندی کی شعری روایت سے لگاؤ صاف نظر آتا ہے۔ ہندوستان کا مشترکہ کلچر اور ہولی، دیوالی جیسے تہواروں کا ذکر بھی ان دوہوں میں ملتا ہے۔ چند دوہے دیکھیں:

اردو والے، ہندی والے دونوں ہنسی اڑائیں
ہم دلّی والے اپنی بھاشا کس کس کو سکھلائیں

عالی اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تیوہار
ہم تو گئے تھے، چھیلا بن کر، بھیّا کہہ گئی نار

ہر اک بات میں ڈالے ہے ہندو، مسلم کی بات
یہ نہ جانے الھڑ گوری پریم ہے خود اک ذات

سور، کبیر، بہاری، میرا، رحمٰن، تلسی داس
سب کی سیوا کی پر عالی گئی نہ من کی پیاس

مذکورہ دوہوں کی فضا، ماحول اور زبان پوری طرح ہندوستانی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہجرت کے باوجود عالی اس تہذیب کا ہی گن گان کرتے رہے جو دراصل ہندوستانی تہذیب تھی اور جس میں انھوں نے اپنے بچپن سے جوانی تک کا وقت گزارا تھا۔ ان کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی سخنوری کی روایت کو کبیر داس، سورداس، بہاری، میرا، تلسی داس اور نظیر اکبرآبادی

اردو کی ترقی اور اردو والوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ ہوسکتا تھا وہ انھوں نے کیا۔ اردو روزنامہ 'جنگ' میں کالم لکھنے کے علاوہ انجمن ترقی اردو، پاکستان کے مجلہ 'قومی زبان' کی ادارت بھی کی۔ وہ نقاد بھی تھے اور صحافی بھی۔ مٹی سے محبت کا حق ادا کرنے کے لیے انھوں نے حب الوطنی پر مبنی نغمے لکھے اور ان کی بھرپور پذیرائی بھی ہوئی۔

جیسے شعرا سے جوڑے رکھا جسے ہم ہندوستانی شعری روایت کہہ سکتے ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کے تعلق سے مجنوں گورکھپوری کی رائے ہے کہ "نظیر ہندوستان کے شاعر تھے اور ہندوستان کی جمہوری زندگی کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اسالیب ولہجہ عوام سے ہم سطح رکھا۔" جمیل الدین عالی کی شاعری میں بھی یہ عنصر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

عالی کی غزلوں میں بھی ہندی اور 'ہندوستانیت' کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیں:

جسے یہ چھولیں وہ سونا ہے آپ ہیں خالی ہاتھ
عالی جی کا نام پڑا ہے مرزا پارس ناتھ —

—

عالی تونے اتنے برس اس دیس کی روٹی کھائی
یہ تو تھا تری کویتا رانی دیس کے کس کام آئی

—

کچھ چھوٹے چھوٹے دکھ اپنے، کچھ دکھ اپنے عزیزوں کے
ان سے ہی جیون بنتا ہے سو جیون بن جائے گا

—

کہتا ہے تمھارا دوش نہ تھا کچھ ہم کو بھی اپنا ہوش نہ تھا
پھر ہنستا ہے پھر روتا ہے پھر چپ ہوکر رہ جاتا ہے

عالی نے نظمیں بھی لکھیں اور یہاں بھی ان کی انفرادیت کے رنگ صاف نظر آتے ہیں۔ طویل نظم 'انسان' جس کا ذکر شروع میں آیا اس کے علاوہ بھی کچھ نظمیں ایسی ہیں کہ جن میں احتجاج کے مدھم سروں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ 'تلاش' ایک ایسی ہی نظم ہے۔ چند سطور ملاحظہ فرمائیں:

وہ بچہ کہاں ہے
جو کہہ دے کہ حضرت سلامت
یہ سب لوگ ملبوس شاہی کا اقرار کرتے رہیں
مجھ کو تو آپ ننگے نظر آرہے ہیں

اپنی قادرالکلامی اور شاعرانہ اوصاف کا خود عالی کو بھی احساس تھا۔ ہر بڑے فنکار کی طرح اپنے فن کے بارے میں ان کی بھی رائے تھی اور یہ رائے اس لیے اہم ہے کہ اس کی روشنی میں ان کی شاعری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اپنی اس رائے کا اظہار ایک غزل میں بھی انھوں نے کیا۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمالیں:

کچھ دن گزرے عالی صاحب عالی جی کہلاتے تھے
محفل محفل قریہ قریہ شعر سناتے جاتے تھے
قدر سخن ہم کیا جانیں ہاں رنگ سخن کچھ ایسا تھا
اچھے اچھے کہنے والے اپنے پاس بٹھاتے تھے
غزلوں میں سو رنگ ملا کر اپنا رنگ ابھارا تھا
استادوں کے سائے میں کچھ اپنی راہ بناتے تھے
گیتوں میں کچھ اور نہ ہو اک کیفیت سی رہتی تھی
جب بھی مصرعے رقصاں ہوتے معنی ساز بجاتے تھے
دوہے کہنے اور پڑھنے کا ایسا طرز نکالا تھا—
سننے والے سر دھنتے تھے اور پہروں پڑھواتے تھے

عالی کی مذکورہ غزل تھوڑی بہت شعری مبالغہ آرائی کے باوجود ان کی شاعری پر مختصر لیکن جامع تبصرہ بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی قلمی کاوشیں نصف صدی سے زیادہ عرصے تک برصغیر کے اہل علم و دانش ہی نہیں بلکہ عوام کو بھی متاثر کرتی رہیں ان کی ادبی وشعری خدمات کے نتیجے میں ہی انھیں حکومت پاکستان کے سب سے بڑے ایوارڈ، ہلال امتیاز کے علاوہ آدم جی ادبی ایوارڈ اور کمال فن ایوارڈ سمیت کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ 1989 میں دہلی میں انھیں 'اردو کانفرنس دہلی' میں 'سنت کبیر ایوارڈ' سے نوازا گیا جو ایک طرح سے ان کی شاعری میں 'ہندوستانیت' کا اعتراف تھا۔

■

Siraj Nqavi, A-101 East Avenue Ahimsa Khand, Near Shanti Gopal Hospital, Indirapuram, Ghazibad -201014 (UP)

شاہد پٹھان

احتشام حسین کا تنقیدی نظریہ

اردو تنقید کے اصول ساز نقادوں میں مولانا حالی اور شبلی کے بعد پروفیسر احتشام حسین کو نمایاں مقام حاصل ہے، جس طرح مولانا حالی نے مغربی علمائے ادب اور سرسید تحریک کے اجتماعی وافادی تصورات کے حسنِ امتزاج سے اپنے اسلوبِ نقد کی شیرازہ بندی کی بعینہٖ احتشام حسین نے بھی اپنے عرصہ کار میں ترقی پسند تحریک کے بنیادی اصول وافکار کے استخراج واستنباط سے مارکسی، سماجی اور ترقی پسند تنقید کی اصول سازی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اردو کے 1936 سے 1972 تک کے ادبی وتنقیدی منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو نظریاتی تنقید کی حمایت کرنے والے نقادوں میں نمایاں کام اور مقام احتشام حسین کا نظر آتا ہے، شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے جدیدیت آمیز تصورِ نقد کے پیشِ نظر لکھا ہے:

"حالی کے بعد ہمارے یہاں جو تنقید لکھی گئی اس میں نظریے کی اہمیت کا احساس کبھی غائب تو کبھی موجود رہا، اس وجہ سے تنقیدی نظریات کے چھینٹے تو پڑتے گئے، لیکن مشرح اور منضبط نظریہ سازی نہ ہوسکی صرف ترقی پسندوں نے اس سلسلے میں کاوش کی لیکن ان کے اپنے تضادات اس قدر تھے کہ کوئی سیر حاصل نقشہ نہ بن سکا۔"

(تنقیدی افکار، ص:52، اشاعت 1983 الٰہ آباد)

ادب کا باشعور طبقہ اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ 'رومانیت' سے لے کر 'جدیدیت' تک ہر تحریک ورجحان کے افکار ونظریات میں 'تضادات' کے عناصر دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں، جس طرح سے بین الاقوامی سطح پر 'رومانی تحریک' کے الگ الگ ملکوں کے ادبا ومفکرین کے یہاں رومانیت کے مختلف ومتضاد رنگ اور رویے بروئے کار آئے ہیں، بعینہٖ یہی صورت وکیفیت 'ترقی پسندی' اور پھر 'جدیدیت' سے وابستہ ادیبوں اور نقادوں کے یہاں بھی بآسانی محسوس کی جاسکتی ہے، اختر حسین رائے پوری، احمد علی اور احتشام حسین کی ترقی پسندی میں فرق ہے، اسی طرح سے خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، گوپی چند نارنگ کے تصورِ جدیدیت اور شمس الرحمٰن فاروقی کے 'مسلکِ جدیدیت' میں بھی کافی فرق اور فصل ہے، ترقی پسندوں کے باہمی اختلاف (معمولی سے) کو اصلاً سب سے پہلے خود ثقہ ترقی پسند ادبا مثلاً سجاد ظہیر، ممتاز حسین، آل احمد سرور اور خود احتشام حسین ہی نے محسوس کیا اور جذباتی وانتہا پسند ترقی پسندوں کی تنبیہ بھی کی۔ احتشام حسین صاحب کے مضامین سے ایک دو مثالوں سے اس امر پر مزید روشنی پڑسکے گی، احتشام حسین نے اپنے ایک مضمون 'ادبی تنقید کے مسائل' (1944) میں ادب وانتقاد کے بہت سے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں 'اشتراکی حقیقت نگاری' کی اصطلاح کے مبادیات کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تنقید جب حقیقت کے عام اور سطحی مفہوم سے گزر کر حقیقت کے ہر شعبے کو، اس کے مثبت اور منفی اثرات کو، اس کے مادی، اور نفسیاتی وجود اور تعلق کو گھیر لیتی ہے تو اسے اشتراکی حقیقت نگاری کا نام دیا جاتا ہے، اس میں فرد کا تجزیہ ایک باشعور سماجی انسان کی حیثیت سے کیا جاتا ہے اور شاعر یا ادیب الہام والقا کی اونچی سطح سے اتر کر نقاد کے روبرو پیش ہوتا ہے، ایسے تنقیدی تجزیہ سے لوگ گھبراتے ہیں کیوں کہ یہ طریقہ ادیب کو اس کے سماجی روابط کی روشنی میں پیش کرتا ہے......رجعت پسند اور انحطاط پذیر تصورات کا پول کھولتا ہے۔ یہ ادب برائے ادب کے گول گنبد میں پناہ لینے والوں کی خالص جمالیاتی تخلیق سے پردہ ہٹا کر ان کے معاشرتی رجحان کا تجزیہ کرتا ہے" مگر انھیں یہ بھی احساس ہے کہ بہت کم نقاد (مارکسی) ابھی اس طریقِ نقد سے کما حقہ آگاہ ہوسکے ہیں۔" چنانچہ احتشام حسین مزید لکھتے ہیں:

"ایسی تنقید جو حقیقت کو اس کے ہر مادی روپ میں تلاش کرلے اور تجزیے کی مدد سے شعر وادب میں حسن کی جستجو کرلے، اردو میں ابھی نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ نقاد کے لیے بعض فرائض کی طرف اشارہ کردیا جائے۔"

(روایت اور بغاوت ص: 40-41، اشاعت 1972 لکھنؤ)

چنانچہ انھوں نے نقاد کے لیے بہت سی ہدایات دی ہیں، ان میں سے ایک ہدایت یہ بھی ہے:

"نقاد کو فطری اور سماجی علوم، انسانی تمدن کی تاریخ، زبان کی پیدائش اور نشو ونما کی تاریخ کا مطالعہ کیے بغیر تنقید کے میدان میں قدم نہ رکھنا چاہیے ورنہ وہ اس دشوار گزار منزل سے گزر نہ سکے گا۔" (روایت اور بغاوت، ص، 45)

لہٰذا احتشام حسین خود ترقی پسند نقادوں کے طریقِ کار اور تصورِ نقد میں پائے جانے والے باہمی اختلاف

(جسے غیر ترقی پسند 'تضاد' سے موسوم کرتے رہے ہیں) کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو نقاد ادب کو زندگی کا عکس قرار دیتے ہیں، زندگی کو تغیر پذیر سمجھتے ہیں اور اس تغیر کے وجوہ کو مادی مانتے ہیں، جو ادب کو ادیب کے شعور کا نتیجہ کہتے ہیں اور اس شعور کو زندگی کی کشمکش اور تجربوں سے مشکل ہوتا ہوا تسلیم کرتے ہیں، جو یہ مانتے ہیں کہ انھیں تبدیلیوں کی وجہ سے زبان اور اسالیب بیان، ہیئت اور طریقۂ اظہار میں بھی تبدیلی کے نتائج کی جستجو کرنا چاہیے، جو ادب کو ارتقائے تہذیب کا ایک جز قرار دیتے اور اسے انسانی سماج کو بہتر بنانے کی آرزوؤں کا آلہ سمجھتے ہیں، سب ترقی پسند نقاد تسلیم کیے جائیں گے، اگرچہ ان میں بعض محض 'روحِ عصر' تک آکر ختم جائیں گے، بعض ادب اور معاشی زندگی میں مکمل ہم آہنگی کی جستجو کرتے نظر آئیں گے، بعض طبقاتی آویزش کو نمایاں جگہ دیں گے، بعض عمرانی نفسیات کے اصولوں کو اپنا رہنما بنائیں گے، اور بعض ادیب کی ذمے داری پر زور دے کر اس سے واضح افادی نقطۂ نظر کا مطالبہ کریں گے۔

ان چھوٹے بڑے اختلافات کے باوجود یہ وہ نقاد ہیں جو تنقید کے سائنٹفک ہونے کے قائل ہیں یہ اپنے اپنے انداز میں میتھو آرنلڈ، سینٹ بیو، لینن، مارکس، کاڈول وغیرہ سے متاثر ہیں لیکن اردو ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے اصولوں کی یگانگت سے بچ کر ادبی شعور کی روح تک پہنچنا چاہتے ہیں، مجنوں، اختر رائے پوری (شروع کے) سجاد ظہیر، احمد علی (شروع کے) ڈاکٹر علیم، سرور، سبط حسن، ڈاکٹر اعجاز حسین، ممتاز حسین، عبادت بریلوی، ڈاکٹر محمد حسن، مجتبی حسین، سردار جعفری، اختر انصاری، ظہیر کاشمیری، عابد حسن منٹو، خلیل الرحمٰن، باقر مہدی، سب اسی دائرے میں آجاتے ہیں......ڈاکٹر علیم، ممتاز حسین، سردار جعفری، مجتبی حسین، عابد حسن منٹو، مارکس کے نظریات کو پورے تنقیدی شعور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، سرور، محمد حسن اور عبادت مارکسی اصولوں سے سو فی صدی متفق نہ ہوتے ہوئے بھی ان اہم نتائج کو نظر انداز نہیں کرتے جن کی طرف مارکس نے متوجہ کیا تھا۔'' (روایت اور بغاوت ص: 50-249)

غرض کہ اردو میں نظریاتی تنقید یا تنقیدی اصول سازی کی جتنی اور جیسی تدابیر کی گئی ہیں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادبا و ناقدین ہی نے کی ہیں اور ان سب کی اجتہادی کوششوں سے 'ترقی پسند دبستانِ نقد' کی بنیاد قائم ہوئی ہے، اس بنیاد پر جن ترقی پسند نقادوں نے عمارت قائم کی ان میں احتشام حسین کی نظری و عملی تنقیدوں کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

احتشام حسین صاحب نے اگرچہ ادب اور تنقید (نظری تنقید) پر کوئی مبسوط و مستقل تصنیف یادگار نہیں چھوڑی، خود انھیں بھی اس بات کا احساس و اعتراف رہا ہے، تاہم انھوں نے اپنے دیباچوں، مضامین اور مقالات مثلاً: 'ادبی تنقید کے مسائل'، 'اصولِ نقد'، 'تنقید اور عملی تنقید'، 'ادبی تنقید: قد اور معیار کی جستجو'، 'مشرق اور مغرب کے اصولِ تنقید'، 'تنقید اور ادبی تنقید'، 'اردو تنقید اور جدید ذہن'، 'ادب اور اخلاق'، 'مواد اور ہیئت'، 'اردو تحقیق و تنقید'، 'اردو ادب میں ترقی پسندی کی روایت'، 'قدیم ادب اور ترقی پسند نقاد'، 'ترقی پسندی کے مسائل'، 'افسانہ اور حقیقت'، 'اردو ادب میں آزادی کا تصور'، 'جدید روسی ادب کا نظریاتی ارتقا'، 'ادب میں جنسی جذبہ'، 'ادب کا مادی تصور'، 'ادب اور افادیت'، 'امریکی تنقید کے چند نئے تنقیدی ردِ عمل'، 'تنقید کے ایک نئے نقطۂ نظر کی ضرورت'، 'نئے تیشے نئے کوہکن' 'مغربی'، 'جمالیات، فن اور قاری'، 'نیا ادب اور ترقی پسند ادب' (ایک مباحثہ) 'حالی اور پیروی مغربی' (ایک مباحثہ)، 'ادب اور تہذیب'، 'میں کیوں لکھتا ہوں'، 'اردو تنقید کا ارتقا (دو اقساط میں)'، 'پریم چند کی ترقی پسندی'، اور 'شعر فہمی' وغیرہ میں نظریاتی تنقید (اور عملی تنقید) پر جتنا اور جو کچھ لکھ دیا ہے، اس سے سائنٹفک تنقید کے بنیادی فکری و فنی منہاج و مبادیات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے ادب و شعر کے اسرار و حقائق، انفرادی و اجتماعی معنویت اور تہذیبی سروکاروں سے متعلق جن تصورات کا اظہار کیا ہے، ان میں آئندہ کے لیے بھی انتقادی بصیرت و ہدایت کے سامان موجود ہیں، یہ سچ ہے کہ احتشام حسین نے اپنی تنقید نگاری میں 'مارکسزم' سے کافی استفادہ کیا ہے، مگر ساتھ ہی انھوں نے دوسرے مغربی علمائے ادب کے ادبی انتقادی تصورات سے بھی حسبِ ضرورت کسبِ فیض کیا ہے، ان کا اصرار ہے کہ:

''اگر تنقید کوئی علمی کام ہے اور محض تاثرات کا بیان نہیں ہے تو ان تمام جدید علوم سے کام لینا ہوگا جن سے زندگی اور ادب کو سمجھا جاسکتا ہے''

(ذوقِ ادب اور شعور ص: 254، اشاعت: 1955)

احتشام حسین فنِ تنقید کو محض ذوقی اور وجدانی نہیں سمجھتے ان کے نزدیک 'مروجہ علوم اور تربیتِ ذوق، قومی شعور اور سماجی فضا، مطالعہ اور خواہش اکتساب سے اس میں اتنے عناصر شامل ہوجاتے ہیں کہ تنقید صرف ذوقی نہیں رہ جاتی، علم و حکمت کے دائرے میں داخل ہو کر سخن سنجی اور ادب فہمی کے بعض اصولوں کا مجموعہ نظر آنے لگتی ہے، اس حالت میں تنقید انفرادی تاثر پذیری کے باوجود ایسے سانچوں میں ڈھلنے کی کوشش کرتی ہے جن سے ادبی تخلیقات کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد لی جاسکے، تنقید کی یہ کوشش ہر ملک، ہر ادب اور ہر عہد میں ان علوم کی سرحدوں کے اندر جاری رہتی ہے، جن تک ذہن انسانی کی رسائی ہوتی ہے، محض فطری ملکہ کی بنیاد پر نہیں شعور اور علوم کے اضافے کی بنیاد پر ان کوششوں کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے اور ناپ کے پیمانے بھی۔ اسی لیے ہر ملک میں ان کا ظہور یکساں نہیں ہوا ہے، جس زمانے میں، جس جگہ، جیسا ادبی اور فکری ماحول ہوتا ہے اس سے مطابقت رکھنے والا تنقیدی نقطۂ نظر وجود میں آتا ہے، اور اس ماحول کو جن انسانی علوم نے روشنی پہنچائی ہے انھیں سے تنقید میں بھی مدد لی گئی ہے، اس حقیقت کو تاریخ اور سماجی اضافیت کے آئینے میں دیکھا جاسکتا ہے۔'' (جدید ادب: منظر اور پس منظر ص: 117، اشاعت 1996 اترپردیش، اردو اکادمی لکھنؤ)

احتشام حسین 'تنقید' کا ایک علمی اور فلسفیانہ تصور رکھتے ہیں، اپنے ایک مضمون 'مشرق و مغرب کے اصولِ تنقید: بعض مماثلتیں' میں وہ 'تنقید' کے مفہوم کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: 'اس کا (تنقید) مقصد محض تاثراتی ردِ عمل نہیں ہے جو ہر ادب پارے کے متعلق زیادہ غور و فکر کے بغیر پیدا ہو جاتا ہے یا اس کی تشریح تک محدود رہتا ہے، بلکہ تجزیہ، پرکھ، تقابل، تاثر پذیری، معنوی عظمت اور فنی تکمیل کے اہم اور لطیف پہلوؤں کا علمی جائزہ ہے جس سے شعر و ادب کے فنی اور فکری سبھی محاسن اور معائب پیش نگاہ ہوجائیں اور دوسرے بھی اسی طریق کار سے استفادہ کرسکیں، اس کو تنقید کا علمی نقطۂ نظر کہہ سکتے ہیں۔''

(جدید ادب: منظر اور پس منظر ص: 119)

احتشام حسین نے اپنے کئی دیباچوں اور مضامین میں مشرق و مغرب کے انسانیت پسند اور اجتماعی مقاصد کے حامل افادی ادبی و انتقادی نظریات سے استنباط استفادہ پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے: 'مشرق و مغرب کے تنقیدی افکار پر غور کرتے ہوئے مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ چاہے دوسری زبانوں کے مطالعے میں اس سے زیادہ مدد نہ مل سکے لیکن گوناگوں تاریخی اور لسانی اسباب کی بنا پر اردو کے مطالعے میں تنقید کا ایک ایسا ترکیبی اور امتزاجی نظریہ قطعاً مفید ہوسکتا ہے جو زبان و بیان ہی کے نہیں، عملِ تخلیق کے اکثر پہلوؤں پر حاوی ہو جو صرف مصنف کی جستجو نہ کرے، تصنیف کا تجزیہ و تحلیل بھی پیش نگاہ رکھے، محض قاری کی ضروریات سخن فہمی کو نہ دیکھے نقاد کی

قوت محاکمہ اور فکری وفنی بصیرت کا اشاریہ بھی فراہم کرے، ایسا نظریہ وہی ہوسکتا ہے جو اردو کے لسانی، ادبی، تہذیبی اور فکری مزاج سے ہم آہنگ ہو۔"

(جدید ادب: منظر و پس منظر،ص:119)

"اس وقت تنقید کا مسئلہ محض ادب کی پرکھ کا مسئلہ نہیں اپنی زبان اور اپنے ادب سے دل چسپی لینے کا مسئلہ بھی نہیں ہے بلکہ ادب کے عالمی معیاروں کو پیش نظر رکھ کر اس علم وفن سے کام لینے کا مسئلہ ہے جن سے انسانی ذہن، عمل اور محرکاتِ عمل کو سمجھا جاسکتا ہے، ادب کی تنقید زندگی اور زندگی کی قدروں کی تنقید ہے، کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے کی تنقید ہے، ادب کے اندر عقیدے اور بہتر نظامِ زندگی کی تلاش ہے، تنقید نہ تاریخ ہے نہ فلسفہ، سیاسیات ہے نہ سائنس لیکن یہ علوم جس حد تک انسانی ذہن میں داخل ہوتے اسے متاثر کرتے اور شعور کا جز بنتے ہیں اس کی جستجو ہے۔"

(ذوق ادب اور شعور ص:254، اشاعت 1955 لکھنؤ)

احتشام حسین کے نزدیک تخلیق کار کی طرح سے نقاد بھی سماج وقوم کا ایک ذمے دار فرد ہوتا ہے اور وہ غیر جانب دار نہیں رہ سکتا، سماج کے تئیں اس کی کچھ ذمے داریاں بنتی ہیں، جنھیں اسے نبھانے کی سعی کرنا ضروری ہے، وہ لکھتے ہیں:

"میرے خیال میں ادیب اور نقاد حقائق کی ایک ہی دنیا میں بستے ہیں اور ان میں اتنا بعد نہیں ہوتا جتنا ظاہر کیا جاتا ہے، ان کا رشتہ دشمنی اور اختلاف کا نہیں بلکہ تعاون اور اتحاد کا۔" (ذوقِ ادب اور شعور، ص:22)

چنانچہ خود انھوں نے بھی فن تنقید کا سماجی، افادی اور ترقی پسند نقطۂ نظر اپنایا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

ایک قادر القلم فن کار کی تحریر کوئی نہ کوئی منفی یا مثبت سماجی مقصد رکھتی ہے، بحیثیت نقاد کے میں ادراکِ حقیقت کے عام اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے (جو متعدد علوم کی مدد سے ہاتھ آئے ہیں) اس کی جستجو کرتا ہوں تا کہ کسی تصنیف کی اہمیت واضح کرسکوں خود سمجھ اور دوسروں کو سمجھا سکوں کہ ادبی روایتیں کس طرح بنتی ہیں، اس کا تسلسل کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔" (ذوقِ ادب اور شعور ص:22)

احتشام حسین کے مذکورۂ بالا ادبی وانتقادی اصول وتصور کا تفاعل ایک طرف جہاں ان کی شاعری اور افسانوں میں محسوس ہوتا ہے وہیں ان کی عملی تنقیدوں میں بھی نمایاں طور دیکھنے کو ملتا ہے، اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز میں احتشام حسین پر نیاز فتحپوری کے رومانی اسلوب کا اثر رہا، اس کا اعتراف خود انھوں نے 'ویرانے' (1943) کے 'دیباچے' اور اپنے ایک مضمون 'نیاز فتحپوری چند تاثرات' (مشمولہ: 'اعتبار نظر') میں کیا ہے، مگر ترقی پسند تحریک کی عمل آوری کے ساتھ ہی وہ نیاز فتحپوری کے رومانی سحر سے نکل کر اس تحریک کی 'حقیقت نگاری' کے حلقۂ اثر میں آگئے اور پھر تاحینِ حیات 'ترقی پسند' ادب اور تنقید کو پروان چڑھاتے رہے، اس اجتہادی مہم میں وہ 'جدیدیت' کے مؤیدین ومبلغین سے کہیں زیادہ کامیاب ہوئے، احتشام حسین کی ادبی وانتقادی بصیرت سے ترقی پسند ادبا وناقدین ہی نہیں 'مابعد جدیدیت' کے علمبردار بعض ناقدین بھی استفادہ کرتے اور اس استفادہ واثر پذیری کا کھلے دل سے اعتراف بھی کرتے ہیں۔

احتشام حسین کے تصنیفی وتنقیدی کاموں کی شروعات' ترقی پسند تحریک کی ابتدا کے ساتھ ہی ہوئی۔ انھوں نے اپنے آغاز کار ہی سے اس تحریک کے مضمرات ومبادیات کو سمجھنے اور سمجھانے کی ناقدانہ سعی کی، انھوں نے اپنے اصولی ونظریاتی مضامین ومقالات کے ذریعے 'مارکسزم' اور 'ترقی پسندی' کی معقول ومعروضی صورت وکیفیت ظاہر کی وہیں اشتراکی حقیقت نگاری کے ادبی نقطۂ نظر کی روشنی میں اپنے قدیم اور عصری ادبیات کی تفہیم وتعبیر میں کوشاں رہے، احتشام حسین نے 'مارکسزم' کے تصورات کو صرف سماجی اور ادبی سطح پر ہی قبول کیا اس کے 'سیاسی' رنگ ورویہ سے وہ بڑی حد تک محفوظ رہے چنانچہ ان کے ادبی وانتقادی سرمایے میں احساس وتفکر کی سطح پر وہ جذباتیت، ادعائیت، فحاشی، انتہا پسندی، ابتذال واشتعال، اور مذہب بیزاری جیسی قباحتوں کے لیے کبھی گنجائش نہیں نکل سکی، چنانچہ پروفیسر شمیم حنفی (جو کہ احتشام صاحب کے شاگرد رشید بھی ہیں) نے احتشام حسین کی صالح وسالم ترقی پسندی کی نشاندہی کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ:

"احتشام حسین ادبی ترقی پسندی کے علاوہ جمالیاتی مادیت اور کمیونسٹ انقلاب سے بھی متاثر تھے، مگر تاریخ کے عمل سے آگہی نے انھیں اپنی روایت کے تسلسل کا، اور فلسفہ، نفسیات، مذہبیات کی بخشی ہوئی بصریت نے انھیں انسانی تجربوں کی ہمہ جہت سچائی کا ایک ایسا شعور عطا کیا تھا جس میں فیشن ایبل اور مقبولِ عام قسم کی ترقی پسندی کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسعت تھی، غالی ترقی پسند آج کی طرح اس زمانے میں بھی دو اور دو چار قسم کی باتیں کرنے کے عادی تھے اور سماجی زندگی کے عام معیاروں کی طرح ادب کی معیار بندی کے معاملے میں بھی خاصے سادہ لوح تھے"۔ (بحوالہ، احتشام حسین: مرتب: پروفیسر نذیر احمد، ص:30، اشاعت 1917 ناشر، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی)۔

احتشام حسین نقاد سے پہلے ایک تخلیق کار تھے، انھوں نے 'فن تنقید' کو نہیں اپنایا ہوتا تو یقیناً وہ اچھے افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے ادبی تاریخ میں اپنا مقام محفوظ کرنے میں کامیاب رہتے، ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ویرانے' 1943 کو اور تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ 'تنقیدی جائزے' 1944 کو اشاعت پذیر ہوا، لہٰذا اس سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ احتشام حسین کی نگاہ میں تخلیقی کارگزاری تنقیدی کاوشات سے زیادہ وقیع ہے، یوں بھی تحقیق وتنقید ہمیشہ تخلیق کے پیچھے رہی ہے، البتہ انگریزی میں زیادہ دستگاہ رکھنے والے بعض ادبا وناقدین اردو کے سادہ لوح اہالی قلم پر اپنی ناقدانہ حیثیت کا رعب دکھاتے رہتے ہیں اور بعضوں کو ناقدوں سے مرعوب ہونے یا رہنے کی عادت بھی ہوتی ہے، جس سے نقادوں کا حوصلہ (یا غلط فہمی) بڑھتی رہتی ہے اور ایسے نقاد ہی 'تخلیق' پر 'تنقید' کو حاوی کرنے کی تدابیر کرتے ہیں، یہ رجحان عصری تنقید میں زیادہ نمایاں ہے، جن قارئین اور ناقدین نے احتشام حسین کی تنقیدی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا ہے، اور جنھوں نے مختلف ادبا وشعرا کی تصانیف پر احتشام صاحب کے لکھے ہوئے دیباچے یا مقدمے وغیرہ پڑھے ہیں وہ محسوس کریں گے کہ احتشام حسین کا تخلیق اور تخلیق کار کے ساتھ ہمیشہ ہی مخلصانہ وہمدردانہ رویہ رہا ہے۔

احتشام حسین تقریباً 35 برسوں تک اردو تنقید کے منظر نامے پر اپنی موثر اور نمایاں موجودگی کا احساس دلاتے رہے، شروع کے برسوں میں انھوں نے نظریاتی تنقید پر زیادہ لکھا جبکہ آخر کے دو، دہوں میں ان کی توجہ عملی تنقید پر مرکوز رہی۔ نظریاتی تنقید پر ان کے یہاں 'مارکسزم' کا اثر نمایاں رہتا ہے مگر عملی تنقیدوں میں اعتدال، توازن، ادبیت اور امتزاج وجامعیت نظر آتی ہے، یہی سبب ہے کہ انھوں نے ترقی پسند ادبا وشعرا کے علاوہ قدیم، کلاسیکی اور رومانی ادیبوں اور شاعروں مثلاً انیس، غالب، اقبال، حالی، جوش، جگر، فانی، نیاز فتحپوری، مجاز، حسرت موہانی، اختر شیرانی وغیرہ پر نظریاتی سطح سے بلند ہوکر تنقیدی مضامین لکھے ہیں، احتشام حسین نے بیشتر مروجہ ادبی اصناف (نثر ونظم) غزل، نظم، مثنوی، افسانہ، ناول، ڈرامہ، سوانح نگاری پر اپنے جو تنقیدی مطالعات پیش کیے ہیں وہ بڑی حد تک معروضی اندازِ نظر کے مظہر ہیں۔

■

Mr. Mohd. Shahid Pathan, Bhasha Vidyapith,
Mahatma Gandhi International Hindi University,
Gandhi Hill, Wardha, (MS)
Mob: 09372843907

حدیث انصاری

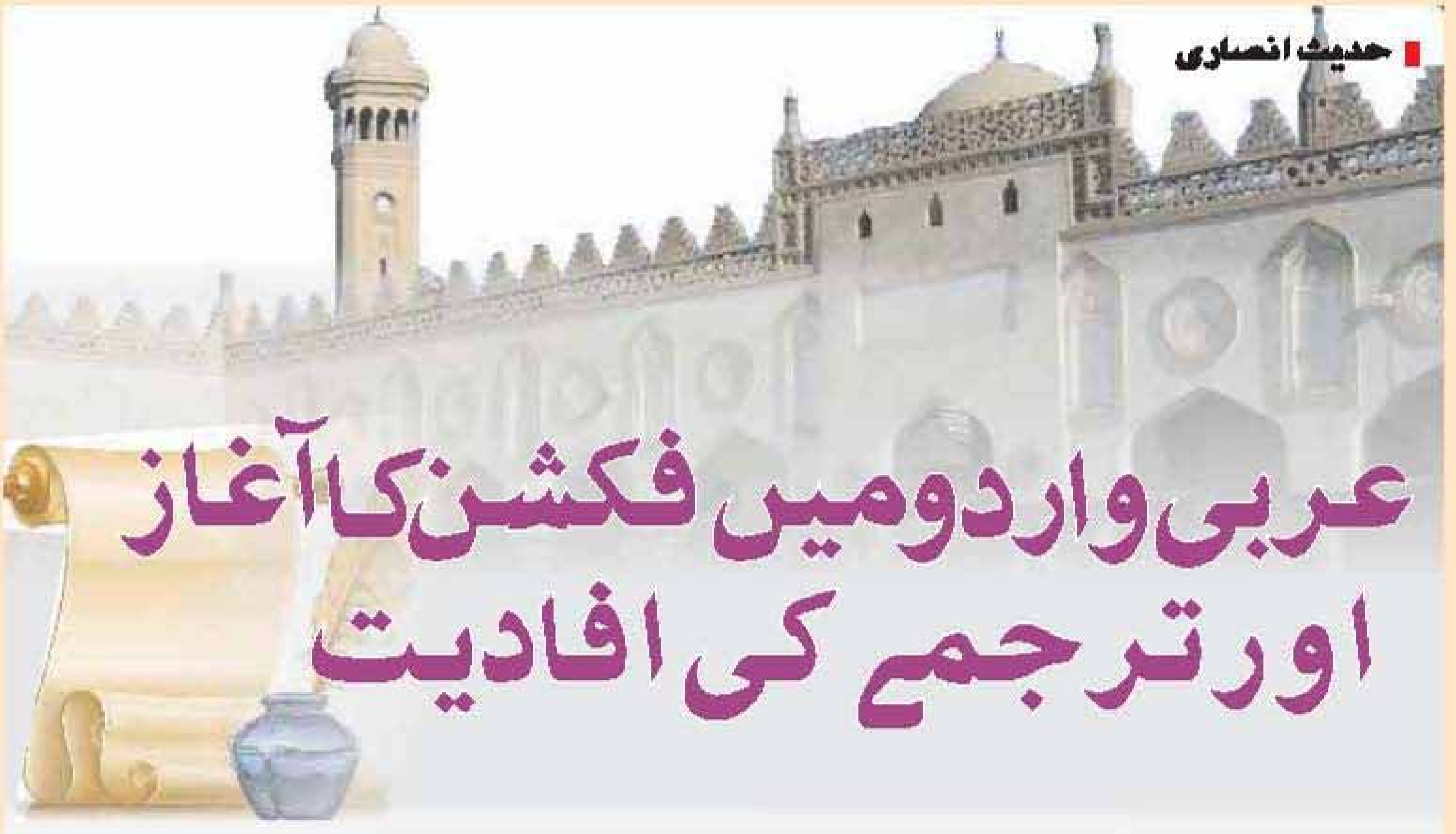

عربی و اردو میں فکشن کا آغاز اور ترجمے کی افادیت

بعثت محمدؐ سے پہلے عربی ادب بھی مافوق الفطرت واقعات، عشقیہ، جنگی قصص اور قصائد پر مبنی تھا جو صرف تفنن طبع کا سامان بہم پہنچاتا تھا اور زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرنے سے قاصر تھا۔ قرآن کریم اور نبیؐ کی اخلاقی و معاشرتی تعلیمات سے نیا اسلامی ادب وجود میں آیا۔ اس نے عربی ادب کو یکسر بدل دیا۔ زندگی اور معاشرے کو صالح فکر و شعور کی حرارت اور جوشِ عمل کا جذبہ عطا کیا۔ قرآن میں قدیم اقوام اور انبیاء کے واقعات کو قصص کے جس انداز میں عبرت اور نصیحت کے لیے بیان کیا گیا اس میں نفس مضمون اور طرز بیان کی جامعیت اور اختصار کی دلکشی عدیم المثال ہے۔ قرآن نے ماضی کی اقوام کے قصص کو جس طرز پر پیش کیا اس وقت تک دنیا کا نثری ادب اس طرز سے غافل تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد انھیں قصص کے طرز بیان سے متاثر ہو کر مغربی اقوام نے ناول اور افسانے کی نثری اصناف کو وجود بخشا۔ یہ عربی ادب کا مغربی ادب پر اثر کا نتیجہ تھا۔ یہ عمل بھی ترجمے کے استفادے سے ممکن ہوا۔ مغربی ادیبوں کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عربی ادب سے استفادہ تو کیا لیکن اپنی ریاضت اور تجربے سے اس میں اضافہ بھی کیا اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے موجودہ ناول اور افسانہ اپنے تمام تر عناصر اور صفات کے ساتھ عربی ادب کو لوٹایا۔ صرف عربی ہی نہیں بلکہ اردو اور دنیا کی دیگر زبانوں میں ناول اور افسانے کی اصناف مغربی ادب کے اثر سے وجود میں آئی ہیں۔

تاریخی اعتبار سے عباسی دورِ حکومت کو علم و ادب کے فروغ کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے۔ قدیم عربی ادب میں قصہ گوئی کا فن اسی دور میں جدت سے آشنا ہوا۔ عبداللہ ابن مقفع اس دور کا مشہور عربی ادیب تھا۔ اسے عربی اور فارسی دونوں زبان و ادب پر کامل دست رس حاصل تھی۔ اس نے فارسی کی کہانیوں کا شاندار عربی میں ترجمہ کیا جو 'کلیلہ و دمنہ' کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی دور کا مشہور ادیب ابن الفارس ہے۔

اس کی مشہور زمانہ کتاب 'مقامہ' ہے۔ اس کی کہانیوں کو موجودہ افسانے کی عمدہ ابتدائی شکل کا نام دے سکتے ہیں۔ ہمدانی اور حریری بھی اسی دور کے ادبا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی تحریریں بھی مثالی درجہ رکھتی ہیں۔ یہ تمام تر تحریریں زبان کے لحاظ سے فصاحت و بلاغت لغت و معانی کا ایک مرقع کہی جاسکتی ہیں جس میں الفاظ کی شیرینی، مسجع، مقفیٰ عبارتوں کی تراکیب محض عوام کی ذہنی تسلی اور لغوی تعلیم کا سامان تھیں۔ یہ قصے کہانیاں پلاٹ کے لحاظ سے نہ تو عوامی زندگی سے مربوط ہوا کرتے تھے نہ ان میں روزمرہ کے معمولات کی عکاسی پائی جاتی ہے۔

عربی قصہ گوئی کا دوسرا دور جس میں قصہ عنترہ، ہلالیہ، بیبرس، اور فیروز شاہ، کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اسی دور میں الف لیلیٰ کا عربی ترجمہ ہوا۔ کچھ نئے طبع زاد قصے علی زیبق اور احمد دنف لکھے گئے۔ لیکن یہ تمام تر قصص بھی ماضی کی منقش روایتی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں۔ یہ رنگ و اثر ایک طویل عرصے تک قائم رہا۔ یہ قصص بھی زندگی اور سماج میں جوش عمل کا جذبہ پیدا کرنے سے یکسر خالی تھے۔ انھیں ایام میں 1798 میں مصر پر نپولین کا حملہ ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب مصری عوام یورپی اقوام اور ان کی تہذیب سے قریب ہوئے اور یورپ کے جدید علم و فن اور طرز تعلیم سے متعارف ہوئے۔ اس کے بعد مصر میں علم و فن کو فروغ دینے میں ترکی حکمراں محمد علی کی خدمات بھی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اس کے دور حکومت (1803 سے 1849) میں کیا شہر، کیا دیہات، مصر کا ہر خطہ جدید علوم و فنون سے جگمگا اٹھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مصری طلبا کا وفد بیرون ملک جانے لگا۔ مصر میں نئی تعلیمی بیداری نے کروٹ لی اور مصری ادیب ادب کے میدان میں نئے گوشے تلاش کرنے لگے۔ حصول تعلیم کے سلسلے میں طلبہ کا پہلا وفد جو مصر سے فرانس گیا۔ اس میں مصری ادیب فلاح رافع رفاعہ طہطاوی بھی شامل تھے۔

ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت جامعہ ازہر میں ہوئی تھی۔ فرانس سے واپسی کے بعد طہطاوی نے مصر میں طریقہ تعلیم کی نئی تنظیم پر زور دیا۔ طہطاوی نے 1871 میں یونانی قصہ 'مغامرات تیلیماک' کا 'مواقع الافلاک فی اخبار تلیماک' کے نام سے ترجمہ کیا۔ چند خامیوں کے باوجود اسے عربی ناول کا پیش خیمہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہیں سے مغربی ناولوں کو عربی میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ تراجم میں مصری ماحول اور حالات کو ڈھالنا اولین مقصد بن گیا۔ ترجمے کے ذریعے عربی زبان میں مصری ماحول کو ڈھالنے کی جن لوگوں نے خدمات انجام دیں ان میں محمد عثمان جلال، مارون نقاش، فرح انطون، نجیب حداد وغیرہ کے نام غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس دور کے مصری ناولوں میں 'زینب' کو جو ادبی وقار ملا وہ دوسرے ناولوں کو نہیں مل سکا۔ محمد حسین ہیکل کا ناول 'زینب' 1914 میں منظر عام پر آیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 1929 میں آیا۔ اس ناول کے متعلق عبدالحسن طٰہٰ بدر کا خیال ہے کہ یہ ناول فرانسیسی ادیب ژاک روسو کے ناولوں سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ناول مصر کی دیہاتی زندگی کے خدوخال کو پیش کرنے والا اولین ناول ہے۔ اس طرح فرانسیسی ادب اور انگریزی ادب سے استفادے کی ہوڑ لگ گئی۔ جرجی زیدان، مصطفےٰ لطفی المنفلوطی، فرید ابوحدید، محمود تیمور، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ابراہیم عبدالقادر المازنی، عباس محمود العقاد، احسان عبدالقدوس اور 1952 کے انقلاب کے بعد نجیب محفوظ، یوسف السباعی، محمد عبدالحلیم عبداللہ، توفیق الحکیم وغیرہ ادیبوں نے عربی ادب کو نئے فکر و شعور اور نئے طرز اسلوب سے آشنا کیا۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عربی زبان کا جدید ادبی سرمایہ جو آج ہمیں ناول، افسانے، اور خودنوشت کی صورت میں نظر آتا ہے اس کا بنیادی ماخذ فرانسیسی اور انگریزی ادب ہے۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کو انقلاب کی صدی کہا جائے تو بجا ہوگا۔ یہ ہر دو صدی علمی، تہذیبی اور سیاسی انقلاب کی صدی ہے۔ یہ صدی یورپی اقوام کے عروج کی صدی ہے۔ یورپی اقوام کے علم و ہنر کی بالادستی کی صدی ہے۔ ان کے جدید علمی اور ادبی تجربات کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

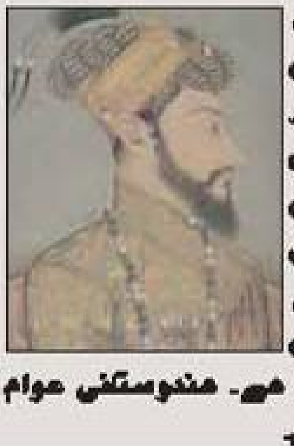

بری اور بحری راستے سے ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی اقوام برصغیر ہند کی سرزمین پر اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہی آچکی تھیں۔ آخری کامیابی انگریزی اقوام کے ہاتھ آئی۔ 1857 میں مغل سلطنت کا آخری چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوجاتا ہے اور حکومت کی زمام انگریزوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ ہندوستانی عوام غلامی کی چکی میں پسنے لگتے ہیں۔

افادہ اور استفادہ کے اس تاریخی سلسلے میں اردو زبان و ادب کا سرمایہ بھی کچھ اسی طرح ترتیب پایا ہے۔ بری اور بحری راستے سے ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی اقوام برصغیر ہند کی سرزمین پر اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہی آ چکی تھیں۔ آخری کامیابی انگریزی اقوام کے ہاتھ آئی۔ 1857 میں مغل سلطنت کا آخری چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جاتا ہے اور حکومت کی زمام انگریزوں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ ہندوستانی عوام غلامی کی چکی میں پسنے لگتے ہیں۔ انھیں ایام میں سرسید احمد خاں اپنے فکر و شعور اور رفقا کے ساتھ منتشر ہندی عوام کی رگوں میں حرارت اور جوش عمل کا دیا لہو دوڑانے کے لیے عملی کوششیں شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں نوے سال بعد برصغیر ہند کو آزادی اور خودمختاری پھر حاصل ہوئی لیکن تقسیم ہند و پاک کی صورت میں۔

1857 سے 1947 کے درمیانی عرصے میں اردو زبان و ادب نے جو انقلابی تبدیلیاں اور ترقی کی منزلیں طے کی ہیں، وہ ادبی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ ہند کی سرزمین پر مسلمانوں کی آمد 6ھ سے شروع ہو جاتی ہے لیکن یہ آمد ایک طویل عرصے تک تبلیغ دین اور تجارت تک محدود رہی۔ اسلام کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم سے یہاں کی فضا ہموار ہوتی رہی۔ اس سرزمین کو علمی، تہذیبی، تمدنی، ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی استحکام شرقی سلطنت، لودی حکومت اور تیموری حکومت کے زیر سایہ ملا۔ ان حکمراں طبقے کی زبان ترکی، عربی اور فارسی تھی۔ کیونکہ ان کا تعلق انھیں علاقوں سے تھا جہاں یہ زبانیں اپنے عروج و کمال کا سکہ رائج کر چکی تھیں۔ اس طرح عربی، فارسی اور ترکی کا اثر دربار سے لے کر عوام و خواص تک رہا اور یہ حقیقت ہے کہ اکبر کے عہد حکومت کے بعد تک عربی اور فارسی کا ہی غلبہ رہا۔ یہاں کی عوام اور حکمراں اور ان کے لشکری میل جول سے اردو وجود میں آئی اور تناور درخت بن گئی۔ اردو کی آبیاری اور پرورش عربی اور فارسی کے زیر سایہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو نے ادبی سطح پر جو پہلا اثر قبول کیا وہ انھیں کا اثر ہے۔ اس میں بھی عربی کے مقابلے میں فارسی کا اثر زیادہ ہے۔ عربی سے استفادے کا دائرہ مذہبی نوعیت کا ہے اور یہ جامع اور وسیع پیمانے پر ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، فلسفہ، تصوف، منطق اور دیگر دینی علوم و فنون کا عربی سے ترجمہ جس قدر وسیع پیمانے پر اردو میں ہوا ہے شاید ہی کوئی دوسری زبان اس کے مقابل آئے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ عربی ادب سے ترجمہ اور استفادہ فارسی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

جس طرح مصر پر 1798 میں نپولین کے حملے سے قبل عربی ادب اپنے ماضی کے روایتی نقش قدم پر ہی چل رہا تھا لیکن اس کے حملے کے بعد یورپی اقوام کے میل جول سے عربی ادب میں جدید رجحانات پیدا ہوئے۔ ٹھیک اسی طرح اردو ادب بھی 1857 سے قبل ماضی کے روایتی حصار میں پڑا ہوا تھا۔ اردو ادب میں بھی نئے رجحانات، تجربات اور طبع آزمائی کا آغاز 1857 کے بعد انگریزی اور فرانسیسی ادب کے مطالعے اور ترجمے سے ہوا

ہے۔ جس طرح ناول اور افسانے کی صنف عربی میں فرانسیسی اور انگریزی ادب کے ترجمے اور مطالعے سے آئی ہے اسی طرح اردو میں بھی ناول اور افسانے کی صنف انھیں حتیٰ کہ یورپی ادب سے قربت کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔ اس کی پہلی مثال میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'مرآۃ العروس' 1869 کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ نذیر احمد کی ذہنی اور علمی تربیت دلی کالج کی ہے۔ دلی میں اس

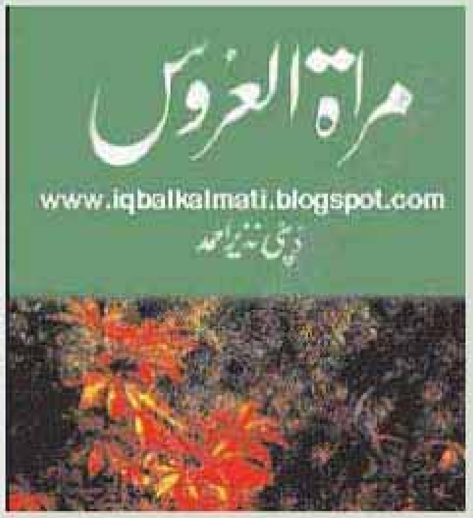

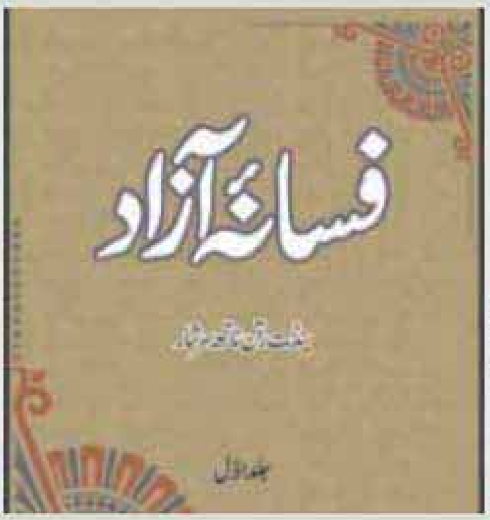

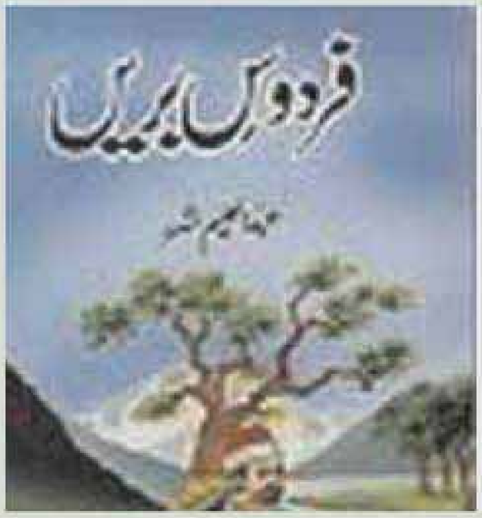

کالج کا قیام ہندوستانیوں میں انگریزی فکر و شعور کو پروان چڑھانے کی غرض سے ہوا تھا۔ اردو کا دوسرا ناول پنڈت رتن ناتھ سرشار کا 'فسانۂ آزاد' 1880 ہے اور تیسرا ناول عبدالحلیم شرر کا 'ملک العزیز ورجینا' 1888 ہے۔ والٹر اسکاٹ نے مسلمانوں کے خلاف جو تعصب اپنے ناولوں میں برتا تھا عبدالحلیم شرر نے اسے شدت سے محسوس کیا اور اس کے جواب میں 'ملک العزیز ورجینا' لکھا۔ اردو کے یہ تمام ناول کسی نہ کسی صورت میں انگریزی ناولوں سے متاثر ہیں۔ اردو ناول نگاری میں ایک شعوری تبدیلی پہلی جنگ عظیم کے بعد نظر آتی ہے۔ اور دوسری فکری تبدیلی دوسری جنگ عظیم اور تقسیم ہند کے بعد کی ہے۔ اس عہد میں بھی اردو ناول اور افسانے میں انگریزی اور فرانسیسی ادب کے ترجمے کے ذریعے خوب خوب استفادہ کیا گیا۔

اردو زبان و ادب 1857 سے قبل ہی یورپی حکمراں، ادبا اور عوام کا محبوب نظر بن چکا تھا۔ انتظامی امور کو انجام دینے کے لیے اس وقت یورپی اقوام میں اردو تدریس کا لازمی حصہ بن چکی تھی۔ کسی حد تک لسانی اور ادبی سطح پر آج بھی وہ رشتہ قائم ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے وہ ممالک جہاں عربی ملکی اور قومی زبان ہے اردو کا ان سے وجودی رشتہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے موقعے پر ہندوستانی فوجوں کے مصر میں قیام کے دوران یہ رشتہ اور مضبوط ہو گیا۔ اس کا براہ راست اثر یہ ہوا کہ اردو زبان ایک ادبی، علمی اور ثقافتی زبان کی حیثیت سے جنگ کے زمانے میں ہی 7 مارچ 1939 کو شاہی فرمان کے ذریعے قاہرہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کردی گئی اور اولا پروفیسر حسن الاعظمی کو اس کی تدریس کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد دنیا کی سب سے قدیم یونیورسٹی جامعہ ازہر نے 1979 میں فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ ٹرانسلیشن (Faculty of Languages and Translation) میں الگ سے شعبۂ اردو قائم کیا۔ جامعہ ازہر میں اس شعبے کے تحت اردو ادب کے معیاری سرمائے کو عربی میں ترجمے کے ذریعے منتقل کرنے کا کام چل رہا ہے۔ یہاں پر عین شمس یونیورسٹی اور اسکندریہ یونیورسٹی میں بھی شعبۂ اردو قائم ہے اور ڈاکٹریٹ تک کی اعلیٰ تعلیم دی جارہی ہے۔ ان یونیورسٹیز میں اردو پڑھنے والے مصری طلبا کی سالانہ تعداد تقریباً سو ہوتی ہے۔ یہ تعداد کسی زبان کو سیکھنے کے لیے طلبا کی ایک معیاری تعداد مانی جاتی ہے۔

مصری طلبا اور اسکالروں نے عربی میں بہت سی اردو کتابوں، نظموں، ناولوں اور افسانوں کا ترجمہ کیا ہے۔ مثلاً علامہ اقبال کی تخلیقات کے تراجم کے علاوہ جلال نے حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' اور شبلی کی 'سیرت النعمان' 'عجائب القصص' اور سودا کے بہت سے قصیدے اور خواجہ میر درد کے دیوان کا عربی میں ترجمے ہوئے۔ اسی طرح اردو ادب کے سرمائے کو مختلف موضوعات کے تحت عربی مقالے کی صورت میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تحریری کوششوں نے ان ہر دو زبانوں کو ادبی سطح پر ایک دوسرے کے قریب ہونے اور استفادہ کرنے کے مواقع وسیع اور عام کردیے ہیں اور یہ دونوں زبانوں کے مشترکہ فروغ کے روشن مستقبل کا اشاریہ ہے۔

ادھر ادبی سطح پر ترجمے کے ضمن میں ہندوستانی یونیورسٹیز کے شعبۂ عربی کی توجہ اور کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کی رفتار کم ہے لیکن مستقبل میں آہستہ آہستہ اس سرمائے میں اضافے کے امکانات کی گنجائش زیادہ ہے کیونکہ ان سے وابستہ اساتذہ اور طلبا کا تعلق بنیادی طور پر ہندوستان کے معروف عربی مدارس سے ہے اور آج بھی یہ مدارس خاموشی سے عربی زبان کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان میں طلبا کی تعداد اطمینان بخش ہے۔ یونیورسٹیز میں شعبۂ عربی کا وجود انھیں مدارس کے طلبا سے باقی ہے اور یہ خوش آئند بات ہے کہ یہی طلبا اور اساتذہ جدید عربی زبان و ادب کی شمع کو فروزاں کیے ہوئے ہیں۔ تحقیق، تدوین اور تالیف بھی انھیں کے قلم سے خال خال وجود میں آرہے ہیں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ عربی پروفیسر بدرالدین الحافظ کی کتاب 'چند مصری ناول اور افسانے'، 'توفیق الحکیم، ناول نگاری کا ایک جائزہ' مصری فکر و شعور اور طرز اسلوب کو اردو میں متعارف کرانے میں اہم رول ادا کررہی ہیں۔ اسی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے استاد ڈاکٹر ضیاء الحسن نے چند عربی افسانوں کا اردو ترجمہ 'سرخ کتاب' کے نام سے کیا ہے۔ لیکن اس میدان میں مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

اس مختصر سے تاریخی جائزے کے پس منظر میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عربی اور اردو کا نثری ادب خاص کر ناول اور افسانہ کم و بیش ایک ہی عہد میں مغربی ادب سے متاثر ہوئے اور دونوں میں ابتدائی طبع آزمائی ترجمے کے زیر سایہ ہی پروان چڑھی ہے۔

■

Dr. Hadees Ansari L: 1-4, Staff Quaters, University Campus, Mohan Lal Shkhadia University, Udaipur - 313001 (Raj)

ادبی تحقیق میں خاکۂ تحقیق کی اہمیت

اقبال النسا

ادبی تحقیق کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ زبان و ادب کے کسی مسئلے کے حل، کسی سوال کے جواب کی تلاش، یا حقائق کی بازیافت کے لیے ایک متعین طریقۂ کار پر عمل کیا جائے۔ ادبی تحقیق کسی الجھاؤ کو سلجھانے کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ کسی رائج نظریے یا عام طور پر تسلیم شدہ روایت یا مقبول عام تصور کی اصلیت سے آگاہی حاصل کی جائے۔ ادبی تحقیق کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کسی ادبی یا لسانی نکتے کے جملہ پہلوؤں سے تشفی بخش آگاہی حاصل نہیں ہے تو اس آگاہی کے حصول کی کوشش کی جائے تاکہ وہ نکتہ پوری طرح روشن ہو جائے۔

ادبی تحقیق کے ان مقاصد کے حصول کے لیے ایک ایسے مخصوص لائحۂ عمل کی تیاری ناگزیر ہے جس پر قدم بہ قدم اور مرحلہ بہ مرحلہ اقدام کے ذریعے توجہ طلب مسئلے کے حل تک نتیجہ خیز رسائی حاصل کی جا سکے۔

ادبی تحقیق میں اس لائحۂ عمل کو خاکہ یا انگریزی میں Synopsis کہا جاتا ہے۔ فن تحقیق کی کتابوں بشمول پروفیسر گیان چند کی مشہور کتاب تحقیق کا فن میں بھی یہی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ میری ناقص رائے میں "خاکۂ تحقیق" کی اصطلاح Synopsis کے مفہوم کو بہتر طور پر ادا کر سکتی ہے۔ میں اس مقالے میں اسی اصطلاح کا استعمال کروں گی۔

خاکۂ تحقیق کی مثال سڑک پر لگے ہوئے ان سنگ ہائے میل سے دی جا سکتی ہے جو مرحلہ بہ مرحلہ مسافر کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے منزل مقصود پر پہنچانے میں مدد کرتے ہیں۔ اگر یہ سنگ میل نہ ہوں تو مسافر راستہ کھو سکتا ہے یا پھر بھٹکتا ہوا غیر ضروری مسافت طے کر کے منزل تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح ادبی تحقیق میں خاکۂ تحقیق، محقق کو اس کے تحقیقی سفر میں متعین راستے پر چلتے رہنے میں رہنمائی فراہم کرتا رہتا ہے۔ خاکۂ تحقیق کی تیاری کے بغیر شروع کیا ہوا تحقیقی کام انتشار، بدنظمی اور بے ترتیبی کا شکار ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی محقق اسے ادھورا ہی چھوڑ بیٹھتا ہے۔

خاکے کی قسمیں

خاکۂ تحقیق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ موضوع تحقیق کے تعین کے بعد باقاعدہ کام شروع کرنے سے پہلے محقق، تحقیق کی منصوبہ بندی کے جو خطوط متعین کرتا ہے انھیں تو وہ مقالے کا خاکۂ تحقیق یعنی Synopsis کہا جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں کی سندی تحقیق میں، تحقیقی مقالے کی تکمیل کے بعد اور امتحان سے پہلے تیار مقالے کا جو نچوڑ یونیورسٹی میں داخل کیا جاتا ہے، اسے بھی Synopsis ہی کہتے ہیں۔ تیار مقالے کے اس خلاصے یا Synopsis کو ہم خاکۂ تحقیق کے بجائے تلخیص مقالہ یا صرف تلخیص کا نام دیں گے۔ اس مقالے میں ہمارا سروکار تحقیق کا کام شروع کرنے سے پہلے تیار کیے جانے والے خاکۂ تحقیق یا Synopsis سے ہے۔

خاکۂ تحقیق کی تیاری

تحقیق کا موضوع طے ہو جانے کے بعد کام شروع کرنے سے پہلے خاکۂ تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے۔ محقق جب موضوع تحقیق کا انتخاب کرتا ہے تو اکثر اسے صرف موضوع کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسے موضوع تحقیق کے بارے میں تمام حقائق کا علم نہیں ہوتا۔ موضوع تحقیق کے بارے میں معلومات یکجا دستیاب نہیں ہوتیں یا بے حد بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ محقق اپنی تحقیق کے ذریعے ان بکھری ہوئی معلومات کو یکجا کرنے کے بعد اپنے نتائج پیش کرتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں محقق کو کام شروع کرنے کے لیے تحقیق کی منصوبہ بندی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی موقع ہے جس میں وہ خاکۂ تحقیق کی تیاری کی طرف مائل ہوتا ہے۔

اصولاً خاکۂ تحقیق کی تیاری محقق کو خود کرنی چاہیے۔ محقق نے جب موضوع تحقیق کا انتخاب کیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں اس کے میلان، اس کی پسند، تحقیق کے امکانات، مواد کی فراہمی کے وسائل اور اس جیسی بہت سی ضروری باتوں پر اس کی نظر ہوگی۔ یونیورسٹیوں میں اکثر، تحقیق کا نگراں، اپنی پسند کے موضوعات طالب علم کے سر تھوپ دیتا ہے اور اکثر موضوع کے بارے میں اسکالر کو تشفی بخش رہنمائی بھی فراہم نہیں کرتا۔ ایک عرصے تک اسکالر ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے اور کافی وقت گنوا کر موضوع تحقیق کو قابو میں لاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسکالر اور نگراں دونوں مل کر باہمی تبادلۂ خیال کے بعد خاکۂ تحقیق تیار کریں۔ خاکۂ تحقیق کی باہمی تیاری سے تحقیق کے کئی مقامات واضح ہو جاتے ہیں۔ اسکالر کو ایک پختہ لائحۂ عمل مل جاتا ہے۔ تحقیق کے راستے کے امکانات اور دشواریوں کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے اور ایک معین وقت کے اندر کام پورا کرنے کا پروگرام طے کرنے میں مدد بھی مل جاتی ہے۔

مصنف، معمار اور محقق

ایک اچھا مصنف بھی اپنی کتاب کی تیاری سے پہلے اسی طرح کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ کتاب کے مواد کو اپنے ذہن میں ترتیب دیتا ہے اور اسی ترتیب کے مطابق کتاب کے ابواب کی تقسیم کرتا ہے۔ کتاب کا سارا مواد اس کے ذہن میں یا وقتاً فوقتاً تیار کیے ہوئے شذرات کی شکل میں اس کے پاس موجود ہے۔ اسے باہر سے مواد حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پوری کتاب کا ایک واضح تصور اس کے ذہن میں موجود ہے۔ اسی تصور کے حساب سے وہ موجود مواد کو ترتیب دے کر اپنی کتاب کی تکمیل کر دیتا ہے۔

خاکۂ تحقیق کو اکثر مکان کی تعمیر سے پہلے اس کے نقشے کی تیاری سے بھی تشبیہ دی گئی ہے۔ معمار مکان بھی اپنے ذہن میں تیار مکان کا اسی طرح تصور رکھتا ہے جس طرح مصنف کے ذہن میں اس کی تیار کتاب کا تصور ہوتا ہے۔ مکان کے نقشے میں معمار ان تمام تفصیلات کو شامل کر لیتا ہے جو ایک مکمل مکان کی تیاری کے لیے ضروری

ہیں۔ مصنف کے مواد ہی کی طرح مکان کی تعمیر کا سارا مسالہ اس کے پاس موجود ہے۔ وہ مرحلہ بہ مرحلہ اس مسالے کا استعمال کرتے ہوئے مکان کی تعمیر مکمل کر لیتا ہے۔

لیکن مصنف اور معمار کے ساتھ محقق کی یہ مشابہت محض سطحی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مصنف اور معمار کی طرح تحقیق کا پورا مواد محقق کی دسترس میں نہیں ہوتا۔ محقق کو اپنا مواد کھوج کر نکالنا پڑتا ہے اور مواد ملتے ملتے ملتا ہے اور کبھی کبھی مواد کے حصول کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی ہے۔ مواد کی کھوج سے پہلے مقالے کی ترتیب و تکمیل کے بارے میں اس نے جو مفروضہ قائم کیا ہے، وہ حصولِ مواد کے بعد ثابت بھی ہو سکتا ہے اور پوری طرح منہدم بھی ہو سکتا ہے۔ مصنف اور معمار کی طرح، جن کے ذہن میں پورا نقشہ ہوتا ہے کہ کتاب یا مکان کی آخری شکل کیسی ہوگی، محقق، مواد کے مطالعے سے پہلے یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ مواد کے حصول کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ اسے پہلے سے قائم کیے ہوئے مفروضے سے جزوی یا کلی طور پر دستبردار ہونا پڑے۔

دوسرے الفاظ میں، محقق تحقیق سے پہلے جو خاکۂ تحقیق تیار کرتا ہے، وہ مصنف کے خاکے یا معمار کے نقشے کی طرح مستقل اور اٹل نہیں ہوتا بلکہ عارضی ہوتا ہے اور ترمیم و تبدیلی کی زد پر ہوتا ہے اور یہ ترمیم و تبدیلی ذاتی پسند و ناپسند یا شخصی ترجیحات پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ فراہم شدہ شہادتوں یا حقیقتوں پر منحصر ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ محقق نے تحقیق سے پہلے جو مفروضہ قائم کیا تھا، شہادتوں سے اس کی تصدیق نہ ہوتی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہادتیں اس کے قائم کردہ مفروضے کے عین خلاف ہوں۔ دونوں صورتوں میں محقق کو صرف اور صرف سچ کا علم بلند رکھنا پڑتا ہے۔ تحقیق میں جو سچ ہے، وہی حرفِ آخر ہے۔ اور جب سچ ثابت ہو جائے تو ہر طرح کے نظری موقف سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں تحقیق کا خاکہ کوئی اٹل منصوبہ نہیں ہوتا جس کی تکمیل کی ضمانت دی جا سکے۔ خاکۂ تحقیق دراصل راہروِ تحقیق کا سمت نما ہے جو کام کے آغاز کی راہوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ کوئی متعین یا صاف اور ہموار راہیں نہیں ہوتیں۔ ان راستوں کے جھاڑ جھنکاڑ کو چلتے چلتے صاف کرتے جانا بھی محقق کی ہی ذمے داری ہوتی ہے۔ چنانچہ تحقیق کی منزل کیا ہوگی، اس کا علم محقق کو اسی وقت ہوتا ہے جب وہ منزل پر پہنچ جائے۔

خاکۂ تحقیق کی اہمیت

اس موقعے پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خاکۂ تحقیق مستقل نہیں ہوتا تو اس کی ضرورت اور افادیت کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خاکۂ تحقیق کے بغیر محقق اپنے کام کا آغاز کر ہی نہیں سکتا۔ خاکہ مقالے کی مجموعی ہیئت کا ایک تصور فراہم کرتا ہے۔ خاکۂ تحقیق مجوزہ تحقیقی مقالے کی ترتیب کا اشاریہ اور مختلف ابواب کے درمیان ربط و تسلسل کی ابتدائی منصوبہ بندی کا نام ہے۔ خاکۂ تحقیق محقق کو یہ بھی بتاتا ہے کہ کام کی ابتدا کہاں سے کرنی چاہیے، اسے درجہ بہ درجہ کیسے آگے بڑھانا چاہیے اور اسے انجام تک کیسے پہنچانا چاہیے۔ دراصل خاکۂ تحقیق منصوبہ بند تحقیقی کام کو ایک ایسی ٹھوس بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر اعتماد کے ساتھ کام کا آغاز کیا جا سکے۔ لیکن یہ خیال ہمیشہ رہنا چاہیے کہ خاکۂ تحقیق نشانِ راہ ہے، منزل نہیں ہے۔ اگر محقق خاکۂ تحقیق کو مطلق سمجھ لے جس سے سرِ مو انحراف کی گنجائش نہیں تو اس کا تحقیقی کام شدید رکاوٹوں اور مشکلات سے دوچار ہوگا۔ خاکۂ تحقیق کو مطلق سمجھ بیٹھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ محقق حاصل شدہ شہادتوں کی ناقابلِ قبول تاویلوں کے ذریعے غلط ترجمانی پر مجبور ہو جائے گا۔ چونکہ سچ پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا، اس لیے اس کے کام کی وقعت متاثر ہوگی۔ بنیادی اہمیت مقالے کی ہے اور خاکۂ تحقیق کو اس بنیادی کام کے لیے مددگار اور معاون ہونا چاہیے۔ خاکے کا ترمیم و تبدیلی کی زد پر ہونے کا یہی مطلب ہے کہ اس میں ایسی لچک ہونی چاہیے کہ محقق ضرورت کے مطابق اجزائے خاکہ کو نکال دینے یا ان میں اضافہ کرنے یا ان کو نئی ترتیب دینے میں آزاد ہو۔ تحقیق کے دوران محقق کو متوقع مواد حاصل ہوتا رہے تو خاکۂ تحقیق سے انحراف کیے بغیر ابواب و عنوانات کے مطابق مقالہ تیار ہو جائے گا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ محقق کو ایسا مواد دستیاب ہو جائے جس کا اسے پہلے سے کوئی علم نہیں تھا لیکن اپنی اہمیت کے پیشِ نظر مقالے میں اس کی شمولیت ناگزیر ہو۔ ایسی صورت میں مقالے کی ہیئت اور محقق کے موقف کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ نتیجے میں خاکۂ تحقیق کو اس کی اولین شکل میں باقی رکھنا ممکن نہیں رہ جاتا۔ یعنی تحقیقی کام کی سمت و رفتار کی روشنی میں خاکۂ تحقیق میں ترمیم و تبدیلی کو مقالے کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش سے تعبیر کرنا چاہیے۔

بعض محققین کے خیال میں تحقیقی مقالے کے عنوانات کی فہرست ہی دراصل خاکۂ تحقیق ہے۔ پروفیسر گیان چند نے اپنی بے مثال کتاب 'تحقیق کا فن' میں مجوزہ تحقیقی مقالوں کی فہرست ہائے عنوانات کے نمونے شامل کیے ہیں جنھیں وہ خاکۂ تحقیق کا نام دیتے ہیں۔ میں پورے ادب کے ساتھ گیان چند کے موقف سے انحراف کی اجازت چاہوں گی۔ کسی تحقیقی مقالے کے ابواب و عنوانات کی فہرست اور خاکۂ تحقیق میں اصولی فرق ہے۔ خاکۂ تحقیق، کام شروع کرنے سے پہلے کی منصوبہ بندی ہے جب کہ فہرستِ ابواب و عنوانات مقالے کی تکمیل کے بعد تیار کی جاتی ہے۔ چونکہ مقالے کی تیاری کے دوران نئے مواد، انکشافات، نئی تعبیرات اور سوچے ہوئے نتائج سے الگ نتائج کا امکان رہتا ہے اس لیے مقالے کی تکمیل ہوتے ہوتے خاکۂ تحقیق کا ہو بہو قائم رہ جانا یقینی نہیں ہوتا اور اس طرح خاکۂ تحقیق اور تیار مقالے کی فہرستِ ابواب و عنوانات میں عدم مطابقت کے امکانات نکل آتے ہیں۔ تحقیق کے مراحل سے گزر کر جب مقالہ تیار ہو گیا تو مقالہ کے عنوانات کو مقالہ ہی سے برآمد کرنا چاہیے۔ مقالے کی تکمیل کے بعد خاکۂ تحقیق کا جواز باقی نہیں رہتا اور وہ اپنا مقصد پورا کر کے معدوم ہو جاتا ہے۔

خاکہ تحقیق کے نمونے

کیا یہ ممکن ہے کہ کسی ایسے خاکۂ تحقیق کے نمونے پر اتفاق ہو جو ادبی اور لسانی تحقیق کے ہر موضوع کے لیے کارآمد ہو سکے۔ ادبی اور لسانی تحقیق کے تنوع کو دیکھتے ہوئے، میرا خیال ہے کہ ایسے نمونے پر اتفاق ممکن نہیں۔ مثلاً کسی ادبی شخصیت کے حالات و خدمات پر مقالہ لکھا جا رہا ہے تو اس کے خاکۂ تحقیق کے تقاضے کچھ اور ہوں گے اور کسی ادبی تحریک پر مقالہ لکھا جا رہا ہو تو اس کے خاکۂ تحقیق کے تقاضے کچھ اور۔ کوئی ادبی دور زیرِ تحقیق ہو تو اس کا خاکۂ تحقیق الگ ترجیحات کا حامل ہوگا اور کوئی تقابلی نوعیت کی تحقیق ہوگی تو اس کے خاکۂ تحقیق میں مختلف طریقۂ کار کا استعمال ہوگا۔ سائنسی یا عمرانی علوم کے طریقہ ہائے تحقیق میں تحقیق کی بعض قماشیں تمام دنیا میں منظور کی گئی ہیں جیسے سوال نامہ، سروے وغیرہ جن کا اطلاق موضوعِ تحقیق سے قطع نظر، ایک ملتی جلتی صورتِ حال میں بلا تکلف کیا جاتا ہے۔ لیکن ادبی تحقیق میں آنکھ بند کر کے کسی مخصوص قماش پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔ کسی اجتماعی صورتِ حال میں بھی، ادب میں انفرادیت کا پلّہ عموماً بھاری رہتا ہے۔ اور انفرادیت اپنی جانچ کے پیمانے خود وضع کرتی ہے۔ اس طرح ادبی تحقیق میں بعض موضوعات جیسے، شخص کے حالات و خدمات کے خاکہ ہائے تحقیق میں ایک ظاہری مماثلت کے باوجود اندرونی نیرنگی ایک منفرد خاکۂ تحقیق کا تقاضا کرتی ہے۔

■

Dr. Iqbalun Nisa, Lectuer, Dept of Urdu, Social Science Block, Gnana Bharati, Bangalore University, Bengalore -560056 (Karnataka)

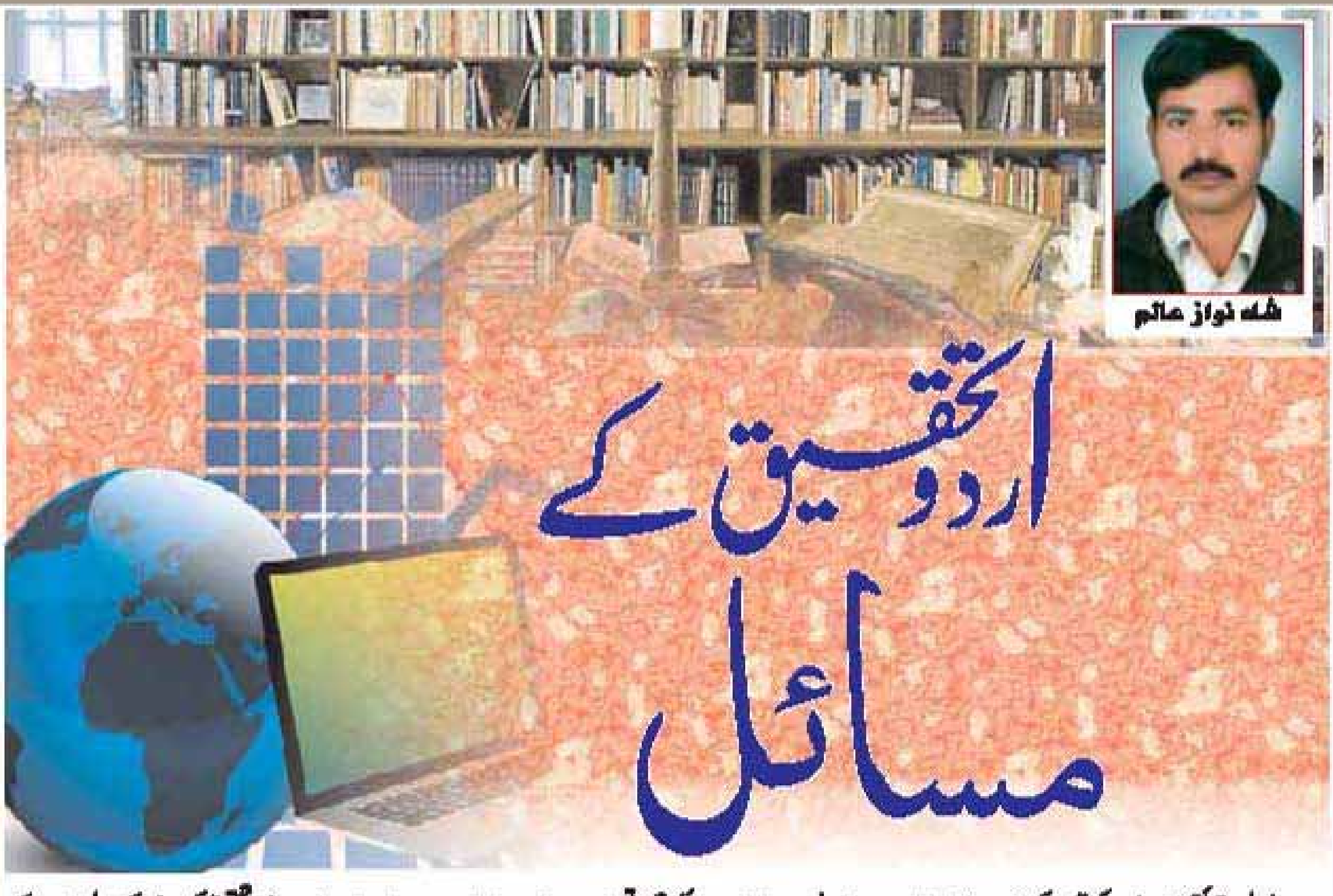

شاہ نواز عالم

اردو تحقیق کے مسائل

مسلمہ حقائق یا اصولوں کی تجدید کرنا اور نئے انداز سے پیش کرنا ہی تحقیق کہلاتا ہے۔ تحقیق کے لغوی معنی ہیں ''کسی شے کی حقیقت کا پتہ لگانا'' اور ادبی تحقیق کا مقصد بھی یہی ہے کہ حقائق کی بازیافت کی جائے، پوری صداقت کے ساتھ حقائق کا تعین کیا جائے اور اس سے جو نتیجہ نکلے وہی اصل تحقیق ہے۔

محقق کو کسی بھی چیز پر تحقیق کرنے سے پہلے موضوع کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور پھر اس عنوان کے تحت اس سے متعلق ذرائع/مصادر اور حقائق کی تلاش کی جاتی ہے۔ ان حقائق کی تلاش میں ہمیں بہت سے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ در در کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ اردو ادب میں تو ابتدا موضوع کے انتخاب سے ہی مسائل درپیش ہونے لگتے ہیں کیونکہ طالب علم کو فن تحقیق سے متعلق جانکاری نہیں ہوتی کیونکہ اردو میں انگریزی یا دوسری زبانوں کی طرح تحقیق سے متعلق کتابیں نہیں ہیں۔ انگریزی ادب میں تحقیق کرنے والوں کے لیے .Carter V. Good کی "The methedology of Educational Research" اور Dr. Hollis کی "Towards Improving P.hd Programm" جیسی کتابیں ہیں لیکن اردو ادب میں اس طرح کی کتابیں کم ہیں۔ گیان چند جین اور رشید حسن خاں کی کتابیں ہیں جو اصول سے زیادہ مسائل گناتی ہیں۔ ہمارے زبان وادب میں نہ تو قلپ ہیمر کی Guide to archives & menuscripts جیسی معلوماتی ہے نہ ہی ڈاؤن کی American Library Resources ہے اور نہ ہی آکسفورڈ کا Summary catalonge menuscripts ہے جس کے سہارے ہم آسانی سے مواد تک پہنچ سکیں۔ اردو تحقیق میں ہمیں ہر قدم پر مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ چند مسائل پیش خدمت ہیں:

(1) موضوع سے عدم مناسبت: کبھی کبھی غلطی سے یا کسی دباؤ یا تحریک کے زیر اثر محقق ایسے موضوع کا انتخاب کر لیتا ہے جس میں اس کا فکری میلان نہیں ہوتا اور وہ ذوق وشوق سے اس کام کو نہیں کر سکتا مثلاً ہمارے عصری جامعات میں اساتذہ کی طرف سے عنوان تھوپا جاتا ہے اور طالب علم کی دلچسپی کا خیال نہیں رکھا جاتا جس سے طالب علم کو آگے چل کر تحقیق کرنے میں دشواری ہوتی ہے اور وہ بیچ میں ہی تحقیق کا کام ترک کر دیتا ہے۔

(2) اردو کے علاوہ دیگر زبانوں سے ناواقفیت: کسی بھی زبان وادب میں تحقیق کرنے کے لیے اس زبان وادب کے علاوہ دیگر زبان وادب کی واقفیت ہونی چاہیے مثلاً انگریزی میں تحقیق کرنے کے لیے Latin سے واقفیت ضروری ہے، ہندی میں سنسکرت سے اور اردو ادب میں تحقیق کرنے کے لیے اردو کے علاوہ فارسی، عربی، ہندی، انگریزی سے واقف ہونا لازمی ہے کیونکہ ہمارے پرانے ادبی ذخیرے فارسی، عربی اور بعض دیوناگری رسم الخط میں ہیں۔

(3) لغات وقواعد سے ناواقفیت: تحقیق میں لغات وقواعد سے ناواقفیت کی بنا پر بھی مسائل درپیش ہوتے ہیں اس کے نہ جاننے سے ہمیں کسی متن کی صحیح تدوین وتحقیق متاثر ہوتی ہے اور تحقیق اثر انداز ہوتی ہے۔ لغات وقواعد زبان میں تغیر اور زبان میں مقامی بولیوں کے اثرات کو جاننے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے محقق کو اس سے پوری واقفیت ہونی چاہیے۔

(4) شاعری اور فن عروض سے ناواقفیت: جب محقق کسی شاعر یا شاعری کی کسی صنف پر تحقیق کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے فن عروض کا عمیق مطالعہ کرے کیونکہ عروض کے نہ جاننے سے اشعار کی صحیح وتدوین میں غلطی کا امکان بنا رہتا ہے۔

(5) طرز املا وتکوین خط سے ناواقفیت: تاریخ خط کی ناواقفیت سے بھی ہمیں تحقیق کرنے میں دشواری ہوتی ہے اور صحیح متن کی ہم تدوین نہیں کر سکتے۔ آج خط شکستہ نایاب ہے اس کے پڑھنے والے نہ کے برابر ہیں جس سے پرانے مخطوطے نہیں پڑھے جا سکتے اور

صحیح تحقیق نہیں ہو پا رہی ہے اس لیے ہمیں طرزِ املا اور تاریخِ خط سے واقفیت لازمی ہے۔

(6) **سیاسی تاریخ سے ناواقفیت**: اردو ادب یا کسی دوسری زبان وادب میں تحقیق کرنے کے لیے تاریخ کا جاننا لازمی ہے کیونکہ شاعر یا ادیب اپنے دور سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی تخلیق کے پس منظر میں اس زمانے کے واقعات پنہاں ہوتے ہیں مثلاً میر کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں اس کی تشریح بغیر سیاسی تاریخ جانے ممکن نہیں۔ شعر:

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اگر ہمیں ترقی پسند تحریک کے دور کی کسی تخلیق پر تحقیق کرنی ہے تو ہمیں اس تحریک سے متعلق تمام چیزوں کو نظر میں رکھنا ہوگا۔ تبھی ہم تحقیق کا حق ادا کر پائیں گے۔

(7) **مذہبی یا سیاسی وابستگی کی بنا پر پیدا شدہ عقیدت**: جب ہم کسی ایسے شاعر یا ادیب پر تحقیق کا کام شروع کرتے ہیں تو ہمیں مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے علامہ اقبال پر تحقیق کرنے والوں کو ایک پریشانی یہ آتی ہے کہ ایک بڑا طبقہ ان سے اندھی عقیدت رکھتا ہے اور علامہ اقبال کو شاعر کم پیغمبر زیادہ تصور کرتا ہے۔ جس سے صحیح تحقیق میں اڑچن آتی ہے۔ کبیر، نانک یا کوئی صوفی جو ساتھ میں شاعر بھی ہو، ان کے بارے میں کچھ غلط صحیح روایت مشہور ہو جاتی ہے جس سے محقق کو پریشانی ہوتی ہے مثلاً کبیر کی پیدائش یا موت کے سلسلے میں یا سرمد کی شہادت کے سلسلے میں، یا کسی صوفی کی کرامات وغیرہ کا تذکرہ۔

(8) **غیر معتبر حوالے**: تحقیق میں حوالے کی بہت اہمیت ہوتی ہے بغیر سند کے دعوے تحقیق میں قابل قبول نہیں ہوتے اور سند کے لیے ضروری ہے کہ وہ قابل اعتماد ہو، صحیح سند کے لیے ہمیں اس موضوع سے متعلق شاعر یا ادیب کے ہم عصروں کی تصانیف، سیاسی اور تاریخی کتابوں کے ذریعے مستند حوالے مل جاتے ہیں۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو راوی یا شاعر کے ذریعے پھیلا دی جاتی ہیں۔ اس کا صداقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کتاب میں کوئی غلط قول شائع ہو جاتا ہے اور بعد میں آنے والے تمام لوگ اس کا حوالہ دینا شروع کر دیتے ہیں بغیر اصل ماخذ کو دیکھے ہی، اور وہ غلط قول مشہور ہو جاتا ہے۔ کچھ حوالے مشکوک ہوتے ہیں جیسے کسی دانشور کی ڈائری جو وقتی طور سے لکھی جاتی ہے اس کے حوالے مشکوک ہوتے ہیں۔

(9) **قمری ماہ وسال کو شمسی ماہ وسال میں تبدیل کرنے میں دشواری**: اردو ادب کے پرانے مخطوطے پر زیادہ تر سنہ اشاعت قمری ماہ وسال میں درج ہے جس سے سنہ عیسوی سے تطبیق کرنے میں دقت آتی ہے کیونکہ ہجری سال 354 دن کا ہوتا ہے اور عیسوی 365 دن کا۔ ہجری کو عیسوی میں تبدیل کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ٹیبل نہیں ہے جس سے باآسانی ہم تبدیل کر سکیں۔

(10) **اختلاف متن**: تحقیق میں یہ سب سے پیچیدہ مسئلہ ہے کیونکہ اگر متن میں اختلاف پایا جاتا ہے تو صحیح تحقیق مشکل ہو جاتی ہے۔ تب ہم شاعر کے دور میں جو زبان رائج تھی اس سے اس متن کی تطبیق کرتے ہیں اگر وہ صحیح اترتی ہے تو ہم مان لیتے ہیں کہ یہ متن کی اصلی شکل ہو سکتی ہے۔

(11) **الحاقی کلام کی تمیز**: ملفوظاتِ صوفیہ یا بیاضوں میں ہمیں کبھی کبھی دوسروں کے کلام کسی مخصوص صوفی یا مشہور شاعر وادیب کے نام سے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر سوامی رام تیرتھ کی کلیات میں ولی، سراج، اقبال، سعدی وغیرہ کے کلام ملتے ہیں۔ کبیر کے نام سے بہت سے دوہے ملتے ہیں جو ان کے نہیں ہیں اگر محقق محتاط نہ ہو، یا مطالعہ وسیع نہ ہو تو تحقیق متاثر ہوتی ہے اور صحیح تحقیق مشکل سے ہو پاتی ہے۔

(12) **ایک ہی تخلص کے شعرا کا ایک ہی دور میں ہونا**: اکثر محقق کو اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاعروں کے کلام کے گڈمڈ ہونے کا خطرہ رہتا ہے یا ہم کوئی غزل تخلص کی بنیاد پر کسی اور شاعر کی سمجھ رہے ہوتے ہیں اور وہ غزل کسی اور کی ہوتی ہے، یا ایک ہی زمین میں کہی ہوئی غزل میں بھی تحقیق میں دشواری آتی ہے۔

(13) **داخلی اور خارجی شہادتوں کی عدم تطبیق**: کسی واقعے کو پرکھنے کے لیے خارجی اور داخلی شہادتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ مواد کہاں سے حاصل ہوا؟ راوی کون تھا؟ اس کے مزاج، مذاق، کردار وگفتار کی نوعیت کیا تھی؟ اس کا تعلق ان واقعات سے کیا تھا؟ واقعہ نگاری کی نوعیت کیا ہے؟ پھر اس خاص واقعے کے کتنے عرصے بعد راوی نے اسے نقل کیا؟ وہ روایت محض حافظے کی بنا پر بیان کی گئی ہے یا کسی اور راوی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ اصل واقعہ کتنا ہے اور تحریف یا اضافہ کس حد تک ہے۔ کچھ تخلیقات ایسی ہوتی ہیں جن کے مطالعے کے بعد بغیر کسی تحقیق کے بات واضح ہوتی ہے کہ وہ کس زمانے کا ہے یا کس شاعر کی یہ زبان ہو سکتی ہے یہ داخلی شہادت ہے۔ خارجی شہادت کے ذیل میں تذکرہ، سیاسی تاریخیں اور مکتوبات وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ کسی بھی شاعر یا ادیب پر تحقیق کے لیے اس زمانے کی سیاسی تاریخیں، تذکرۂ شعرا اور اس سے متعلق دستاویز مکاتیب وغیرہ کے مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے اگر کوئی محقق اس کو نظر انداز کرتا ہے تو تحقیق کا حق ادا نہیں کر پاتا۔

(14) **متن کی نامکمل تفہیم**: جب ہم دکن کی کسی تخلیق پر تحقیق کرتے ہیں تو سب سے زیادہ دقت متن کو پڑھنے میں ہوتی ہے کیونکہ وہاں کی تخلیقات میں مقامی زبان کا کافی اثر ہے۔ اردو تخلیق میں گجراتی اور تیلگو زبان کے الفاظ بہت زیادہ تعداد میں ملتے ہیں جس سے متن کو پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے اور تحقیق میں رکاوٹ بنتی ہے۔

(15) **مواد کی فراہمی کا مسئلہ**: تحقیق میں سب سے زیادہ اہمیت مواد کی ہوتی ہے اور سب سے مشکل چیز مواد کی تلاش ہے۔ جن لوگوں کے پاس پرانے مخطوطے اور کتابوں کا ذخیرہ ہے وہ اس کو اپنی خاص ملکیت سمجھتے ہیں اور کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ مخطوطے صرف ان ہی کی ملکیت بنے رہیں جس سے ان کی شہرت میں اضافہ ہو۔ کچھ صوفیہ کرام کے ملفوظات لوگ تبرکاً رکھتے ہیں اور صرف اس کی زیارت کرواتے ہیں اس سے استفادہ نہیں کرنے دیتے۔ تحقیق کار کو مواد ملنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے یا موضوع کو تبدیل کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

مندرجہ بالا مسائل کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں جو تحقیق کو متاثر کرتے ہیں لیکن اصل محقق وہی ہے جو ان مسائل سے نبرد آزما ہو کر حق کی تلاش کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے بقول رشید حسن خاں:

''تحقیق کا حال کلاسکی موسیقی جیسا ہے جس میں عجلت، آسان پسندی، بوالہوسی اور خفیف الحرکاتی کا مطلق دخل نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ حاصل کرنے کے لیے بہت ریاضت کرنی پڑتی ہے اور اس ریاضت کی نہ مدت مقرر ہوتی ہے اور نہ معاوضہ طے شدہ ہوتا ہے... تحقیق ہمت شکنی ہوتی ہے لیکن یہ مشکلیں محنت، صبر، دماغ سوزی، صرفۂ وقت، عدم عجلت سے آسان ہو سکتی ہیں۔''

■

Dr. Shah Nawaz Alam, 156, Wasi Abad, Noorullah Road, Allahabad - 211003 (UP)

عائشہ پروین

جگت موہن لال رواں کی شاعری

اردو ایک ایسی زبان ہے جس کو نہ صرف مسلمانوں بلکہ بیشتر ہندو حضرات نے بھی اپنے پیغام اور خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ اور اپنی اپنی سطح پر کامیابی بھی حاصل کی۔ بعض نے نثر نگاری پر توجہ دی تو بعض نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ جگت موہن لال رواں ایسے ہی اہم ناموں میں سے ایک ہیں۔

رواں کے والد کا نام چودھری منشی گنگا پرشاد ہے۔ بابو جگت موہن رواں 14 جنوری 1889 میں پیدا ہوئے۔ 9 سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی کنھیا لال نے کی۔ 1907 میں سورا واں ہائی اسکول سے انٹر اول درجے میں پاس کیا۔ 1909 میں ایف اے اور 1911 میں بی اے کیننگ کالج لکھنؤ سے پاس کیا۔ خداداد ذہانت اور علمی شوق سے وہ ہمیشہ درجہ اول میں پاس ہوئے۔ 1913 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔ 1916 میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کرکے مستقل طور سے اناؤ میں قیام کیا اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ اس پیشے کو مجبوری قرار دیتے ہیں۔ ان کی طبیعت کو خاص طور سے شاعری سے شغف تھا، اسی لیے وہ تمام آسائشوں کے باوجود مطمئن نہیں تھے۔ ان تمام واقعات و حالات کا اثر ان کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں:

کرتے ہیں عزیز دوست عزت میری
کافی ہے ضرورتوں کو دولت میری
ظاہر میں تو کوئی وجہ کلفت کی نہیں
لیکن میں خوش نہیں یہ قسمت میری

رواں کی طبیعت میں شرافت، انکساری اور بردباری حد درجہ موجود تھی۔ وہ بااخلاق اور باادب تھے۔ انھوں نے سلجھا ہوا دماغ اور نکتہ رس طبیعت پائی تھی۔ شاعری میں انھیں بچپن سے دلچسپی تھی۔ ان کے بچپن کے حالات کا اندازہ عزیز لکھنوی کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔

"شاعری ملکہ وہبی و فطری ہے۔ رواں بھی ابجد شروع کرنے سے پہلے موزوں طبع تھے۔ اکثر بچوں سے موزوں الفاظ میں گفتگو کرتے تھے۔ خاندان کے بزرگوں کے لیے ان کی موزوں طبعی ایک مشغلہ تھا۔ اکثر فرمائشیں ہوتی تھیں کہ دیکھو یہ چڑیا دیوار پر بیٹھی ہے۔ اس پر ایک شعر تو کہو۔ یہ دو تین منٹ کے بعد ایک شعر نظم کرکے سناتے تھے اور خراج تحسین وصول کرتے تھے"۔

(صفحہ 12، روح رواں، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1983)

ایک واقعہ کے مطابق رواں جب تقریباً چھ سال کے تھے، بچوں کے ساتھ کپڑے کی گیند سے کھیل رہے تھے۔ گیند ایک بچے سے پھٹ گیا اور چیتھڑے نکل گئے۔ اس پر انھوں نے بے ساختہ ایک شعر موزوں کردیا:

ذرا گیند میرا اٹھالا یئے
پھٹے چیتھڑے مجھ کو دکھلایئے

رواں کبھی کبھی عزیز لکھنوی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ ان کے یہاں فطرت انسانی کی رفعتوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ شعر کہنے کے لیے فلسفہ کی کتاب یا کسی فارسی دیوان کا مطالعہ کرتے ہیں اور جب طبیعت آمادہ ہو جاتی ہے، اس وقت فکر کرتے ہیں۔ زبردستی شعر کہنے پر زور نہیں دیتے۔

ان کی غزلیات، منظومات، رباعیات، قطعات اور انداز بیان میں تازگی و ندرت، سلاست و روانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ فلک پیما تخیل لیکن شعر اخلاق سے پاک اور صدق تاثیر سے مملو ہیں۔ احساس قومیت اور اخلاقیات کے موضوعات بھی کلام میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ ان کے یہاں شوکت الفاظ ہی نہیں بلکہ معنویت بھی موجیں مارتی ہے۔

رواں نے جدید انکشافات فلسفہ و سائنس کے مضامین اپنی شاعری میں اس طرح پیش کیے ہیں کہ وہ سائنس و فلسفہ ہوکر بھی شاعری میں اس طور سے داخل گئے ہیں کہ ان میں رنگینی اور اثر نمایاں طور سے جھلکتا ہے۔ خود کہتے ہیں:

جو زمانے کے خیالات ہیں کرتا ہوں ادا
چاہیے آپ مرے دور کی تصویر مجھے

رواں کے کلام 'روح رواں' میں 1902 سے 1926 تک کہی گئی نظمیں شامل ہیں۔ مطالعے سے ان کے خیالات کے تدریجی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ اہم نظمیں 'سرود عشق'، 'معمائے فطرت'، 'شاعری'، 'لاوارث بچہ'، 'شوہر کش حسینہ'، 'بستر بیمار'، 'عبرت'، 'مریضہ' اور 'الوداع' وغیرہ ہیں۔ کتاب میں بیشتر ایسی نظمیں ہیں جو حالات و واقعات سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہیں۔ نظم 'معمائے فطرت' میں مناظر فطرت کے حیرت انگیز تاثرات کا اظہار شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اور حقیقت کا انکشاف نہ ہونے کے سبب شاعر کے دل میں فطرت کے رموز جاننے کی خواہش نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں:

کھل رہی ہیں ہر طرف کیوں کر عناصر کی کلیں
جل رہی ہیں کس طرح شمس و قمر کی مشعلیں
خود بخود چلتی ہیں یا ان کو چلاتا ہے کوئی؟
آپ ہی جلتی ہیں یا ان کو جلاتا ہے کوئی

رواں زبان اردو کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کی نظم 'شاعری' سے ملاحظہ کیجیے:

بچاری اردو تری محفل میں سخنور کم ہیں
سنگ ریزے تو بہت ملتے ہیں گوہر کم ہیں
چوٹ لگ جائے جن اشعار سے دل پر کم ہیں
جن میں پنہاں ہوں خیالات کے دفتر کم ہیں
میر سمجھا تھا فقط معنی اسرار سخن
ختم غالب پہ ہوئی گرمی بازار سخن

رواں نے موجودہ شاعری خاص طور سے غزل پر اپنے خیالات کو اس طرح پیش کیا ہے:

اللہ اللہ زہے وسعت دامان غزل
بلبل و گل پہ ہے موقوف نہیں شان غزل
ختم پہنائے دو عالم پہ ہے پایان غزل
پوچھیے حافظ شیراز سے امکان غزل
ضبط ہے آئینہ راز حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

اس نظم میں انھوں نے غزل کے مضامین کی وسعت و امکان پر توجہ دلائی ہے اور اس کی وسعت کی تشبیہ اس کوزہ سے دی ہے جس میں دریا جیسی وسعت ہے۔ انھوں نے بچوں کے موضوعات پر بھی توجہ دی ہے۔ "تتلی" ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں قدرت کی کارفرمائیوں کے علاوہ بچوں کے جذبات کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اڑتا پھرتا ہے ہوا پر ساغر زریں کوئی
کر رہی ہے سیر یا معشوقہ رنگیں کوئی
باعث حیرت ہے رنگینی تری ہم کیا کہیں
پھول اک اڑتا ہوا یا باغ چھوٹا سا کہیں
ہلکی پھلکی گرچہ ہے تو اک ذرا سی جاندار
دیکھتے ہیں تجھ میں ہم نیرنگ قدرت کی بہار

ایک اور شعر میں جس میں بچپن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں:

سخت کوشش پر ہمارے ہاتھ کب آتی تھی تو
تجھ تلک چٹکی پہنچتی تھی کہ اڑ جاتی تھی تو

ایک اور شعر جس میں تتلی جیسے بظاہر ننھے سے جاندار سے شاعر خدا کی ہستی کا انکشاف کرتا ہے:

ننھی تتلی تیری ہستی کا اگر ظاہر ہو راز
منکشف ہو رمزِ خلق و خدائے بے نیاز

نظم "لاوارث بچہ" ایک ایسی ہی نظم ہے۔ جس میں سماج پر سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ بچے کی معصومیت اور والدین کی بے رخی کو اس کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس نظم میں شاعر بچے کی حالت زار پر متاسف ہو کر کہتا ہے:

آہ اے نوواردِ بزم رہاطِ روزگار
آہ اے تازہ اسیر گردش لیل و نہار

شاعر اسی طرح کے چند خطابیہ اشعار میں بچے سے سوال کرتا ہے:

کچھ بتا بچے ترا وارث ترا والی ہے کون!
پھول ہے تو کس شجر کا اور ترا مالی ہے کون
کچھ بتا بچے تجھے خاک وطن کا واسطہ
پھول ہے تو جس چمن کا اس چمن کا واسطہ

اور پھر افسوس کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے:

حیف کیا میں مان لوں دنیا کے لوگوں کی دلیل
تجھ کو میں سمجھوں ثمرۂ بدکاری نفس ذلیل
دل نہیں کہتا کہ بدکاری کا ہے انجام تو
ہو رہا ہے گرچہ دنیا میں یونہی بدنام تو
حیف ہے لیکن اگر لوگوں کا کہنا ٹھیک ہو
حیف ہے گر آدمی کی عقل یوں تاریک ہو

شاعر نے اس نظم میں انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی کارگزاریوں پر نادم ہونے کے بجائے مفتخر "ویران قصر شاہی اور ہم" رواں کی ایسی اہم نظموں میں سے ہے، جس سے تاریخ و تہذیب منعکس ہوتی ہے۔ یہ نظم فتح پور سیکری میں اکبر کے محل کو دیکھ کر کہی گئی ہے۔ انھیں تصور سے گزرتے ہوئے اس کی دیرینہ عظمت وشان اور گزرتے افسانوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ نظم میں یوں رقم طراز ہیں:

اجڑے محلوں سے جو آتی ہے صدائے بازگشت
طرفہ افسانے سناتی ہے صدائے بازگشت
پہلے کچھ احکام سلطانی سناتی ہے مجھے
قصہ شان جہاں بانی سناتی ہے مجھے

اور پھر یہاں بسنے والوں کی شجاعت و بہادری کی داستان بیان کرتے ہیں۔

اس طرح کہتا ہے اک بڑی کا ٹکڑا برملا
عالم فانی کا ہے مجھ میں تماشا برملا
میں وہ پتھر ہوں کہ جس میں آکے تیغ آب دار
شیر افگن، صف شکن مردوں کو کر دیتی تھی خوار

اور پھر آگے یہ مضمون بیان کرتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ لوگ ان یادوں کو بھلا دیتے ہیں جو ان کے آبا واجداد سے جڑی ہوتی ہیں۔ اپنی یادوں کو محفوظ رکھنے کے لیے قبروں کی تعمیر ایک پسندیدہ آئین تصور کی گئی ہے۔ لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ قبروں کے نشانات بھی معدوم ہو رہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہیں یہ اجڑی بستیاں صفحات تاریخ قدیم
ان کو ویرانہ نہ سمجھو ہیں یہاں روحیں مقیم
کوئی کیف عبرت آموزی کا متوالا تو ہو
صاف آتی ہیں نظر ہاں دیکھنے والا تو ہو

رواں اپنی نظموں میں نئے نئے مضامین پیش کرتے ہیں۔ دنیاوی حقائق سے پردہ کشائی کر کے لوگوں سے روشناس کراتے ہیں، جہاں انھوں نے اعلیٰ خیالات، مضامین اور اشیا کو جگہ دی جن میں فطرت، وطن سے محبت اور انسانی زندگی میں پیش آنے والے مسائل شامل ہیں، وہیں کائنات کی ان دوسری بظاہر معمولی اشیا جیسے "تتلی"، "غبارہ" اور "پپیہا" وغیرہ بھی ہیں جن سے بچوں کے جذبات جڑے ہوتے ہیں اور ان کی خوشیوں کا سبب ہوتے ہیں۔

جہاں رواں نے نظم نگاری میں مضامین کو تنوع عطا کیا ہے، وہیں غزل کے میدان کو بھی محدود نہیں ہونے دیا ہے۔ وہ غزل گوئی سے متعلق خود رقم طراز ہیں کہ "یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں"۔ اس شعر کی حقیقی رنگت ان کی غزل گوئی میں مضمر ہے اور ان کی نظموں سے کہیں زیادہ وسعت غزلوں میں موجود ہے۔ کلام رواں میں فلسفہ واخلاق کے مسائل تغزل کے رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ کہیں تصوف وعرفان ہے تو کہیں روحانی وجدانی نغمے، جس میں سلاست وروانی، جوش وخروش اور سوز وگداز اپنی انتہا پر نظر آتے ہیں۔ عشق کی کیفیات میں سے ایک کیفیت کو دیکھیں کس لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے:

میں بکا ہی کرتا تھا اپنے حواس
کہ ان کا مرا سامنا ہو گیا

زندگی کے بعد موت کی حقیقت سے آشنا ہونے کے باوجود انسان اپنی دنیا میں گم ہے۔ اسے کسی بات کی فکر ہی نہیں ہے۔ اس مضمون کو کس دلکش پیرائے میں باندھا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جان کے زیست کا مآل پا کے اجل کو روبرو
پھر بھی ہیں مست عیش ہم یہ بھی عجیب راز ہے

اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے جب اس پر دنیا کی

حقیقت منکشف ہوتی ہے تو اس کے پچھتاوے کو کس طرح نظم کیا ہے:

نزع میں آ کر کھلا ہے عالم فانی کا راز
اے مری جاتی ہوئی دنیا بڑا دھوکا ہوا

رواں کی شاعری میں انداز بیان کی ندرت شعر کو نیا لباس عطا کر دیتی ہے:

یہ تو ہے بات ہی کچھ اور کہ میں کچھ نہ کہوں
ورنہ کیا مجھ پہ جو گزری ہے مجھے یاد نہیں

ان کے اشعار میں زبان کا لطف دیکھیں:

آخر امکان وفا کی کوئی تدبیر بھی ہے
تم تو ہر وعدہ کو کہتے ہو ہمیں یاد نہیں
دیکھیں گرتی ہے قفس پر کہ چمن پر بجلی
آج یا میں ہی نہیں یا مرا صیاد نہیں

بے بسی و نامرادی میں موت زندگی سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ متکلم خود کو مٹائے جانے پر احسان مند نظر آتا ہے۔ یہ خیال دیکھیں کس طرح شاعری میں پیش کرتے ہیں:

وہ مجھ کو مٹاتے ہیں احسان نہیں کرتے
میں بادل خوں گشتہ مٹنے ہی کے قابل تھا

بعض جگہ فلسفہ کے خشک مسائل بھی ملتے ہیں جو جذبات سے عاری ہیں۔

گر یہی آئین فطرت ہے تو اے طبع سلیم
کیوں کسی کی موت پر آنسو بہانا چاہیے

رواں نے دنیا کی بے ثباتی اور یہاں رونما ہونے والے حادثات کو کس طرح شعری قالب عطا کیا ہے۔ ذیل میں ملاحظہ کیجیے:

جانے والے چل بسے دنیا کی بستی چھوڑ کر
رونے والے ایک دن کیا عمر بھر رویا کریں
خلق ہے محو تماشا اور تماشا بے وجود
اپنی صیقل دیکھ اے آئینہ ساز زندگی

رواں کے کلام میں اکثر اشعار ایسے ہیں جن میں انسانی روح کے حقائق و معارف کا اظہار ملتا ہے۔

سنگ زمین کعبہ خود بڑھ کے جبیں کو بوسہ دے
ایسے بھی چند سجدے ہیں ناصیہ نیاز میں

رواں کی غزلیہ شاعری میں جو موضوعات پیش کیے گئے ہیں، ان کی رباعیات اس حد کو توڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کی رباعیات مضامین میں تنوع کے اعتبار سے اردو ادب میں اہم اضافہ ہیں۔ مشرق و مغرب کے ادبی مطالعے سے بہت سے خیالات و واقعات کو رباعیوں کا جامہ پہنا دیا ہے۔ انسانی جذبات، درون میں موجود خواہشات اور دیگر احساسات اس خوبی سے رباعیوں میں سمو دیے ہیں کہ ان کی معنوی تہہ داری میں کمال کا حسن پیدا ہو گیا ہے۔ چند رباعیاں جن میں اسی طرح کی انسانی خواہشات کارفرما ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

حرص و ہوس حیات فانی نہ گئی
اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگ مزار پر ترا نام رواں
مر کر بھی امید زندگانی نہ گئی

مر کر بھی انسان کی خواہش زیست ختم نہیں ہوتی جس کی دلیل انھوں نے قبر کے سنگ پر نام کندہ کرانے سے دی ہے:

آزاد ضمیر ہو فقیری یہ ہے
دل بے پروا ہو امیری یہ ہے
زنجیر نہیں ہے باعث قید رواں
محدود رہے خیال اسیری یہ ہے

انجام کی ہو فکر شریعت یہ ہے
جاں صرف وفا رہے ریاضت یہ ہے
زاہد سے کہو نماز و روزہ بے کار
دل خوف خدا کرے عبادت یہ ہے

درج بالا رباعیات میں انسانی فکر سے جڑے دو مختلف پہلو موجود ہیں۔ کہیں خیالات کی پابندی کو زنجیر کی قید سے زیادہ تنگ قرار دیا ہے۔ کہ خیالات کی آزادی زنجیروں سے قید نہیں کی جا سکتی۔ امیری دل سے ہوتی ہے اور ضمیر کی آزادی فقیری کہلاتی ہے۔ ان خیالات کو رواں نے بہت تسلسل سے پیش کیا ہے اور دوسری رباعی میں عبادت سے متعلق خیال پیش کیا ہے کہ اگر انسان کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو تو یہ طاعت و زہد کسی کام کے نہیں۔ ایک اور رباعی جس میں رواں انسان کی زندگی اور اس کے وجود کا سبب جاننے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ وہ حیرت زدہ ہو کر اس کا مقصد جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

اس دار فنا میں مقصد دل کیا ہے
کہیے تعبیر خواب باطل کیا ہے
جب قلب کو ایک دم بھی راحت نہ ملی
آخر اس زندگی کا حاصل کیا ہے

رواں کی ایک رباعی جس میں صبح کی تصویر کچھ اس رنگ میں پیش کی گئی ہے کہ تعریف کرنا محال معلوم ہوتا ہے:

فطرت کہتی ہے ظلمتوں کے پس پشت
کیا ہوا باران نور اگر ہو یک مشت
ہنگامۂ طور کر رہی ہے برپا
صبح خنداں کی اک حنائی انگشت

یہاں سورج کی کرن کو صبح خنداں کی انگشت حنائی بطور استعارہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی رباعیات میں فنا و بقا کے مضامین کثرت سے باندھے ہیں۔ ان دو متضاد کیفیتوں کو دیکھیے کس طرح انھوں نے بیان کیا ہے:

تخریب حیات میں ہے تعمیر حیات
ہے باعث انحطاط تدبیر حیات
شیرازہ دو جہاں ہے تشریح فنا
کڑیاں لاکھوں ہیں ایک زنجیر حیات

رواں کے یہاں زندگی، موت، دنیا کی بے ثباتی، عبادت و بندگی، بادہ نوشی، معرفت الٰہی، خوشی و غم، دلوں میں پنہاں جذبات و احساسات، فطرت کی رنگینیاں اور قدرت کے دلکش مناظر وغیرہ ان کی شاعری میں رواں دواں ہیں۔

انھوں نے مغرب میں رواج پانے والے اس خیال کو کہ انسان کو قوانین فطرت کے موافق زندگی گزارنا چاہیے کو بھی پیش کیا ہے، جس کی شناسائی مشرق کے لوگوں کے لیے بھی ضروری معلوم ہوتی ہے:

تابع ہمیں عقل کا کیے دیتی ہے
آزادی دل فنا کیے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے ہم باز آئے
فطرت سے ہمیں جدا کیے دیتی ہے

انھوں نے ہندو مسلمانوں کے مابین نااتفاقی جیسے حالات سے متاثر ہو کر اپنے احساسات کو شعری قالب عطا کیا ہے۔ کہتے ہیں:

غم شہر بشہر پھیلتا جاتا ہے
اللہ کا قہر پھیلتا جاتا ہے
اب تک تو دلوں میں حرارت تھی رواں
اب خون میں زہر پھیلتا جاتا ہے

انھوں نے اپنے وطن کے لوگوں میں قومی و ملکی جذبات دیکھنے کی تمنا بھی کی۔ کہتے ہیں:

کل قوم کے دل میں درد ہر فرد کا ہو
اور دل میں ہو ہر فرد کے کل قوم کا درد

ان کی رباعیوں میں اخلاقی سبق بھی پایا جاتا ہے:

غربت اچھی نہ جاہ و دولت اچھی
حاصل جس سے ہو دل کو راحت اچھی
جس سے اصلاح نفس ناممکن ہو
اس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

کلام رواں میں وہ تمام خصوصیات تہہ در تہہ موجود ہیں جو ایک اچھی شاعری کی صفات میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

■

Aysha Parveen, Research Scholar, Dept. of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 25

محمد قطب انور

رام لعل کی حقیقت نگاری

اردو افسانہ نگاری کے میدان میں رام لعل ایک اہم شخصیت کا نام ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ جدیدیت سے وابستہ رہے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو کہانی کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔ ان کا اصل نام رام لعل چھابڑہ تھا اور والد تھے بچھن لعل چھابڑہ۔ رام لعل کی پیدائش 3 مارچ 1923 میں میانوالی (پاکستان) میں ہوئی۔ ان کی ادبی زندگی کا سفر 1943 سے شروع ہوتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'تھوک' ہفت روزہ 'خیام' لاہور سے شائع ہوا۔ انھوں نے خود اپنے فن کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے جو بہت ہی اہم ہے:

"میری ادبی زندگی کا آغاز 1943 میں ہو گیا تھا جس میں میری پہلی کہانی 'تھوک'، 'خیام' دہلی لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے شروع سے اپنے لیے دو ادبی رویے متعین کر لیے تھے۔ ایک تو اپنا نام بہت سادہ رہنے دیا یعنی اسے خواہ مخواہ پارعب بنانے کی کوشش نہیں کی تھی (احمد ندیم قاسمی صاحب نے جب میرے پہلے مجموعے 'آئینے' کا تعارف لکھا تو اس میں انھوں نے میرے نام کی سادگی کا خاص طور پر ذکر کیا تھا) دوسرے میں نے افسانہ نگاری کے لیے ہمیشہ نیا ماحول، حقیقی کردار نگاری اور ان کی باتیں پیش کرنا شعار بنائے رکھا۔ اس مقصد کے لیے مجھے ہمیشہ اپنے نچلے متوسط طبقے کی طرف ہی دیکھنا پڑتا ہے جس کا میں ایک فرد ہوں اگر چہ اونچے درجے کا طبقہ بھی میرے سماجی تعلقات کی وجہ سے میری پہنچ سے کبھی باہر نہیں رہا اور اس کے بارے میں میں نے بھی افسانے لکھے ہیں۔ لیکن میں ایمانداری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس طبقے کے ساتھ میری ہمدردیاں محدود ہیں کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ اوپر کا طبقہ عام طور پر ریاکار اور کاروباری ہے۔ اگر چہ تعصب سے بہت دور بھاگتا ہوں اور اس طبقاتی تعصب سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں لیکن انسانی فطرت کی اس خود غرض جبلت کو سمجھنا اور کہانیوں کے وسیلے سے پیش کرنے سے باز آنا کبھی کبھی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"[1]

رام لعل نے آزادی سے پہلے افسانہ نگاری شروع کی اور آزادی کے بعد اشتراکیت سے گزرتے ہوئے ان کا فن ہر زمانے میں تمام انقلابات کو قبول کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا ہے۔

رام لعل کے زیادہ تر افسانوں میں نفسیاتی کش مکش ملتی ہے۔ غیر شادی شدہ اور شادی شدہ عورتوں کے پیچیدہ مسائل جن کا تعلق ایک ہی طرح کی نفسیات سے ہوتا ہے، ان مسائل پر بھی رام لعل نے بہت ہی بہتر انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ نمونے کے طور پر ان کا ایک یادگار افسانہ 'مسن رسن' دیکھیے:

"بیمار عورت نے شاہدہ کے لوٹ آنے پر حیرانی ظاہر کی۔ شاہدہ اس کے پاس بیٹھ کر بولی، آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے؟ کھانا بنا دوں؟ دوا لا دوں؟ بتایئے؟ کس ڈاکٹر کا علاج کرا رہی ہیں؟ اس عورت کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ تکیے کے نیچے سے نسخے نکال کر اس کے حوالے کرتی ہوئی بولی: ان سے پیچ کہا تھا ڈاکٹر نہ جایئے، پیچھی لے لیجیے۔ لیکن وہ سنی ان سنی کر کے چل دیے۔ شاہدہ اس لڑکے رفیق کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی۔ دوا لے کر سب کو ایک ایک خوراک پلا دی۔ پھر ان سب کا کھانا بنایا۔ رفیق کو نل کے نیچے لے جا کر مل مل کر نہلایا۔ اس کے کپڑے بدلے۔ ان کے دو چار میلے کپڑے بھی بھگو کر نچوڑ دیے۔ اس کے بعد کمرے اور برآمدے میں جھاڑو لگا دی یہاں وہاں گری پڑی چیزوں کو سمیٹ دیا۔ میز پر رکھی ہوئی کتابوں اور دوا کی شیشیوں کو ترتیب دے کر رکھ دیا۔ دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کو بھی پونچھ ڈالا۔ اس کے گھر کا نقشہ ہی جیسے بدل گیا۔ شاہدہ نے چاہا کہ جانے سے پہلے اس عورت کے بالوں میں تیل بھی لگا دے۔ انھیں سنوار دے۔ وہ کئی روز سے روکھے بال لیے پڑی تھی۔ لیکن اس عورت نے اسے روک دیا۔ "بس بہن اور تکلیف نہ کرو تم نے بہت کچھ کر دیا۔ مجھ میں نہیں آتا تمھارا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ ایک بات پوچھوں پتہ نہیں یہ بات میرے دل میں کیسے آ گئی۔ شاید میرا قیافہ ٹھیک نکلے تمھارا نام شاہدہ تو نہیں؟" اپنا نام سن کر شاہدہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس عورت نے

شرافت سے آنکھیں بند کر لیں کہنے لگی: جب تم ان تصویروں کو پوچھ رہی تھیں جب ہی میں نے سمجھ لیا۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے جس سے محبت کی تھی اس کے ساتھ شادی کیوں نہ کی؟ میری زندگی کو دوزخ کیوں بنا دیا؟

بیمار عورت آنکھیں بند کیے ہی بولتی رہی۔ شاہدہ سے بیٹھا نہ گیا۔ ساڑی کے پلو سے آنکھوں کے کونے پونچھتی ہوئی آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ باہر نکل گئی۔"[2]

اس پیراگراف میں رام لعل نے دونوں عورتوں کے کردار کو نمایاں کیا ہے۔ یہاں پر ایک شادی شدہ اور ایک غیر شادی شدہ عورت ہے۔ اس کہانی میں دونوں کا رشتہ ایک مرد سے ہے۔ ایک بیوی اور دوسری محبوبہ۔

محبوبہ کی نفسیات کو دیکھیے کہ وہ نہ صرف مرد کو چاہتی ہے بلکہ اس مرد کے پورے خاندان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتی ہے اور اس کے گھر بیمار عورت کی خدمت اور اس کے بچے کی نگہداشت کے لیے اس طرح خدمت کرتی ہے کہ ویسی خدمت اس کے قریبی عزیز بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس کے بعد اس عورت کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شاہدہ خود اس کے شوہر کی محبوبہ ہے۔ اب اس کا یہ جملہ دیکھیے:

"انھوں نے جس سے محبت کی تھی اس کے ساتھ شادی کیوں نہ کی؟ میری زندگی کو دوزخ کیوں بنا دیا؟"[3]

یہ بات اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ شاہدہ کا اخلاق کتنا اچھا ہے۔ یہاں پر افسانہ نگار نے دونوں عورتوں کے ساتھ برابر انصاف کیا ہے۔ رام لعل کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'آئینے' 1945 میں چھپا تھا۔ اس میں شامل افسانے مختصر اور سادہ اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ اپنے دوسرے مجموعے میں انھوں کا 'سفر' 1966 میں لکھتے ہیں کہ "آج میں اپنے آپ کو اردو افسانے کی دو نسلوں کے درمیان گھرا ہوا پاتا ہوں۔ ایک نسل یہاں سے اوپر جا چکی ہے دوسری نیں سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کیفیت کو میں 'سینڈوچ' کا نام بھی دے سکتا ہوں اور کسی حد تک دو پاٹوں کے بیچ کے محاورے سے بھی اس مفہوم کو پیش کر سکتا ہوں۔" اس بیان کے تعلق سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک رام لعل کا یہ تجزیہ محتاج ہے۔ کیونکہ اگر ان کی دو نسلوں سے مراد دو نسلوں کے فکری رویے سے ہے تو وہ قطعاً دو نسلوں کے درمیان گھرے ہوئے نہیں ہیں۔ پریم چند کا بھرپور اثر دراصل نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش اور اعظم کریوی کے بعد کی نسل کے افسانہ نگاروں نے قبول کیا جس میں کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، صالحہ عابد حسین، سدرشن، انسر میرٹھی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، غلام عباس اور رضیہ سجاد ظہیر کے نام قابل ذکر ہیں۔ رام لعل کا شمار اسی زمرے میں ہوتا ہے اور ان کا یہ کہنا کہ وہ دو نسلوں کے درمیان چکی کے دو پاٹوں کی طرح پھنسے ہیں اس لیے مجھے قابل قبول نظر نہیں آتا کہ مختصر افسانے کے جدید فکری رویے کی چوٹ ان کی افسانہ نگاری میں نہیں پڑی۔ ہاں 'آملہ' ایک ایسی کہانی ہے جس پر جدیدیت کی پرچھائیں موجود ہے اور اسے ایک استثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔"[4]

رام لعل کے افسانوں میں حقیقت پسندی کا رجحان نمایاں ہے، وہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنی تخلیق کو حقیقتوں کا روپ دیتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کو نئے معنی و مفہوم سے واقف کرایا۔ رام لعل نے افسانہ نگاری میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا اور اسی امتیازی جذبے نے ان کی کہانیوں میں حقیقت نگاری کے احساسات کو قائم رکھا ہے۔ گرچہ انھوں نے اپنے افسانے میں حقیقت پسندی کے تمام تقاضوں کو پورا کیا ہے اور حقیقت نگاری کو اپنایا ہے۔ پھر بھی ان میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

مثال کے طور پر ان کا افسانہ 'دھوئیں کی دیوار' جس میں مسٹر جگت ایک شہید دولت مند اور ادھیڑ عمر کے اس تاجر کی نوجوان بیوی اپنے دل میں عجیب و غریب قسم کا درد

رام لعل کے جیتے جاگتے کردار ہیں جن کی اپنی پسند اور نا پسند اور نظریات و خیالات ہوتے ہیں۔ ان کرداروں میں خامیاں اور خوبیاں دونوں پائی جاتی ہیں مگر ان کے کردار سدرشن، اعظم کریوی یا حجاب کے کرداروں کی طرح نہیں ہوتے جن میں صرف خوبیوں یا خامیوں کے سوا کچھ نہیں پایا جاتا۔ متحرک کردار نگاری کے ساتھ ماحول کی تصویر کشی بھی بہت خوب انداز میں کرتے ہیں۔ رام لعل سڑکوں، جگنوؤں، بازاروں، اسٹیشن، ریل گاڑی کا ایسا نقشہ اتارتے ہیں جیسے سب ہمارے جانے پہچانے ہوتے ہوں۔ اس طرح ان کے کردار بھی جانے پہچانے ہوتے لوگ معلوم ہوتے ہیں

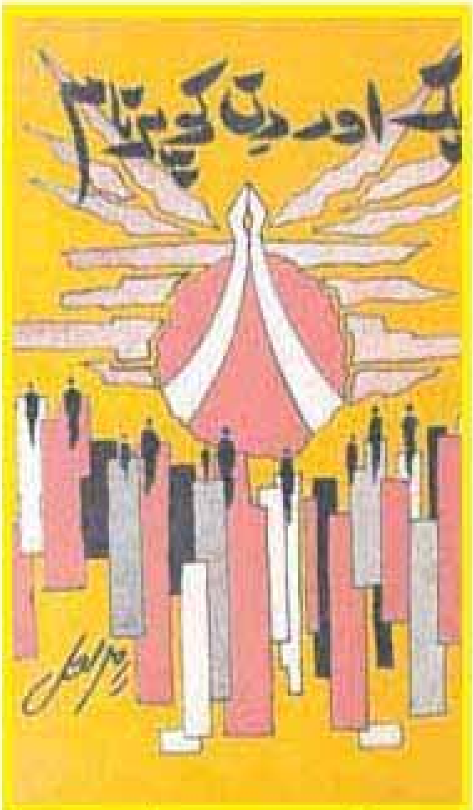

چھپائے گھرتی رہتی ہے۔ یہاں پر رام لعل نے اس کہانی میں سرمایہ دارانہ نظام کی قابل نفرت سودے بازیوں کی بہترین عکاسی کی ہے۔

رام لعل کی حقیقت پسندی پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں:

"رام لعل اردو دنیا کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کی فکر کی صحت اور فن کی پختگی اب اردو دنیا میں تسلیم کی جا چکی ہے۔ میں نے ان کے افسانے سنے بھی ہیں، پڑھے بھی ہیں۔ ان افسانوں میں حقیقت نگاری کے ساتھ حسن اور فن کے احترام کے ساتھ فکر کی گہرائی ہے۔"[5]

رام لعل کا ایک اور افسانہ "ایک شہری پاکستان کا" ہے جس میں تقسیم ہند سے جنم لینے والے ایک المیے کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ کہانی گویا ایک دلگداز چیخ اور پکار ہے جس کے حقیقت پسندانہ اظہار نے افسانے کو پورے عروج پر پہنچا دیا ہے۔ اس سلسلے میں قسیم کچھاوی کہتے ہیں:

"رام لعل کی یہ ہمیشہ عادت رہی کہ وہ کہی ہوئی دھڑکنوں، دبی دبی سرگوشیوں، دبی دبی خواہشات کی مبہم آوازوں کی زبان خوب سمجھتا ہے اور اس کی خصوصیت نے اسے حیات و کائنات کے مسائل سے دلچسپی لینا ہی نہیں سکھایا بلکہ انسانوں کے بے پایاں دکھوں اور بے اندازہ دکھوں میں حصے دار بننے کی اہمیت بھی عطا کی۔"[6]

قسیم کچھاوی کے اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رام لعل نے رنج و غم کے جذبات کو بھی حقیقت پسندانہ

رنگ میں ڈھال کیا ہے۔ البتہ یہاں پر تاثرات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے زہر کے جام کو پی کر بھی مسکراتے ہوئے جینے کی عادت ڈال لی ہے اور یہی تاثر کہانیوں میں جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔

بنیادی طور پر رام لعل کا اسلوب بیانیہ ہے۔ وہ واقعے پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ مجموعہ 'کل کی باتیں' (1967) میں بیشتر کہانیوں کے پلاٹ بہت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ پلاٹ کی اچھی مثالیں 'اداس اداس چہرے'، 'خوشبو کی موت'، 'خوابوں کا سفر'، 'فاصلے' اور 'سحر سے پہلے' میں ملتی ہیں۔ یہ کہانیاں پلاٹ کے اچھے نمونے پیش کرتی ہیں۔ ان کو کہانی لکھنے میں بہت زیادہ عبور حاصل ہے۔ وہ کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے حادثے یا واقعے سے اپنی بہترین کہانی تیار کر لیتے ہیں۔

جس طرح رام لعل نے اردو افسانے میں بہترین پلاٹ کی مثالیں قائم کی ہیں اسی طرح کردار نگاری میں بھی انھیں کافی مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جو کردار پیش کیے ہیں وہ قاری کے ذہن میں دیر پا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کے کردار ان لوگوں میں سے چنے ہیں جن کو انھوں نے قریب سے دیکھا ہے۔ زبان و بیان بھی نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔ بناوٹی زبان سے وہ پرہیز کرتے تھے۔ عام طور پر وہ اپنے افسانوں میں صاف ستھری اور روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ کہانی کا اصلی حسن ہی ان کی افسانویت ہوتی ہے۔

رام لعل کے جیتے جاگتے کردار ہیں جن کی اپنی پسند اور ناپسند اور نظریات و خیالات ہوتے ہیں۔ ان کرداروں میں خامیاں اور خوبیاں دونوں پائی جاتی ہیں مگر ان کے کردار سدرشن، اعظم کریوی یا حجاب کے کرداروں کی طرح نہیں ہوتے جن میں صرف خوبیاں یا خامیوں کے سوا کچھ نہیں پایا جاتا۔ متحرک کردار نگاری کے ساتھ ماحول کی تصویر کشی بھی بہت خوب انداز میں کرتے ہیں۔ رام لعل سڑکوں، گلیوں، بازاروں، اسٹیشن، ریل گاڑی کا ایسا نقشہ اتارتے ہیں جیسے سب ہمارے جانے پہچانے ہوئے ہوں۔ اس طرح ان کے کردار میں بھی جانے پہچانے ہوئے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔

رام لعل کی اسی سادگی اور حقیقت پسندی نے انھیں اردو کا ممتاز اور چابکدست افسانہ نگار بنا دیا۔ ان کے افسانوں میں نفسیات کا بھی دخل نظر آتا ہے۔ رام لعل کے یہاں نفسیات کا دائرہ ایک حد تک محدود ہے۔ یہ نفسیات کو اتنا آگے نہیں بڑھنے دیتے کہ لوگ تناؤ محسوس کریں۔ اس سلسلے میں عابد سہیل رقمطراز ہیں:

"ان کے افسانوں میں نفسیات کی کارکردگی جگہ جگہ نظر آتی ہے لیکن ان کے یہاں نفسیاتی گتھیاں اور ان کا حل ایسا نہیں ہوتا جو ان کے کرداروں کو Supernormal یا Subnormal بنا دے۔ ان کے کرداروں کی نفسیاتی گتھیاں اس خارجی ماحول میں جنم لیتی ہیں جس میں وہ سانس لیتے ہیں اور جو ان کے عمل کا محرک بنتا ہے۔ ان مسائل اور گتھیوں کا حل بھی رام لعل اسی خارجی ماحول میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ فرائڈ کے نظریات سے بھی متاثر ہیں لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کر لیا کہ لاشعور کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہونے کے باوجود اسے تمام شعوری کوششوں کا اصل محرک قرار دے کر جدوجہد اور اچھے برے کی تمیز اور خیر کی شر پر فتح مندی کی آرزو اور اس آرزو کی تکمیل میں اپنے حصے کا مذاق نہیں اڑایا جا سکتا۔"[7]

رام لعل کے یہاں کہانی لکھنے کا انداز بالکل سچا معلوم ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی تحریروں میں حقیقت پسندی کے ساتھ نفسیاتی کشمکش کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

رام لعل نے اردو ادب کو 'آئینے' (1945)، 'انقلاب آنے تک' (1949)، 'جو عورت ننگی ہے' (1949)، 'وہ مسکرائے گی' (1952)، 'نئی دھرتی پرانے گیت' (1958)، 'گلی گلی' (1962)، 'آواز تو پہچانو' (1963)، 'چراغوں کا سفر' (1966)، 'انتظار کے قیدی' (1967)، 'کل کی باتیں' (1967)، 'پانچ مسیحائیں' (1973)، 'اکھڑے ہوئے لوگ' (1973، 'معصوم آنکھوں کا مجرم' (1977)،

جس طرح رام لعل نے اردو افسانے میں بہترین پلاٹ کی مثالیں قائم کی ہیں اسی طرح کردار نگاری میں بھی انھیں کافی مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جو کردار پیش کیے ہیں وہ قاری کے ذہن میں دیر پا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کے کردار ان لوگوں میں سے چنے ہیں جن کو انھوں نے قریب سے دیکھا ہے۔ زبان و بیان بھی نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔ بناوٹی زبان سے وہ پرہیز کرتے تھے۔ عام طور پر وہ اپنے افسانوں میں صاف ستھری اور روز مرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ کہانی کا اصلی حسن ہی ان کی افسانویت ہوتی ہے۔

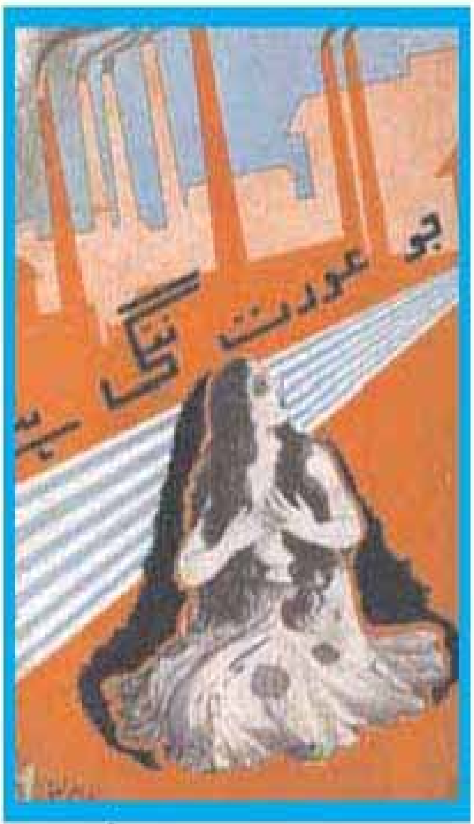

'دوسرا ابھرتا آدمی' (1986)، 'سدا بہار چاندنی' (1986)، 'ایک اور دن کو پیغام' (1990) وغیرہ افسانے اردو ادب کو دیے ہیں جن میں سچے مشاہدے، حقیقت نگاری کے زندہ کرشمے، جدید تقاضوں کی ہم آہنگی، سماجی، سیاسی، معاشرتی کرشمہ سازیاں، فکر و فن کی گہرائیاں موجود ہیں۔ نفسیاتی مسائل کی بہاروں نے ان کے افسانوی ادب کو سرسبز و شاداب بنا دیا ہے۔

ان تمام خصوصیات اور زبان و بیان کے امتیازات کی بنا پر رام لعل کو اردو افسانے کی دنیا میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں اور ان کو بڑے اور بے حد اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے زمانہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔

حواشی :

(1) فن اور شخصیت، آپ بیتی نمبر ص 289-90
(2) رام لعل کی افسانہ نگاری بحوالہ ظہیر آفاقی، 1991 ص 43-44
(3) رام لعل کی افسانہ نگاری بحوالہ ظہیر آفاقی 1991، ص 44
(4) رام لعل فن اور شخصیت، مرتبہ نریندر ساحر، 1985 ص 41-42
(5) رام لعل کی افسانہ نگاری بحوالہ ظہیر آفاقی 1991 ص 66
(6) شمیم نکہت: رام لعل کی افسانہ نگاری بحوالہ ظہیر آفاقی 1991، ص 67-68
(7) عابد سہیل: رام لعل کے افسانے۔ مشمولہ رام لعل فن اور شخصیت، مرتبہ نریندر ساحر 1985، ص 65

■

Dr.Md.Saquib Anwar, Vill, Sarwaily.Post, Bara Eidgah. Vaya, Qasba. Distt, Purnia- 854330 (Bihar)

محمد فرقان سنبھلی

روہیل کھنڈ کے مسلم معاشرہ میں
لوک گیتوں کی روایت

مانی الضمیر کا اظہار اور اس سے جمالیاتی انبساط حاصل کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ فطرت انسانی اسے ماضی کے خوش آہنگ ترانے گانے کے لیے مجبور کرتی رہی ہے۔ لوک گیت نہ صرف یادِ ماضی کو تازہ کرنے کا وسیلہ ہیں بلکہ قدیم تہذیب اور رسم و رواج کے بارے میں معلومات کی حصولیابی کا اہم ماخذ بھی ہیں۔ لوک گیت سنیے یا پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ گیت سادہ لوح دیہاتیوں کے جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ لوک گیت رواں دواں زندگی کی بازگشت ہوتے ہیں۔ وہ عوامی احساسات کا شعوری پہلو ہوتے ہیں اور خود بخود روانی کے ساتھ عوام کے دلوں سے بہہ نکلتے ہیں ان میں قدیم تہذیب اور تمدن کے محاسن و معائب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

لوک گیت کی تعریف کے سلسلے میں ماہرین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ عام طور پر لوک گیت دیہی زندگی کے ترجمان اور دیہی سماج کی نمائندگی کرتے ہیں اور شہری تمدن اور سماج کی چھاپ سے آزاد ہوتے ہیں۔

لوک گیتوں پر تحقیقی کام کرنے والے ادیب کے بی داس نے لوک گیت کی تعریف کچھ اس طرح بیان کی ہے:

"عوام کے دلوں سے نکلے ہوئے وہ بول جو غیر اختیاری طور پر اضطراری حالت میں کسی المناک یا طربناک جذبے سے متاثر ہو کر نکل جاتے ہیں۔"

بیشتر مواقع پر لوک گیتوں کے خالق کا پتہ نہیں چل پاتا ہے۔ ایسے گیت کے کسی مصرعے میں گیت کے خالق کا تخلص بھی نہیں ہوتا ہے جب کہ شاعری کی طرز پر بنے والے لوک گیتوں میں اکثر تخلص کا اہتمام مل جاتا ہے۔ یہاں تخلص کو چھپایا کہا جاتا ہے۔ زیادہ تر گیتوں کی تخلیق میں اجتماعی کوششیں شامل ہوتی ہیں۔ یہ گیت پشت در پشت یادداشتوں میں محفوظ رہتے ہیں اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ان گیتوں میں لطف اور جاذبیت پڑھنے سے زیادہ گانے پر منحصر ہے۔ ہندوستان کے بعض قبائل کا عقیدہ ہے کہ گیت خواب میں لوگوں پر نازل ہوتے ہیں۔

ادیبوں نے لوک گیتوں کی پیدائش کے متعلق کئی نظریات پیش کیے ہیں اور اس کی پیدائش کے مختلف وجوہ بھی بیان کیے ہیں۔ کوئی لوک گیتوں کو ایک مخصوص شخص کا کارنامہ مانتا ہے تو کوئی اسے پورے معاشرے کی کوششوں کا نتیجہ تسلیم کرتا ہے۔ جرمنی کے معروف لوک ادیب جیکب گرم کے "Grimm's Law" کو بہت شہرت حاصل ہوئی تھی جس کے مطابق لوک گیتوں کی تخلیق خود بہ خود ہوتی ہے اس کے پیچھے کسی ادیب یا شاعر کی خدمات شامل نہیں ہوتیں بلکہ لوک گیتوں کی تخلیق میں پورا معاشرہ شامل ہوتا ہے۔

ہندوستانی تناظر میں گرم کا نظریہ کافی حد تک مقبول نظر آتا ہے مثلاً اہیر ذات کے لوگ 'برہا' گیت گاتے ہیں اس میں دو گروہوں کے درمیان سوال و جواب کا سلسلہ لوک گیت کی تخلیق کر دیتا ہے۔ اسی طرح 'جھومر گیت' میں بھی خواتین اسی طرح گیت بناتی اور گاتی جاتی ہیں۔ ایک خاتون کوئی ٹکڑا گاتی ہے تو دوسری اس پر جوابی مصرع گانے لگتی ہے۔ اس طرح کئی خواتین مل کر نیا گیت تخلیق کر دیتی ہیں۔ باوجود اس کے ہندوستان میں بہت سے لوک گیت کسی خاص شخص سے منسوب ملتے ہیں۔

بھوجپوری لوک گیتوں میں 'بلاکی داس'، بندیل کھنڈ میں 'ایسوری'، برج میں "آستی" اور 'مداری رائے' اس کی مثال ہیں۔ اسی طرح زراعت، فصل اور بارش وغیرہ سے متعلق گیتوں میں 'گھاگھ' اور 'بھڈری' کے نام مشہور ہیں۔

روہیل کھنڈ صوبہ اتر پردیش کے شمال مغربی خطے میں واقع ہے۔ زمانہ قدیم میں یہ علاقہ پانچال اور کٹھیر جیسے ناموں سے مشہور رہا۔ سمراٹ اشوک، جتر راجاؤں، گپت خاندان، ہرش وردھن، پرتیہار راجاؤں سے ہوتا ہوا یہ علاقہ تو مروں کے قبضے میں چلا گیا۔ مسلمانوں کے فتح دہلی کے بعد عرب، ایران، افغانستان، ترکستان وغیرہ سے بڑی تعداد میں مسلم خاندان شمالی ہند میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان میں اسلامی مبلغین کی خاصی بڑی تعداد بھی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل سید سالار مسعود غازیؒ کی روہیل کھنڈ میں آمد ہو چکی تھی۔ 1742 میں نواب سید علی محمد خاں نے روہیلہ فوج اور افغان سرداروں کے دم پر کٹھیر یہ راجپوتوں کے جس علاقے پر قبضہ کرکے اپنی خود مختار حکومت کے قیام کا اعلان کیا اس کو روہیل کھنڈ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ نام علاقے میں روہیلوں کی کثیر جمعیت کی بنیاد پر رکھا گیا تھا۔ دور حاضر میں روہیل کھنڈ بریلی مراد آباد کمشنریوں کے 9 اضلاع پر مشتمل ہے۔ ان اضلاع میں بجنور، بریلی، امروہہ، مراد آباد، سنبھل، رامپور، بدایوں، پیلی بھیت اور شاہجہانپور شامل ہیں۔

روہیل کھنڈ کی قدیم تہذیبی اور معاشرتی زندگی مدتوں تک خانہ بدوشوں اور آدی واسیوں کی زندگی رہی۔ گھنے جنگلات اور قبائلی طرز کے معاشرہ میں ساتھ مل بیٹھنے

کے بہانے تلاش کیے جاتے۔ یہاں تک کہ بارش ہونے اور شکار ہاتھ لگنے پر خوشیاں منانے، کھانے پینے اور مختلف جسمانی مقابلوں کے ساتھ رقص و سرود کی محافل کے لیے میدانوں میں جمع ہونے کا رواج زور پکڑتا گیا۔ آمد و رفت میں آسانی کے بعد قوموں اور نسلوں کے درمیان اختلاط پیدا ہوا۔ سماجی نظام اور زبان میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ترکوں اور صوفیوں کی آمد سے علاقے میں سماجی روابط مضبوط ہوئے۔ ترکوں کے طرز فکر اور نظریۂ حیات نے یہاں کے عوام کو بہت متاثر کیا۔ محمد بن قاسم کے زمانے سے ہی روہیل کھنڈ علاقے میں صوفیوں وغیرہ کی اقامت و ہجرت کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ سید سالار مسعود غازی کی علاقے میں آمد اور ان کے ساتھ آئے رفقا کی اقامت کے بعد علاقے میں لوک گیتوں کے ارتقا کا عمل تیزی کے ساتھ جاری ہوا۔ حضرت نظام الدین کی بدایوں ضلع میں 1233 میں پیدائش، سنبھل میں مقامی اور بیرونی طلبا کے پہلے تعلیمی مرکز (روہیل کھنڈ کے پہلے) کا قیام، 1253 میں ایٹہ ضلع میں امیر خسرو کی پیدائش وغیرہ کچھ ایسے واقعات تھے جنھوں نے علاقے میں مشترکہ تہذیب کو فروغ دیا۔ اسی کے ساتھ علاقے میں لوک گیتوں کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ صوفیا کے جذبات اخوت اور خدا پرستی کی تعلیمات نے یہاں کے غیر مسلم عوام کو اس حد تک متاثر کیا کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ لوگ اسلام میں شامل تو ہوئے لیکن بہت سا سماجی اور تہذیبی ڈھانچہ ویسا ہی رہا۔ اس طرح علاقے کے لوک گیت مسلم معاشرہ میں شامل ہو گئے۔ گیارہویں صدی کے بعد روہیل کھنڈ میں نقالیوں، نندنہ کھیلنے والوں، رام لیلا کرنے والوں، اور سوانگ دکھانے والوں کی زبان میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ دراصل یہ تمام کھیل دکھانے والے دیکھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرنے اور رجھانے کی کوشش کرتے تاکہ انھیں زیادہ سے زیادہ انعام و اکرام حاصل ہوں۔ زبان کی تبدیلی سے شائقین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ان کے ذریعے ادا ہونے والے جملوں میں تک بندی پر مشتمل الفاظ کے ایسے مجموعے ہوتے تھے جن سے لحن (سریلی آواز) بھی پیدا ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ان جملوں کی ادائیگی بھی گیت گانے کے انداز میں ہوتی تھی۔ موسیقی اور رقص کا بھی اہتمام ہونے لگا تھا۔ عرصۂ دراز تک پیروں فقیروں کے عُرس میں یہی کھیل تماشے چند آداب ملحوظ رکھتے ہوئے دکھائے جاتے رہے۔ دھیرے دھیرے سماجی نظام، تہذیب و ثقافت پر مسلم کلچر کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ مشترکہ تہذیب مسلم معاشرے میں لوک گیتوں کے فروغ میں اہم کردار نبھانے لگی تھی۔

روہیل کھنڈ کے مسلم معاشرے میں گائے جانے والے لوک گیتوں کو مندرجہ ذیل زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(1) خانگی زندگی کے گیت (2) اعتقاد پر مبنی لوک گیت (3) موسمی لوک گیت (4) رزمیہ لوک گیت

(1) خانگی زندگی کے لوک گیت:

معاشرے کی سب سے اہم اکائی گھر ہوتا ہے اور خانگی زندگی انسانی مشاغل کا اولین مرحلہ ہے۔ ان مشاغل کی ابتدا پیدائش سے ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں پیدائش کے متعلق رسم و رواج میں احساسات اور جذبات کی کیفیتیں تقریباً یکساں ہوتی ہیں لیکن ان کے اظہار میں جغرافیائی ماحول، جداگانہ لب و لہجے کے اثرات انفرادیت پیدا کر دیتے ہیں۔ انسان کی خانگی زندگی مجموعی طور پر پیدائش، شادی اور انتقال کے محوروں پر گردش کرتی محسوس ہوتی ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز بھی اسی کا حصہ ہیں۔

روہیل کھنڈ کے مسلم معاشرے میں نومولود کی پیدائش کے تعلق سے مختلف تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان تقاریب میں حمل کے دوران گود بھرائی، پیدائش، چھٹی، چھوچھک، ستارہ شماری، منڈن، ختنہ، عقیقہ پالنا اور بسم اللہ وغیرہ کی رسوم کی ادائگی پر اہتمام کے ساتھ لوک گیت گائے جاتے ہیں۔ یہ چلن خطے کے دیہات سے نکل کر شہر تک میں رواج پا گیا ہے۔

حمل کی علامتیں ظاہر ہونے پر حاملہ کی گود بھرائی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس موقعے پر پاس پڑوس، کنبے، خاندان اور رشتے کے لوگوں کو جمع کر کے نہ صرف لذیذ کھانوں اور تحفے لینے دینے کا اہتمام کیا جاتا ہے بلکہ گیت بھی گائے جاتے ہیں۔ روہیل کھنڈ کے ضلع پیلی بھیت میں حمل ٹھہرنے اور گود بھرائی کے موقع پر گائے جانے والے ایک گیت کا ٹکڑا ملاحظہ کیجیے۔ اس گیت میں دوران حمل کی کیفیتوں اور حاملہ کی خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے:

راجا رتنارے، کنور رتنارے/ جامن موہے لادو
پہلا مہینہ جب لاگے زچہ رانی
پھول گیئے پھل لاگے
میں واری جاؤں رے واری رے واری
جامن موہے لادو

روہیل کھنڈ میں بچے کی پیدائش پر رشتوں کے اعتبار سے خوشیاں منانے مبارکبادیاں دینے اور رشتوں کی مناسبت سے عائد ہونے والی ذمے داریوں کو منکشف کرنے والے گیت محلے، کنبے کی خواتین، ڈومنیاں اور مراثنیں گاتی ہیں۔

پیدائش کے تعلق سے منعقد ہونے والی تقریبات میں 'چھٹی' کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس دن زچہ کو نندیں غسل کراتی ہیں اور اپنا نیگ وصولتی ہیں۔ ضلع شاہجہاں پور کے دیہاتوں میں 'چھٹی' کا یہ گیت بہت گایا جاتا ہے:

اِدھر بیٹھی نند اُدھر بیٹھی بھاوج
دونوں منھ دھودیں
بھاوج جی جایا للنا، کنگن میں تو لے لوں گی
شام ہوئی رین بیتی پو پھاٹی
بھاوج جایا للنا، کنگن میں تو لے لوں گی

اسی روز شام کو نومولود کے ننیہال سے 'چھوچھک' آتا ہے تمام رشتے دار جمع ہو کر کھانا کھاتے ہیں اور گیت گا کر خوشی مناتے ہیں:

نانی بی لائی ہیں چھوچھک، دادی لے لو بلئیاں
چھوچھک میں آئے ہیں کپڑے لتے اور آئے کھلونے
دادی لے لو بلئیاں......
ماما می لائے ہیں چھوچھک، تائی لے لو بلئیاں
چھوچھک میں آئے کھیل کھلونے اور آئے ٹیکے
تائی لے لو بلئیاں......

لوریاں گا کر بچے کو سلانے کی روایت نہایت قدیم ہے لوریاں محض بچے کو سلانے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ماں کی ممتا کے اظہار کا وسیلہ بھی ہیں۔ روہیل کھنڈ میں مسلم گھروں میں یہ لوری عام طور پر گائی جاتی ہے:

آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا
میرے بچے کی آنکھوں میں گھل مل جا
آتی ہوں بی بی میں آتی ہوں
دو چار بچے سلاتی ہوں
دو چار بچے تو پیچھے سلا
میرے بچے کی آنکھوں میں پہلے آ

بچے کو کچھ بڑا ہونے پر اس کی پڑھائی خصوصاً قرآن پاک کو پڑھانے کا انتظام کیا جاتا ہے اور آغاز استاد کے ذریعے "بسم اللہ" سے کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ گیت ملاحظہ فرمائیں جس میں ایک ماں اپنے بچے سے قرآن پڑھنے کو کہتی ہے:

چندا میرے قرآن پڑھ لے بھولے بھالے قرآن پڑھ لے
تیرے مکتم پہ پھول گلاب کا ترے بکتم پہ پھول گلاب کا
تیرے تائی پہ نور برسے تیرے بھائی پہ نور برسے
چندا بنڑے قرآن پڑھ لے بھولے بھالے قرآن پڑھ لے

بچہ جب زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے سن بلوغت کو پہنچتا ہے تو اس کے اندر جنس مخالف کی طرف اٹریکشن پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس فطری عمل کے زیر اثر وہ وصل اور ہجر جیسی کیفیات سے آشنا ہوتا ہے۔ روہیل کھنڈ علاقے میں رومانس سے بھرپور گیتوں میں

انسانی جذبات کی عکاسی بہ خوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔ مندرجہ بالا گیت کے ٹکڑے پر ذرا غور فرمائیں:

دوشیزہ اپنے محبوب کے لیے:

سانورے تورے کارن ہوئی بدنام
سانورے تورے کارن ہوئی بدنام
کبھی ہمری گلی ماں آؤ سانورے
سانورے تورے کارن ہوئی بدنام
جیسے کڑھیا ماں تیلوا جلت ہے
ویسے جلوں میں تورے سنگ
سانورے تورے کارن......

اور اب ایک نوجوان کے رومانس کا حال ملاحظہ فرمائیں:

میں گیا پلنگ پہ لیٹ نیند جب آئی
سپنے میں مری دلبر پڑی دکھائی
وہ کھڑی تھی مرے پاس کہہ رہی تھی جگا کے
جلدی سے پکڑا ہاتھ کہ لیا اٹھا کے
سپنے میں دیکھا کہ حال کا رستانی ہے
دل جان ملے تو یار زندگانی ہے

شادی انسان کی سماجی زندگی کا اہم مرحلہ ہے۔ سماجی اور مذہبی طور پر شادی کو انسانی زندگی کا لازمی عمل تصور کیا گیا ہے۔ روہیل کھنڈ علاقے کے مسلم معاشرے میں شادی سے پہلے اور بعد میں بہت سی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ ان رسوم کی ادائگی کے ساتھ گیت بھی گائے جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل لوک گیتوں میں شادی کی تقاریب اور رسوم کی ادائگی کو دلچسپ اور موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

روہیل کھنڈ علاقے میں شادی کی تقریب کے تعلق سے 'ٹونا گیت' مشہور ہے اس میں لڑکی والوں کی طرف سے بزرگ خواتین ٹونا بھیجتی ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس طرح ان بزرگ خواتین نے اپنے شوہر پر حکومت چلائی ہے اور اسے پوری طرح اپنے وش میں کیا اسی طرح یہ دلہن بھی اپنے شوہر کو وش میں کر لے۔

اماں کا ٹونا کٹھوری، تائی کا ٹونا بھیجو
مست والا ہوکے آوے گا لاڈو کا بنا
لاڈو کا بنا آوے گا لاڈو کو ساتھ لے جائے
خالہ کا ٹونا بھیجو ری پھوپی کا ٹونا بھیجو

اب ذرا منگنی کے گیت پر بھی ایک نظر ڈال لیں:

لاڈو کھڑی کمرے میں، بسے من من میں
سجن گھر جاتا ہے
لاڈو کے دادا اور دادا ڈھونڈن کو نکلے
مڈل پاس لاڈو ور مانگتی ہے

'جھومر گیت' مضمون کے اعتبار سے لڑکی اور اس کے منگیتر کے درمیان مکالمے پر مبنی گیت ہوتا ہے جس میں اظہار عشق کے ساتھ ساتھ ملاقات کی جستجو، ملنے کی تدابیر اور بعد از شادی کے رنگین تصورات کی منظر کشی کی جاتی ہے:

ہکی گلی تو ڑلانا/ سجن بن کے آجانا
ملنا ہو تو راہوں میں ملنا/ میں راہی بن جاؤں گی
سجن تم رہبر بن کے آجانا/ ساجن بن کے آجانا

رشتہ طے ہوجانے اور شادی کی طے شدہ تاریخ سے پانچ چھ دن پہلے 'اللہ میاں' گیت سے شادی کی رسوم کا آغاز ہوتا ہے۔ مثلاً:

اے اللہ ہاتھوں پہ اترے/ اب سویرا ہے رے
مرادیں حاصل ہو رہی ہیں
مانگ لو جس کا دل چاہے رے

شادی کے موقع پر 'بنا گیت' خاص طور پر گایا جاتا ہے:

بنا میرا لاڈلا ہے گا بادشاہ جادی
بنے تیری اکھیا سُرمے دانی
بنے تیرے دادا کھوب ہی کھوہا
بنے تیری دادی لال بہاری

روہیل کھنڈ کے مسلم معاشرے پر ہندوستانی کلچر کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ہندوستانی سماج کی بہت سی رسمیں مسلمانوں کے یہاں بھی رواج پا گئی ہیں۔ مہندی اور ابٹن کی رسمیں مسلم گھروں میں خوب منائی جاتی ہیں۔ مہندی لگانے کے موقع پر گیت بھی گائے جاتے ہیں:

آجا ہو تیرے مہندی لگائیں
مہندی لگا کے تجھے دولہن بنائیں
مہندی تیرے دادا شوق سے لائے
دادی تیرے ہاتھوں میں رچائیں

زمانہ قدیم میں بھائی اپنی بہن کے بچوں کی شادی میں مالی امداد کرتے تھے لیکن اب یہ بھائی کے لیے 'فرض' اور بہن کے لیے 'حق' بن چکا ہے۔ یہ بھی مانا جاتا ہے کہ عام طور پر بھائی جائداد میں سے بہنوں کو حصہ نہیں دیتے اس لیے وہ بہن کے بچوں (خصوصاً بڑی اولاد) کی شادی میں 'بھات' دے کر قرض کی ادائگی کر دیتے ہیں۔ بھات کے مطالبے، بھات دینے اور بھات کے بدلے پر ڈھیروں گیت گائے جاتے ہیں۔ بھات کا ایک گیت وہ ہوتا ہے جس میں بہن بھائی سے زیادہ سے زیادہ بھات دینے کا مطالبہ کرتی ہے جبکہ دوسرا وہ گیت ہوتا ہے جس میں بھائی کی بیوی اسے کم سے کم بھات دینے کا مشورہ دیتی ہے۔ جب بھائی 'بھات' کے روپ میں کپڑے، زیورات لے کر بہن کے گھر پہنچتا ہے تو کچھ اس طرح کے گیت گائے جاتے ہیں:

کالی گھٹا دھوم سے بھتیا آیا ری
نیکا لایا ری بہن میں جھومر لایا ری
تیرے تھوڑے سے کا دربن بھول آیا ری
دیاں بھابی کا سکھلایا تیری اکل گڑ گئی رے
اپنا اُلٹا لے جا بھات بیرن
نادی دی نائیں ری

(کنڈل، پینڈل، بریسلٹ، کنگن، چوڑیاں، پایل چھلے)

دولہا جب سج دھج کر دلہن لینے کے لیے نکلتا ہے یعنی بارات کی روانگی کے وقت اسے سہرا پہنایا جاتا ہے اکثر یہ سہرا پھولوں کا بنا ہوتا ہے اسے پہنانے کے وقت رشتے دار خواتین جن میں جوان اور بزرگ بھی شامل ہوتی ہیں 'سہرا گیت' گاتی ہیں:

سنبھل والوں نے بریلی سے منگایا سہرا منگایا، بریلی منگایا سہرا
دادا کہتے ہیں میرا نور ابھی سہرا، دادی کہتی ہیں میرے گھر کا اجالا سہرا
نیند کے جھونکے میں پریوں نے سنوارا سہرا، واہ واہ صلی علی خوب سجایا سہرا
سنبھل والوں نے بریلی سے منگایا سہرا منگایا بریلی منگایا سہرا۔

یا پھر یہ گیت:

اڑی خوشبو جو جا پہنچی سر بازار سہرے کی
وہ بولے دولہا کے دادا ہوئی ہے اک ہزاروں میں لڑی تیار سہرے کی۔

اسی طرح دلہن کی رخصتی کے موقع پر بابل گیت

گائے جاتے ہیں:

دو ہنسوں کی موٹر دروازے کھڑی رے
آج میری بٹیا سسرال چلی رے
ابا کو روتا ہوا چھوڑ چلی رے
اماں کو روتا ہوا چھوڑ چلی رے
دو ہنسوں کی موٹر دروازے کھڑی رے

(2) اعتقاد پر مبنی لوک گیت:

سید سالار مسعود غازی کی روہیل کھنڈ میں آمد کے بعد اکابرین سے عقیدت پر مشتمل لوک گیت سامنے آئے۔ بے شک اس وقت کے لوک گیتوں کی زبان کچھ بھی رہی ہو لیکن ان میں مسلم معاشرے کی جھلک ملتی ہے۔ ان گیتوں میں جو جذبہ اور تاثر پایا جاتا ہے وہ دور حاضر میں بھی قابل قدر تصور کیا جاتا ہے۔ کلام خسرو نے اس روایت کی توسیع میں نمایاں کردار ادا کیا۔ علاقے میں عقیدت مندانہ جذبات کے ترجمان منقبتی گیت بھی رائج رہے ہیں۔ اقوام اور فرقوں کے درمیان مشترک تہذیب کے پیدا ہونے سے رسم و رواج کی منفرد قدریں بھی مشترک ہوگئی ہیں۔ عید، ہولی، دیوالی، شب برأت وغیرہ کے مواقع پر یہ نظارہ عام ہوتا ہے۔ شب برأت، واقعہ معراج، رمضان، کونڈوں کی نیاز، واقعہ کربلا وغیرہ کے تعلق سے بہت سے عوامی گیت علاقے میں رائج ہیں مثلاً:

توہی رب توہی رب توہی جگ سارا
توہی لے ہے توہی دے ہے توہی میرا کرے گذارا
توہی رہے گا، توہی ہے، رہا تیرا نام
ہاں میرے ہردے بسا بس تیرا نام

یا پھر یہ عوامی مرثیہ:

لکھوں تو کیا لکھوں میں اس میدان جنگ کا حال
تھا چرخ کو بھی ان کی تنہائی کا ملال
آقا کے دل میں امت عاصی کا تھا خیال
گھر بھی لٹایا سر بھی کٹایا حسین نے

(3) موسمی لوک گیت:

موسمی لوک گیتوں کی لوک زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ موسموں کے رنگ و روپ اور ہوائیں انسانی زندگی پر خاص اثر ڈالتی ہیں۔ انسانی ذہن میں افکار و خیالات کی نشو و نما موسمی مزاج کے زیر اثر ہوتی ہے۔ برسات کا موسم لوک زندگی خصوصاً خواتین کے لیے رشتوں میں جذبات کی شدت بھرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تہذیب کی مشترکہ روایت نے مسلم معاشرے میں بھی ساون گیت، کجری، ساونی، جھولے اور چوماسی وغیرہ گیت گانے کا رواج پیدا کر دیا ہے۔ فطرت انسانی اور قدرتی موسم کے اثر سے پیدا ہونے والے جذبات کا اظہار ان گیتوں کا وصف ہے:

آئی کالی گھٹا بادل گرجے
چلے ٹھنڈی پون مورا جیا ترسے
تھی پیا ملن کی آس سی
پردیس گئے مورے سانوریا

کجری گیتوں میں بہت سی ان باتوں کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے جو عام طور پر پردۂ خفا میں رکھی جاتی ہیں۔ مثلاً:

ہے نار کیسی عجب دو رنگی ہوا میں لہراتی جائے
نہ شرم آتی کسی کی دل میں وہ لعل و گوہر دکھاتی جائے
اٹھاتی چہرے سے جب وہ پردہ اُدھر قیامت ڈھاتی جائے
ذرا سی باتوں میں رنج ہو کر کسی کی ہستی مٹاتی جائے

اسی طرح قدرتی ماحول کی عکاسی کرنے والے گیت بھی علاقے میں منفرد شناخت رکھتے ہیں:

گھٹا آن کر مہینہ جو برسا گئی   تو بے جان مٹی میں جان آگئی
جڑی بوٹیاں پیڑ آئے نکل   عجب بیل پتے عجب پھول پھل

'بارہ ماسہ' موسمی گیتوں کی اہم شاخ ہے۔ سال کے بارہ مہینوں سے متعلق جذبات کی عکاسی کرنے والے مجموعے کو بارہ ماسہ کہہ سکتے ہیں۔ ہر مہینے موسم کی مطابقت سے انسان میں جو فطری جذبات رونما ہوتے ہیں۔ بارہ ماسے انہی کے ترجمان ہوتے ہیں۔ روہیل کھنڈ میں حفظ اللہ قادری کا بارہ ماسہ کافی مشہور ہے جس میں انتہائی مہارت کے ساتھ موسمی کیفیات کے مد نظر ہجر و وصال کے معاملات کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً:

آیا ماس اساڑھ کا پیتم ناہیں پاس
گھٹا گھائیں دیت ہیں سوپی درسن کی آس
سگرا ماس اساڑھ کا روئے بھانا چین
ساون کا آون سنا سو دوتوں اُمڈے نین

یا پھر یہ دیکھیں:

لاگا جیٹھ کا مہینہ تر تر چوائے پسینہ
بلموا کی یاد ستائے ہوگیا ہے مشکل جینا

(4) رزمیہ لوک گیت:

روہیل کھنڈ میں اشفاق اللہ خاں، شہید نجو خاں، علی برادران، علی محمد خاں وغیرہ عظیم مجاہدوں نے انگریزوں کے دانت کھٹے کیے تھے۔ علاقے میں جنگ آزادی کے دوران یہاں کے رزمیہ لوک گیتوں نے بھی عوام میں جوش بھرنے کا کام کیا تھا۔ علاقے کی عام زبان میں رزمیہ گیت تخلیق ہوتے اور انھیں عوام کے سامنے سنایا جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے عوامی خون ابلنے لگتا تھا۔ روہیل کھنڈ میں رزمیہ گیت 'ساکھا' کے نام سے مشہور ہیں۔ عوامی اصطلاح میں 'ساکھا' ان لوک گیتوں کو کہتے ہیں جن میں کسی مشہور لڑائی کے واقعات کی تک بندی پیش کی گئی ہو۔ علاقہ کا سب سے مشہور رزمیہ لوک گیت 'نجو خاں کا ساکھا' ہے:

اول نام کھدا کا لیجیے دوجے نبی رسول
تیجے نام برہی کا لیجیے بات جاؤں نہ بھول
کنٹھ سرسوتی میں تو کنٹھ بیٹھ جائے میرے
نجو خاں کا ساکھا کتیا سرن جاؤں میں رے

لوک گیتوں کی زبان مقامی بولیوں پر منحصر رہی ہے۔ روہیل کھنڈ کے دیہی علاقوں سے ملحق علاقوں کی بولیوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ جیسے پیلی بھیت کے کچھ دیہات کمایونی، بریلی اور شاہجہاں پور کے دیہات پوربی اودھی اور بھوجپوری، بدایوں اور امروہہ کے دیہات برج، مراد آباد، سنبھل اور بجنور میں کھڑی بولی ہریانوی اور پنجابی کا اثر غالب ہے۔ ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے روہیل کھنڈ کو کھڑی بولی کا علاقہ مانا ہے۔ روہیل کھنڈ علاقے کی بولی کو 'روہیلی' کہا جاتا ہے۔ روہیلی کو کھڑی بولی کی شاخ بھی مانا جاتا ہے۔ روہیل کھنڈ میں جو لوک گیت مسلم معاشرے میں رائج ہیں ان میں انگریزی، بھوجپوری، راجستھانی اور اودھی وغیرہ کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے مڈل، اسٹیشن، موٹر، لین، دین، ہری، سدھی اور بھوجی وغیرہ۔ بہر حال روہیلہ لوک گیت جو مسلم معاشرے میں رائج ہیں ایک طرف تو بہت صاف واضح اور آسان زبان میں ہیں دوسری طرف ان میں اطراف کا لہجہ اور الفاظ بھی شامل ہیں۔

روہیل کھنڈ علاقے میں یوں تو لوک گیتوں کو بنا کسی موسیقی کے گانے کا رواج ہے لیکن پھر بھی ڈھولک، دف، ہارمونیم، یک تارا، چمٹا، مٹی کا گھڑا اور جل ترنگ (پانی بھرے گلاس) وغیرہ کا استعمال دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

لوک گیتوں کو جمع کرنے سے یہ تو ممکن ہے کہ اس عوامی تہذیب کے سرمائے کو نیست و نابود ہونے سے بچا لیا جائے۔ لیکن وہ جذبہ تب تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ کھلے ماحول میں اسے سننے کا لطف نہ ملے۔ چونکہ یہ لطف پڑھنے سے زیادہ سننے میں ہے۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ جس طرح لوک گیتوں کو کاغذ پر لکھ کر محفوظ کر لینے کی کوششیں ہو رہی ہیں اسی طرح عوامی گیتوں کے اجتماع کا انعقاد مشاعروں کی طرز پر کیا جائے۔ تاکہ اس تجربے سے بھی آشنا ہوا جا سکے جو لوک گیتوں کو سن کر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اہل علم اور لوک گیتوں سے شغف رکھنے والوں کو اس طرف توجہ مرکوز کرنے کی خاص ضرورت ہے۔

■

Er. Furqan Sambhali, Mohalla Deepa Sarai Chowk, Sambhal - 244301 (UP)

مرادآباد کی پیتل صنعت
ایک مختصر جائزہ

عہد مغلیہ سے ہی ہندوستان میں تجارت کو فروغ ملتا رہا ہے۔ اسی تجارت کی وجہ سے ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا اور اسی وجہ سے مغل شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں ہندوستان کی سرزمین پر انگریزوں نے اپنے قدم رکھے۔ انگریزوں کے علاوہ پرتگالیوں نے بھی تجارت کے لیے اسی سرزمین کو منتخب کیا کیونکہ یہاں تجارت کے بہت سے مواقع فراہم تھے۔

ہندوستان میں دلی، ممبئی، کلکتہ وغیرہ جیسے شہروں کے علاوہ بھی دوسرے شہروں میں تجارت کو فروغ ملا۔ ان شہروں میں کانپور، فیروز آباد، آگرہ اور مرادآباد وغیرہ اہم اور قابل ذکر ہیں۔ کانپور میں جہاں چمڑے کا کاروبار ہوتا ہے۔ فیروز آباد میں شیشے کا اور آگرہ میں جوتے اور قالین بنائے جاتے ہیں، وہیں مرادآباد میں پیتل کے برتن تیار کرکے ان کی تجارت ہوتی ہے۔

شہنشاہ تغزل حضرت جگر مرادآبادی کے نام سے منسوب شہر جگر مرادآباد کو پیتل بستی، پیتل نگری اور پیتل کے برتنوں کا شہر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ مرادآباد میں پیتل کے برتنوں کی مقامی تجارت اور ایکسپورٹ انگریزوں کے زمانے سے ہی شروع ہوئی تھی۔ آج ہم اس مضمون میں بہت اختصار کے ساتھ اس بات کا جائزہ لیں گے کہ پیتل کے برتن کیسے بنائے جاتے ہیں اور ان کی پیکنگ (Packing) کیسے ہوتی اور ان کو دنیا کی مارکیٹ میں کیسے فروخت کیا جاتا ہے۔

کچے مال کی دستیابی: پیتل کے برتن بنانے کے لیے جس سلّی (مال) کی ضرورت ہوتی ہے اس کو بنانے کے لیے کچھ مال کو درآمد (Import) کیا جاتا ہے اور کچھ مال اپنے ہی ملک میں دستیاب ہو جاتا ہے۔ کئی طرح کے الگ الگ میٹل (Metal) کو ملا کر پیتل تیار کیا جاتا ہے۔ ان میں کاپر اور زنک کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قلعی، سیسہ وغیرہ ہوتا ہے۔ اس میں زنگ پیدا کرنے کے لیے الومنیم کا بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر اس کا تناسب بہت کم ہوتا ہے جیسے تین سو کلوگرام میں فقط ایک کلوگرام الومنیم کا استعمال ہوتا ہے۔ ان ساری چیزوں کو ملا کر بڑی بڑی بھٹیوں میں گلایا جاتا ہے اور اس کی سلّیاں بنائی جاتی ہیں۔ جو پیتل کی سلّی کہلاتی ہے۔

پیتل کی سلّی سے برتن ڈھلائی: پیتل کی سلّی صرف ایک طرح کی نہیں ہوتی۔ یہ برتن بنانے کے معیار کے حساب سے کئی طرح کی کوالٹی میں تیار ہوتی ہے۔ جس معیار کے برتن بنائے جاتے ہیں، اس اعتبار سے سلّی کا استعمال ہوتا ہے۔ پیتل کی سلّی سے برتن ڈھالنے کے لیے بھی بھٹی کی ضرورت ہوتی ہے، مگر یہ بھٹی سلّی بنانے کی بھٹی سے کافی چھوٹی ہوتی ہے۔ برتن ڈھالنے کے لیے ایک خاص طرح کے لوہے کے سانچوں (کھانچوں) کی ضرورت ہوتی ہے، جو مرادآباد میں ہی تیار کیے جاتے ہیں۔ جس میں ایک خاص قسم کی مٹی کے (جو شیرا اور کالے تیل وغیرہ سے تیار کی جاتی ہے) اور برتن کے نمونے کے ذریعے برتن کا Shape بنایا جاتا ہے اور پیتل کے مال کو اتنا گلایا جاتا ہے کہ وہ پانی کم از کم تیل کی طرح ہو جاتا ہے اور اس تیل نما پیتل کو ورسے میں انڈیل دیا جاتا ہے۔ جس سے ورسے کے اندر موجود نمونے کے Shape میں مال بھر جاتا ہے اور برتن تیار ہو جاتا ہے۔

چھلائی: کوئی بھی عدد (برتن) جب ڈھل کر تیار ہو جاتا ہے تو وہ اس وقت کسی حد تک کالا اور کھردرا ہوتا ہے۔ اس کو صاف اور چکنا کرنے کے لیے جس عمل کی

ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو 'چھیلنا' یعنی چھلائی کہتے ہیں۔ چھلائی بھی عدد کی بناوٹ اور معیار کے حساب سے کئی طرح کی ہوتی ہے۔ برتنوں کی چھلائی کے لیے لوہے کی مشینیں ہوتی ہیں، جو بجلی کے ذریعے موٹر سے چلتی ہیں۔ مشینوں پر چھیلے جانے والے برتنوں کے سائز کے حساب سے لکڑی کے گٹکے تراشے جاتے ہیں کہ اس میں عدد ایک دم فٹ ہوجائے اور برتن کی چھلائی ممکن اور آسان ہو۔ اس طرح عدد چمکدار اور خوبصورت لگنے لگتا ہے۔

اچھائی: چھیلے گئے برتنوں پر پھول، پتیاں بنانے کے عمل کو 'اچھائی' کہتے ہیں۔ جو عدد میں مزید خوبصورتی پیدا کرتی ہے۔ یہ عمل پوری طرح ہاتھوں سے ہوتا ہے، اس میں مشینوں کا دخل قطعی نہیں ہوتا۔ مگر اب کچھ کام آسانی اور خرچ بچانے کے لیے 'اسٹیچنگ' کے ذریعے بھی کیا جانے لگا۔ مگر اس میں وہ جاذبیت اور کشش نہیں ہوتی، جو ہاتھ سے بنانے کے نقش و نگار میں ہوتی ہے۔

پالش (Polish): چھلائی اور اچھائی کے بعد برتنوں پر پالش کا نمبر آتا ہے۔ پالش سے برتنوں پر زبردست چمک پیدا ہوجاتی ہے، اتنی کہ آپ اس میں اپنا عکس بھی دیکھ سکتے ہیں۔ برتنوں کے معیار کے حساب سے پالش بھی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ عدد تو پیتل کے ہی ہوتے ہیں مگر کچھ عدد پر چاندی کا یا سونے (گولڈن) کا پانی بھی چڑھایا جاتا ہے۔ اسی اعتبار اور معیار سے ان کی پالش ہوتی ہے۔

براس شیٹ کے برتن: پیتل کے برتن صرف ڈھال کر ہی تیار نہیں ہوتے ہیں۔ پیتل شیٹ کے برتن بھی خوب بنائے جاتے ہیں۔ یہ شیٹ مرادآباد میں تیار نہیں ہوتی، یہ باہر سے منگوائی جاتی ہے۔ اس شیٹ کو کاٹ کر گملے، گلاس، بالٹیاں، کپ، تھالی، پلیٹ، جو بلری اور دیگر ضروری سامان تیار ہوتے ہیں۔ اس طرح کے برتنوں کو چھلائی کی ضرورت نہیں ہوتی، البتہ پالش ان برتنوں پر بھی کی جاتی ہے، بلکہ شیٹ کے برتنوں پر اچھائی بھی کی جاتی ہے۔

کارخانے دار: پیتل کے مال کو ایکسپورٹ کرنے والے تاجر زیادہ تر مال خود تیار نہیں کرتے ہیں۔ گوکہ کچھ ایکسپورٹر حضرات نے فیکٹریاں قائم کرلی ہیں۔ ان فیکٹریوں میں وہ مال کو بناتے (مینوفیکچرنگ) یعنی ڈھلائی، چھلائی، اچھائی، پالش اور پیکنگ وغیرہ کا کام خود ہی کراتے ہیں اور وہیں سے مال ٹرکوں میں لاد کر بندرگاہوں اور ایئرپورٹ کے لیے روانہ کردیا جاتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ زیادہ تر ایکسپورٹر کو آرڈر مل جانے کے بعد مقامی کارخانے دار کو بلاکر آرڈر دیتے ہیں۔ آرڈر دیتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کون سا کارخانے دار کیا بناتا ہے اور وہ کس آئیٹم کو بنانے میں مہارت رکھتا ہے۔ ہر کارخانے دار ہر چیز نہیں بنا سکتا ہے۔ سوائے چند بڑے کارخانے داروں کے کیونکہ ان کے پاس ہر چیز کے کاریگر موجود ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ جس طرح ہر کارخانہ دار ہر مال تیار نہیں کرتا اور ہر کاریگر ہر ایک چیز نہیں بناتا ہے اسی طرح ہر ایکسپورٹر ہر مال تیار کرکے ایکسپورٹ نہیں کرتا ہے۔ ایکسپورٹر کا تعلق، جس ملک، جس طرح کے خریدار سے ہوتا ہے وہ وہی مال تیار کراتا ہے۔ کیونکہ امریکہ، انگلینڈ، روس، جاپان، عرب امارات وغیرہ کی ضرورت اور مانگ مختلف ہوتی ہے۔

دیگر آئیٹم کا ایکسپورٹ: موجودہ دور میں مرادآباد میں صرف پیتل کے برتنوں کی برتن سازی نہیں ہوتی ہے بلکہ اب المونیم اور لوہے کا مال بھی خوب بننے لگا ہے۔ اور دنیا کے مختلف بازاروں میں اس کی اچھی مانگ ہے۔ المونیم میں جہاں روزمرہ کی ضرورت کے برتن تیار ہوتے ہیں، وہیں لوہے میں کینڈل اسٹینڈ، فائر سٹ، کرسیاں، صوفے اور گھر کو سجانے، سنوارنے کے دیگر سامان بھی تیار ہوتے ہیں۔

Types of پیکنگ کا طریقۂ کار Packing:

پکے مال سے تیار عدد جب پیکنگ ڈپارٹمنٹ میں آتے ہیں تو دو باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے کہ مال کی پیکنگ اس طرح کی جائے کہ وہ بحفاظت اور صحیح سلامت اپنے مقام تک پہنچ جائے، مال کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچے اور دوسرا یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ پیکنگ جاذب نظر ہو۔ یہ دور شو بزنس کا دور ہے۔ پیتل صنعت اس سے مبرا نہیں۔ یوں بھی کسی چیز کو قاعدے سے پیش کرنے سے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

پیکنگ سے پہلے چیکنگ: جب مال پیکنگ ڈپارٹمنٹ میں پہنچتا ہے تو سب سے پہلے اس کی 'دکھائی' یعنی چیکنگ کی جاتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں کسی طرح کا کوئی نقص تو باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اگر نقص دور نہیں ہوسکتا تو اس مال کو واپس کردیا جاتا ہے۔ دوبارہ سے تیار کرنے کے لیے ایسے مال کو 'واپسی کا مال' کہتے ہیں۔

پیکنگ: مال کی پیکنگ اس کی کوالٹی کے حساب سے بھی کی جاتی ہے۔ اس میں کئی طرح کا مال ہوتا ہے۔ سادہ پیتل کا مال، چاندی کا پانی چڑھا ہوا مال اور سونے کا پانی چڑھا ہوا مال، جیسے گولڈن کے کٹلری سیٹ اور ٹی سیٹ وغیرہ کو گتے کے ڈبے کے بجائے لکڑی اور مخمل کے کپڑے سے تیار ڈبے میں بہت سلیقے سے رکھا جاتا ہے۔ عدد کو سب سے پہلے ایک خاص کپڑے 'پھلالین' (یہ کپڑا بہت نرم اور صاف ہوتا ہے) سے خوب اچھی طرح صاف کیا جاتا ہے، پھلالین کے کپڑے سے صاف کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عدد پر کسی طرح کے نشان نہ آئیں۔ صاف کرنے کے بعد اس کو پلاسٹک کی تھیلیوں میں ڈالا جاتا ہے۔ اچھی کوالٹی کے عدد کو تھیلیوں میں ڈالنے سے پہلے ٹی اور صاف روئی کا غلاف بھی چڑھایا جاتا ہے۔ پھر اس کو لپٹنے کاغذ میں پیک کرکے اس عدد کے سائز والے ڈبے میں رکھا جاتا ہے۔ اور ڈبے کو ٹیپ سے بند کردیا جاتا ہے۔

ڈبے (Box) پر لکھائی: جن ڈبوں میں عدد کو پیک کیا جاتا ہے، اس پر عدد کا نمبر، وزن، عدد کا نام اور فرم کا نام وپتہ وغیرہ لکھا جاتا ہے۔

کارٹن: چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں مال پیک ہوجانے کے بعد، ان کو ایک بڑے گتے کے ڈبے میں رکھتے ہیں، جنھیں کارٹن یا کارٹون کہتے ہیں۔ یہ سارے چھوٹے بڑے ڈبے آرڈر دے کر ڈبہ بنانے والی فیکٹریوں سے بنوائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی عدد اتنا بڑا ہوتا ہے کہ کئی حصوں میں بنا کر پیک کیا جاتا ہے، جنھیں جوڑیاں کاٹ کر جوڑنے کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ بڑے عدد کے لیے ایک ہی کارٹن ہوتا ہے۔ کارٹن کو ٹیپ سے بند کرنے کے بعد اس پر بھی ضروری باتیں چھاپی یا لکھی جاتی ہیں۔

لکڑی کی پیٹیاں یا لکڑی کی پٹیاں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بنائی جاتی ہیں، یہ بھی مختلف سائز کی ہوتی ہیں اور آرڈر دے کر بنوائی جاتی ہیں۔ اس میں ڈبے سے بھرے کارٹن رکھے جاتے ہیں۔ مال کو نقصان نہیں پہنچے اس کے لیے ان پیٹیوں میں کارٹن کے نیچے، اوپر اور چاروں جانب کاغذ کی چھوٹی چھوٹی کترنیں بھری جاتی ہیں۔ پھر پیٹیوں کو بند کر کے لوہے یا اسٹیل کی پٹیوں سے کسا جاتا ہے۔ پھر ان پر بوریوں کا غلاف چڑھا کر ان پر بھی ضروری لکھائی کی جاتی ہے۔ اور پھر یہ پیٹیاں ٹرکوں میں لاد کر منزل کی جانب روانہ کر دی جاتی ہیں۔

مارکیٹنگ اور اس کا پروسیس

جہاں تک براس ویئر (Brass Wear) کی مارکیٹنگ کا تعلق ہے، اس کے لیے ایکسپورٹر غیر ممالک جاکر آرڈر لاتے ہیں، خط وکتابت اور انٹرنیٹ کے ذریعے بھی آرڈر ملتے ہیں اور کبھی کبھی غیر ممالک سے خریدار مرادآباد آکر آرڈر بھی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مال کو بیچنے کے اور کئی ذرائع ہیں۔

دلی میلہ: دلی کے پرگتی میدان میں جب میلہ لگتی ہے تو مرادآباد کے ایکسپورٹر کافی مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس میلہ سے چھوٹے ایکسپورٹر کو بھی کام چلنے کی امید ہوتی ہے۔ میلہ میں ایکسپورٹر اپنے اپنے اسٹال لگاتے ہیں۔ ایکسپورٹر جو مال تیار کراتا ہے اس کے سیمپل اپنے اسٹال پر رکھتا ہے۔ اس میلہ میں غیر ممالک سے کافی تعداد میں خریدار آتے ہیں اور ہر اسٹال پر جاکر اپنی پسند اور کام کی چیز تلاش کرتے ہیں۔ اور سودا کی رقم طے کر کے آرڈر دے جاتے ہیں۔

خریدنے والی ایجنسی: پیتل صنعت کو فروغ دینے میں Buying Egency کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس ایجنسی کے ذریعے بڑی تعداد میں چھوٹے بڑے تمام ایکسپورٹرس کو آرڈر ملتے ہیں۔

انٹر نیشنل میلہ: انٹرنیشنل میلہ سے بھی خاصی تعداد میں آرڈر ملتے ہیں۔ اس طرح کی میلہ ہندوستان کے علاوہ اور دیگر ممالک میں لگتی ہے۔

خط وکتابت/انٹرنیٹ: پہلے محض خط وکتابت کے ذریعہ ہی آرڈر موصول ہوتے تھے۔ لیکن اب کچھ تاجروں نے اپنی ویب سائٹس بھی بنائی ہیں، اس طرح انٹرنیٹ سے بھی یہ لوگ فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

غیر ممالک جاکر آرڈر لانا: کچھ ایکسپورٹرس دوسرے ملک جاکر بھی آرڈر حاصل کرتے ہیں۔ کبھی یہ آرڈر دہندہ سے ملتے ہیں تو کبھی ذاتی طور پر پارٹیوں سے ملاقات کرنے پہنچتے ہیں۔

خریداروں کا مرادآباد آنا: کچھ خریدار مرادآباد آکر بھی آرڈر دیتے ہیں۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ مرادآباد آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے مال کی تیاری دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے انھیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ جو آرڈر ان کو دیا گیا ہے، وہ مقررہ وقت پر مل جائے گا۔

مقامی ایجنٹوں کے ذریعے سپلائی: مرادآباد کے بہت سے ایجنٹ انفرادی طور پر دوسرے

صوبوں کے ایسے شہروں میں جاتے ہیں، جہاں پیتل کے برتن نہیں بن پاتے ہیں یہ لوگ کیرل، گجرات، کشمیر، پنجاب وغیرہ صوبوں میں جاکر بازار کے دوکانداروں شوروم والوں سے آرڈر حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ گھر گھر جاکر بھی یہ لوگ مال سپلائی کرتے ہیں۔ ان ایجنٹوں کے پاس براس کے تقریباً ہر آئیٹم کی تصویریں ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ کیٹلاگ کو بطور سیمپل استعمال کرتے ہیں۔ اور ان کو آرڈر مل جاتے ہیں۔ اس طرح کی سپلائی میں جو بجلی کا سامان جیم پلیٹ، مذہبی سامان، مٹھائی اور گھریلو ضرورت کا سامان شامل ہوتا ہے۔

آرڈر لانے کے بعد یہ لوگ، جس کارخانے میں جو مال تیار ہوتا ہے، اس سے خریدتے ہیں اور اس کو پیک کر کے پارسل کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے آرڈر لیتے وقت ایجنٹ نصف رقم پیشگی لیتے ہیں اور باقی رقم بذریعہ V.P. حاصل ہوتی ہے۔

کچھ دوکاندار دوسرے شہروں میں جاتے ہیں اور وہاں کے بازاروں میں 'پھڑ' لگا کر اپنا مال بیچتے ہیں۔ لیکن اس میں کافی الجھنیں ہوتی ہیں۔

مقامی سطح پر مال کی سپلائی: کچھ کارخانے دار مال تیار کر کے مرادآباد کی پیتل مارکیٹ میں لگا دیتے ہیں۔ جن میں گلاس، بالٹی، مگ، کپ، پلیٹ، لوٹے، شمع دان وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ مال دوسرے شہروں سے آئے دوکاندار اور عام لوگ خریدتے ہیں۔

تہواروں کے موقع پر فروخت ہونے والا سامان: کچھ مال سپلائی کرنے والے دوسرے شہروں میں جاکر تہواروں کے موقع پر استعمال ہونے والے سامان سپلائی کرتے ہیں۔ جن میں کرسمس ڈے پر کینڈل اسٹینڈ، چرچ، دیوالی اور دھن تیرس کے لیے مورتیاں، مندر اور دیگر سامان، ہولی کے موقع پر گوگا جلی وغیرہ اور درگا پوجا اور گنیش اتسو کے موقع پر درگا اور گنیش جی کی مورتیاں بھی فروخت ہوتی ہیں۔

پیتل صنعت کا مستقبل

پیتل صنعت کو مزید فروغ مل سکتا ہے، اگر حکومت اس طرف توجہ دے۔ پیتل صنعت کے ایکسپورٹرس، کارخانہ دار اور کاریگروں کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس میں سب سے بڑا مسئلہ بجلی کا ہے۔ شہر مرادآباد میں بجلی کی بہت پریشانی ہے۔ جس کی وجہ سے کاریگر اور کارخانے دار اکثر پریشان رہتے ہیں۔ جنریٹر چلا کر اس پریشانی سے بچنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اس سے خرچ بڑھ جاتا ہے اور جنریٹر کے دھوئیں سے کاریگروں اور مقامی باشندوں پر بہت خراب اثر ہوتا ہے، ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ حکومت اگر اس طرف توجہ دے اور کئی بنیادی ضرورتوں سے محروم اس صنعت کی ترقی کے بارے میں کوئی قدم اٹھائے تو یہ صنعت بہت ترقی کرے گی اور ملک وقوم کو اس سے بہت فائدہ حاصل ہوگا۔

■

Zakir Hussain, Room No. 146-E, Brahmaputra Hostel, JNU, New Delhi - 110067

مقوی قلب غذائیں

شمس الاسلام فاروقی

ابھی صرف چند دہائیاں پہلے تک مغربی ممالک میں قلبی شریانوں کی بیماریاں ہی صف اول کی مہلک بیماریاں تصور کی جاتی تھیں تاہم آج بعض ماہرین قلب کے مطابق ان بیماریوں کے اعتبار سے ہندوستان سرفہرست شمار ہونے لگا ہے کیونکہ آج دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے دل کے مریض جتنی بڑی تعداد میں ہندوستان میں موجود ہیں کسی دوسری جگہ نہیں۔ امریکہ کی ایک معروف میگزین لینسٹ (Lancet) کے مطابق حالیہ برسوں میں دنیا بھر کے 60 فیصدی قلب کے مریض ہمارے ہی ملک میں پائے جاتے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ ہندوستان میں قلبی عارضے بہت کم عمری ہی میں شروع ہوجاتے ہیں جبکہ دیگر بالخصوص ترقی یافتہ ممالک میں یہ عارضے بڑی عمر کے لوگوں ہی کو لاحق ہوتے ہیں۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے بھی اس امر کی تصدیق کی تھی۔ ان کی رپورٹ کے مطابق 2010 تک دنیا کے 60 فیصدی قلبی مریض ہندوستان میں پائے جانے کی توقع ظاہر کی گئی تھی۔

قلبی شریانوں کی بیماری میں مبتلا ہونے والے لوگ عموماً تاحیات اس کے علاج کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ موجودہ صورت حال کے پیش نظر قلب کی بیماری کے بعد مسلسل اس کے علاج میں سرگرداں رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ پہلے سے ایسے اقدامات کر لیے جائیں کہ لوگ اس بیماری ہی میں مبتلا نہ ہوں۔ ان اقدامات میں طرز زندگی میں باضابطگی، باقاعدگی سے صبح کی چہل قدمی اور ہلکی پھلکی ورزش، موٹاپے پر قابو اور کھانے میں زود ہضم اور قوت بخش غذاؤں کا استعمال شامل ہے۔ ذیل میں کچھ ایسی ہی غذاؤں کی سفارش کی جارہی ہے جن کے استعمال سے مثبت نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں:

سویابین: سویابین میں موجود مختلف عناصر خون کی چربی اور خراب کولسٹرول جسے علمی زبان میں ایل ڈی ایل (LDL) لو ڈینسٹی لائپو پروٹین: (Low density Lipoprotein) کہتے ہیں، کم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سویابین میں فائٹو اسٹروجن (Phytoestrogen) نامی مرکبات موجود ہوتے ہیں جو خراب کولسٹرول میں کمی لانے والے عناصر کی تعداد کو بڑھا کر ان کی تاثیر میں اضافہ کردیتے ہیں جس کے نتیجے میں خون کو خراب کولسٹرول سے نجات مل جاتی ہے اور قلب کی کارکردگی میں بہتری پیدا ہوجاتی ہے۔ روزمرہ کے کھانوں میں سویابین سے بنی مختلف اشیا کا اضافہ بہت آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

لہسن: جسم کے کسی بھی حصے میں سوزش اور ورم کو کم کرنے کی بھرپور صلاحیت لہسن میں موجود ہے بالخصوص شریانوں میں کثافت کے تھکوں کو صاف کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ کچا تازہ لہسن چبا کر کھانے سے شریانوں میں خون کا بہاؤ موثر طور پر بہتر ہوجاتا ہے۔ اس کا استعمال کولسٹرول کو قابو میں رکھتا ہے اور بلڈ پریشر بھی نارمل رہتا ہے۔ صبح ناشتے میں لہسن کی چٹنی کو معمولات میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اس کی بو کو برداشت نہیں کر پاتے وہ لہسن کے بنے کیپسولس کا استعمال بھی کرسکتے ہیں۔

میتھی: میتھی کا استعمال خون میں کولسٹرول کے انجذاب کو روکتا اور شکر کی سطح میں بھی کمی کرکے قلب اور شریانوں کی بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس سے خون کی چربی بھی کم ہوجاتی ہے۔ میتھی میں کولسٹرول، ٹرائی گلسرائیڈس اور ایل ڈی ایل کو کم کرنے کی بے مثال صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کی ایک غیر معمولی خوبی یہ ہے کہ اس کے اثر سے خون میں پلیٹ لیٹس کا جماؤ نہیں ہو پاتا اور نتیجتاً خون میں تھکے بننے کا خطرہ نہیں رہتا جو عموماً قلب کے دورے کا خاص سبب ہوا کرتا ہے۔ ہندوستانی کھانوں میں میتھی کے دانوں کا بگھار بہت عام ہے۔ اس کے علاوہ موسم میں میتھی کا ساگ بھی بطور سبزی کھانوں میں ضرور شامل کیا جانا چاہیے۔

چنا: چنے کا استعمال بھی بہت عام ہے۔ قلب کی عام صحت کے لیے چنا بطور سالن یا پھر اس کا آٹا بنا کر روٹی کی شکل میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چنے میں بھی خون کے کولسٹرول اور گلسرائیڈس کو گھٹانے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہوتی ہے جو بالآخر دل کی عام کارکردگی میں بہتری کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے چنے کے استعمال کو بھی فروغ دیا جانا چاہیے۔

آملہ: آملہ بھی عام طور سے ہندوستانی گھروں میں مختلف شکلوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ آملے کا مربہ، اچار اور اس کا رس بہت عام ہے۔ آملہ وٹامن سی کا بہترین وسیلہ خیال کیا جاتا ہے جس کا جسمانی قوت مدافعت کو بڑھانے اور اعضاء کی سوزش اور ورم کم کرنے میں اہم رول ہے۔ روزانہ آملے کا استعمال خون سے اُن کثافتوں کو دور کرنے میں بے حد مفید ہے جو قلب کی کارکردگی میں رکاوٹ پیدا کرکے اس پر برا اثر ڈالتی ہیں۔ آملہ خون کو صاف کرکے دوران خون میں بہتری لاتا

ہے اور اس کے استعمال سے قلب کے عضلات قوی ہوجاتے ہیں، اس کے سکڑنے اور پھیلنے کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے اور وہ زیادہ قوت سے خون کی شریانوں میں پمپ کرکے رواں دواں کرسکتا ہے۔ آملے کے رس کو روزمرہ کے معمولات میں شامل کرنا بے حد مفید ہے۔ اس کے علاوہ چٹنی، اچار اور مربے کی شکل میں بھی آملے کے استعمال کو بڑھاوا دینا چاہیے۔

ادرک: دل کی صحت کے لیے ادرک بھی ایک بے حد مفید شے ہے۔ ادرک خون میں کولسٹرول کے انجذاب کو کم کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ سوزش اور ورم کے لیے بھی ادرک بہت مفید خیال کی جاتی ہے۔ یوں تو ہندوستانی کھانوں میں ادرک کا استعمال پہلے ہی سے بہت عام ہے تاہم اس کا افادیت کے پیش نظر مختلف شکلوں جیسے لیموں کے عرق میں ڈال کر بطور سلاد اس کے استعمال کو روز کے معمولات میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

پیاز: ہندوستانی کھانوں میں پیاز کا استعمال بکثرت کیا جاتا ہے اور بطور سلاد تو بہت ہی عام ہے۔ دل کی صحت کے لیے پیاز بےحد مفید ہے۔ اس میں طبّی اہمیت کے کئی عناصر پائے جاتے ہیں جن میں سلفر کے مرکبات جسے ٹیکنیکل زبان میں تھائیو سلفی نیٹس (Thio Sulphinates) کہتے ہیں۔ عام سمیت کو دفع کرنے اور سوزش اور ورم کو ختم کرنے میں انتہائی اہم خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ مفید عناصر میں فینولک ایسڈس (Phenolic acids)، اسٹرولس (Sterols)، پیکٹن (Pectin) اور کئی قسم کے جلد تحلیل ہوجانے والے تیل اور وٹامن-سی شامل ہے۔ پیاز کے طبی فوائد بہت کچھ لہسن سے مشابہ ہیں۔ بلڈ پریشر کو کم کرنا، خراب کولسٹرول ایل ڈی ایل کو گھٹانا اور اچھے کولسٹرول ایچ ڈی ایل (HDL) (ہائی ڈینسٹی لائپوپروٹین: High Density Lipoprotein) کو بڑھانا پیاز کی خاص خوبیوں میں شامل ہے۔ مسالوں میں تو پیاز کو شامل کیا ہی جاتا ہے تاہم بطور سلاد بھی اسے کھانے کے ساتھ لازمی قرار دے دینا چاہیے۔

بروکلی: ہرا گوبھی کی یہ مخصوص قسم دل کی صحت کے لیے بے حد مفید پائی گئی ہے۔ برٹش ہارٹ فاؤنڈیشن کی مالی امداد سے امپیریل کالج آف لندن میں کیے گئے ایک مطالعے کے مطابق بروکلی میں موجود مرکب سلفورافین (Sulphoraphane) میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بعض مخصوص شریانوں میں جن میں تھکے بننے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں، ایک مخصوص پروٹین Nrf2 کو متحرک کردیتا ہے جس کے باعث شریانیں تھکوں سے محفوظ ہوجاتی ہیں۔

پتے دار ہری ترکاریاں: دھنیا، میتھی اور پالک جیسی ترکاریوں میں آسانی سے جذب ہوجانے والے کیلشیم کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے۔ شریانوں میں بلڈ پریشر کو نارمل رکھتے ہیں یہ کیلشیم جسم کے عصبی نظام کی مدد کرتا ہے۔ ساتھ ہی کیلشیم کی مناسب مقدار جسم کے عضلات بالخصوص دل کے عضلات کو سکڑنے اور پھیلنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اگر جسم میں کیلشیم کی مقدار ناکافی رہے تو بلڈ پریشر کے بڑھنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

گاجر: مجموعی طور پر گاجر ایک انتہائی مفید سبزی ہے۔ روزانہ دو گاجریں کھانے سے کولسٹرول کو 10 فیصدی تک کم کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں گاجر کے استعمال سے قلب کے دورے کے امکانات 22 فیصدی، فالج سے حفاظت 10 فیصدی اور پھیپھڑوں کے کینسر پر 50 فیصدی تک روک لگ سکتی ہے۔ گاجر کے غذائی اجزا چکنائی/ فیٹ اور کولسٹرول سے پاک ہوتے ہیں۔ اس میں سوڈیم کی مقدار بہت کم جبکہ ریشوں اور وٹامن-اے کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ سبزی کے علاوہ تازہ گاجر بطور سلاد ضرور استعمال کیا جانا چاہیے۔

ٹماٹر: دل کی حفاظت کے لیے ٹماٹر بھی ایک انتہائی مفید ترکاری ہے جس کی مناسب مقدار بطور سلاد روزانہ استعمال کی جانی چاہیے۔ ٹماٹر میں موجود لائکوپین (Lycopene) میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ خراب کولسٹرول ایل ڈی ایل کو شریانوں میں تھکے بنانے کی اپنی صلاحیت سے محروم کردیتی ہے۔ اسی طرح ٹماٹر کا استعمال خون کے پلیٹ لیٹس کو باہم ایک دوسرے سے جڑنے سے روکتا ہے اور ظاہر ہے اس طرح شریانوں میں خون کی روانی میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی اور قلبی شریانوں کی بیماریوں سے حفاظت ہوجاتی ہے۔

پھلیاں اور بیج: پھلیوں میں خاص قسم کے تحلیل ہوجانے والے ریشے ہوتے ہیں جو پیٹ کے کولون میں پہنچ کر خمیر زدہ ہوجاتے ہیں اور ایسے بیکٹیریا پیدا کردیتے ہیں جو جگر میں پہنچنے کے بعد خراب کولسٹرول یعنی ایل ڈی ایل کی پیداوار پر روک لگا دیتے ہیں۔ بھاپ سے پکائے گئے چاول یا دالی وغیرہ کے ساتھ راجما اور سویابین کے بیجوں کو غذا میں آسانی سے شامل کیا جاسکتا ہے۔ السی کے بیج دل کے لیے بے حد مفید پائے گئے ہیں جن میں اومیگا-3 فیٹ جو دل کی تقویت کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں، وافر مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان بیجوں میں دوسرے مفید غذائی اجزا جیسے کیلشیم، آئرن، نائسین، فاسفورس اور وٹامن-ای بھی پائے جاتے ہیں۔ السی کے لڈو ہندوستانی گھروں میں عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں جنھیں متاثر خاطر بڑھاوا دینا چاہیے۔

دہی: ہر روز دہی کا استعمال بھی دل کی صحت کے لیے بہت فائدے مند ہے۔ تجربات بتاتے ہیں کہ دہی کا استعمال خون میں موجود کولسٹرول کی مقدار کو کم کرنے میں بہت موثر رول ادا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دہی میں جو بکٹیریا بکثر موجود ہوتا ہے اس میں یا تو کولسٹرول کو ہضم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے یا وہ صفرا کے تیزابوں کو یکجا کرکے ان کے ذریعے کولسٹرول کو کم کردیتا ہے۔ صبح ناشتے یا پھر دوپہر کے کھانے میں دہی کو معمولات میں شامل کرنا مفید ہے تاہم رات میں اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

سرسوں کا تیل: دل کی صحت کے لیے سرسوں کا تیل بے حد مفید ہے۔ اس سلسلے میں بوسٹن کے ہارورڈ

اسکول آف پبلک ہیلتھ، آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ اور بنگلور کے سینٹ جان میڈیکل کالج کے تحقیق کاروں نے دہلی اور بنگلور کے آٹھ ہسپتالوں میں دل کے مریضوں اور عام لوگوں پر جو تجربات کیے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ دوسرے تیلوں کے مقابلے سرسوں کا تیل استعمال کرنے والوں میں دل کے دوروں کا خطرہ 50 فیصدی تک کم ہو جاتا ہے۔ سرسوں کا تیل پلازما ٹوٹل اور خراب کولسٹرول ایل۔ ڈی۔ ایل کو گھٹانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں مفید اجزا جیسے پروٹینس، کیلشیم، فاسفورس، فیٹولکس اور قدرتی اینٹی اوکسی ڈینٹس بھی ہوتے ہیں۔ سرسوں کے تیل میں وافر مقدار میں موجود مونو ان سیچوریٹڈ فیٹی ایسڈس دل کی صحت کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

انگور: ماہرین کا خیال ہے کہ انگور میں کئی مرکبات پائے جاتے ہیں جیسے انتھو سائنس (Anthocyanins)، فیلوونس (Flavones)، جیرانی اول (Geraniol)، لینالول (Linalool)، نیرول (Nerol)، اور ٹینینس (Tenionce) جو اپنے عمل میں اینٹی اوکسی ڈینٹس جیسے ہوتے ہیں۔ لال انگوروں میں ریس ویراٹول (Res Veratol) نامی مرکب کولسٹرول کو کم کر کے دل کی حفاظت کرتا ہے۔ انگور میں پوٹاشیم بھی ہوتا ہے جس کی مدد سے سمیت کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ البتہ شوگر کے مریضوں کو اس پھل سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اس میں شکر کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔

سیب: سیب کے چھلکے اور باہری گودے میں پولی فینولس (PolyPhenols) بکثرت پائے جاتے ہیں جو قوی اینٹی اوکسی ڈینٹس تصور کیے جاتے ہیں اور ان کی مدد سے شریانوں میں تھکے بننے کے عمل کو روکا جا سکتا ہے۔ امریکن تحقیق کاروں کے مطابق سیب کا رس پینے سے دل کی بیماریاں پیدا کرنے والے عمل کو سست کیا جا سکتا ہے۔

سنترہ: سنترہ اور اس خاندان کے دوسرے پھل کیلشیم اور وٹامن سی سے بھرپور ہیں۔ ان کے استعمال سے دل کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے اور دل کے عضلات مضبوط ہو کر اس کے خون کو پمپ کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

کیلا: یہ ایک سستا تاہم بے حد مفید پھل ہے۔ اس میں پوٹاشیم، وٹامن بی-16، فولک ایسڈ اور قابل تحلیل ریشوں

کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے۔ کیلا بڑھے ہوئے کولسٹرول کو کم کرنے میں بہت مفید ہے۔ یہ معدے کی اندرونی پرت کو قوت بخشتا ہے اور تیزابیت اور زخم خوردگی سے حفاظت کرتا ہے۔

امرود: وٹامن-سی کا خزینہ ہے جس میں کیلشیم، فولک ایسڈ، فاسفورس اور تحلیل ہو جانے والے ریشے وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ امرود کولسٹرول کو کم کر کے دل کی حفاظت کرتا ہے اور جسم کی قوت مدافعت میں بھی اضافے کا باعث ہے۔

انناس: اس پھل میں ریشوں کی کثرت ہوتی ہے۔ وٹامن-سی اور پوٹاشیم کے علاوہ اس میں ایک منفرد ہضمی اینزائم بروملین (Promelin) بھی پایا جاتا ہے۔ انناس میں کچھ ایسے تغذیات بھی پائے جاتے ہیں جن میں جمے ہوئے خون کو تحلیل کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور اس طرح وہ بھی دل کی عام صحت کے لیے مفید ہے۔

انار: یہ پھل انتہائی قوی اینٹی اوکسی ڈینٹس کا مخزن ہے۔ ماہرین کے مطابق 2 سے 3 اونس انار کا رس روزانہ پینے والوں میں کولسٹرول بننے کا وہ عمل 40 فیصدی تک سست ہو جاتا ہے جس کے ذریعے شریانوں میں تھکے بن کر خون کے بہاؤ کا راستہ تنگ ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی خراب کولسٹرول کی مقدار میں بھی کمی آ جاتی ہے۔

خشک میوے: امریکن تحقیق کاروں کے مطابق بادام، اخروٹ، پستہ اور مونگ پھلی جیسے خشک میووں کی ایک مٹھی روز کھانے سے دل کو بہت قوت ملتی ہے۔ ان میں موجود تغذیات میں کولسٹرول کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ خشک میووں میں ان سیچوریٹڈ اومیگا-3 فیٹی ایسڈس، ریشے، ایل-ارگی نین اور اسٹرولس ہوتے ہیں جو خون میں خراب کولسٹرول کو کم کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ رات بھر پانی میں بھیگے ہوئے کھانے سے خون میں تھکے بننے پر روک لگتی ہے اور شریانوں کی اندرونی پرت مضبوط ہوتی ہے۔ اومیگا-3 کی مدد سے قلبی بیماریوں پر قابو پانے میں خصوصی مدد ملتی ہے۔

مختصراً اگر ایک متوازن غذا کھائی جائے جس میں ہری سبزیوں اور پھلوں کی کثرت ہو۔ ساتھ ہی پیاز اور ٹماٹر کو بطور سلاد شامل کیا جائے اور پھلیوں اور خشک میووں کا پابندی سے استعمال کیا جائے، اس کے علاوہ شراب، کافی اور دیگر مشروبات سے پرہیز کیا جائے اور پابندی سے صبح چہل قدمی کے ساتھ ہلکی ورزش کو معمولات میں شامل کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا دل صحت مند نہ رہ سکے۔

■

Dr. Shamsul Islam Farooqui 90-B/1, Abdu Talib, Gali No.1, Noor Nagar, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

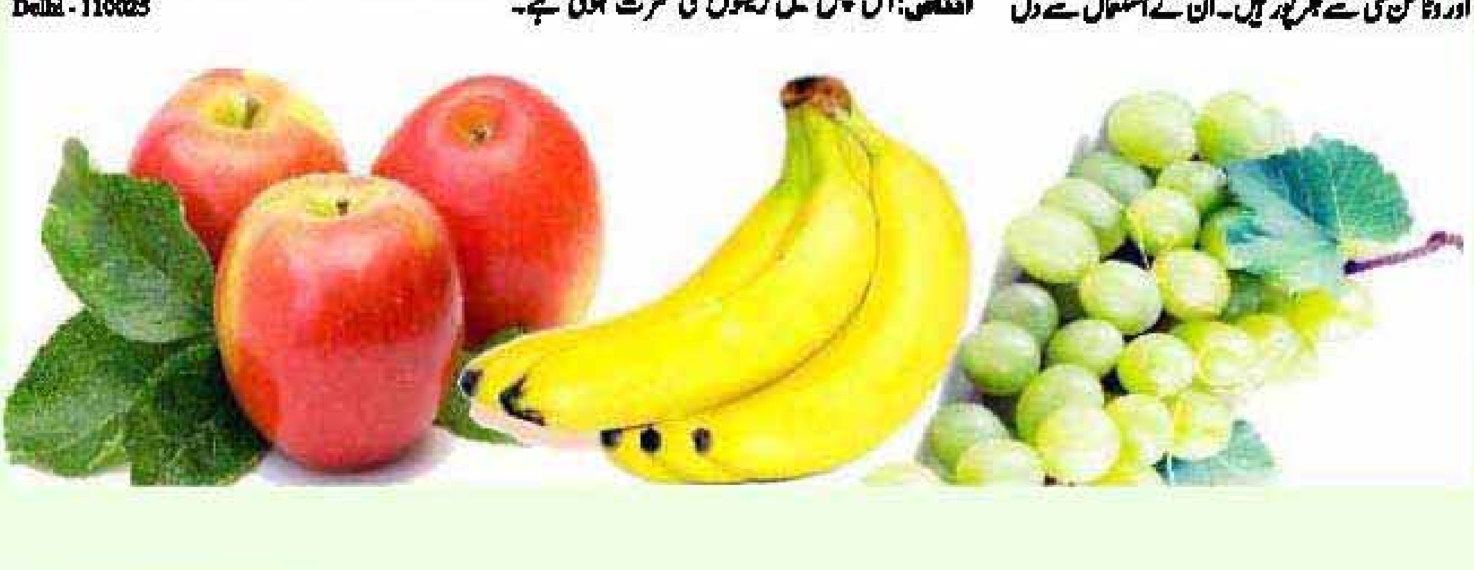

یوم پیدائش پر خصوصی تحریر

انیس امروہوی

ہندوستانی سنیما کا آخری مغل

قلم سے فلم تک کمال امروہی

17 جنوری 1918 کو اتر پردیش کے مردم خیز شہر امروہہ میں ایک زمیندار گھرانے میں کمال امروہی کا جنم ہوا۔ ان کا اصلی نام سید امیر حیدر تھا اور پیار سے گھر والے ان کو 'چندن' کے نام سے پکارتے تھے۔ گھر میں سب سے کم عمر ہونے کی وجہ سے کمال امروہی بہت شرارتی، چنچل اور لاڈلے تھے۔ ایک طرح سے وہ خاندان کے بگڑے ہوئے بچے کے روپ میں پہچانے جاتے تھے۔

بچپن سے ہی کمال امروہی حُسن پرست تھے۔ چاہے قدرت کے حسین مناظر ہوں یا قدرت کا بنایا ہوا کوئی حسین چہرہ، وہ ہر طرح کے حُسن کے دلدادہ تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ پڑھائی لکھائی میں ان کا دل کم ہی لگتا تھا۔ بہتر تعلیم کے لیے انھیں دہرہ دون بھیجا گیا جہاں انھوں نے ہائی اسکول تک کی تعلیم مکمل کی۔

ایک بار اُن کے خاندان میں شاید کوئی شادی تھی اور بہت سا حُسن ان کے گھر کے آنگن میں جمع تھا۔ بہت سے مہمان ان کے گھر میں آئے ہوئے تھے۔ کسی بات پر گھر میں دودھ سپلائی کرنے والی خاتون سے کمال کا جھگڑا ہوا اور اس نے کمال کے بڑے بھائی سے شکایت کر دی۔ بڑے بھائی کا گھر میں بڑا رعب تھا کیونکہ وہ پولیس میں ملازم تھے۔ انھوں نے کمال کو اپنے پاس بُلایا اور کہا کہ آپ خاندان کا نام بہت روشن کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ کمال کے گال پر جڑ دیا۔

بڑے بھائی کا تھپڑ کھانا تو کمال کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی، مگر اس وقت شادی میں آئی ہوئی بہت سی حسین لڑکیوں کے وہ ہیرو بنے ہوئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اُن سب کی موجودگی میں اس تھپڑ کو اپنی بہت بڑی بے عزتی محسوس کی اور اسی وقت گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہی وہ تاریخی فیصلہ تھا جس نے ہندوستانی سینما کو ایک تاریخی شخصیت عطا کی۔

اُسی رات کمال نے اپنی بہن کا سونے کا کنگن غائب کیا اور صبح کو سولہ روپے میں فروخت کر کے لاہور جانے والی گاڑی پکڑ لی۔ دس روپے خرچ کر کے کمال لاہور پہنچ گئے۔ اس وقت کمال کی عمر لگ بھگ سولہ برس کی رہی ہوگی۔

1934 عیسوی کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ لاہور میں خمیر علی صاحب کی ایک لانڈری 'ہمدرد لانڈری' کے نام سے مشہور تھی۔ خمیر علی صاحب دوست نواز آدمی تھے۔ مشہور اردو شاعر اختر شیرانی بھی اُن کے دوستوں میں تھے اور مشہور اداکار نواب علی بھی۔ خوب محفلیں جمتی تھیں۔ شعر و شاعری سے لے کر فلم اور سیاست پر خوب بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

خمیر علی صاحب کی 'ہمدرد لانڈری' میں دھام پور ضلع بجنور (یو پی) کا ایک نوجوان لڑکا فراہیم ملازمت کرتا تھا۔ اُس کو بہت سے لوگ 'فرزی' کی عرفیت سے پکارتے تھے۔ فرزی کو فلموں میں کام کرنے اور ہیرو بننے کا بڑا شوق تھا۔ وہیں اس کا ایک دوست امیر حیدر بھی اس کے ساتھ رہتا تھا، حالانکہ وہ لانڈری کا ملازم نہیں تھا، مگر فرزی کی دوستی اور فلموں کے شوق کی وجہ سے دونوں ساتھ رہتے تھے۔ شاید اس لیے بھی کہ امیر حیدر گھر سے بھاگا ہوا تھا۔ امیر حیدر کے پاس کچھ کہانیاں تھیں، جن کو وہ اپنے دوستوں میں یہ کہہ کر سنایا کرتا تھا کہ وہ بھی فلموں میں کہانیاں لکھے گا۔ اس وقت لوگ اس کی اس بات پر ہنس دیا کرتے تھے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ایک بار مشہور فلمساز و ہدایت کار سہراب مودی لاہور پہنچے اور اپنے شاعر دوست اختر شیرانی کے یہاں ٹھہرے۔ وہیں سب دوستوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ خمیر علی صاحب بھی اس محفل میں موجود تھے۔ بات چیت کے دوران انھوں نے سہراب مودی سے کہا کہ جناب ہمارے یہاں دو لڑکوں پر فلموں کا بڑا بھوت سوار ہے۔ اگر آپ ایک بار اُن سے بات کر لیں تو شاید یہ بھوت اُتر جائے۔ مودی صاحب فوراً رضامند ہو گئے اور بولے۔ "چلو یہ اچھا ہے..... تھوڑی تفریح ہی سہی۔"

اگلے دن دونوں نوجوان لڑکوں کو مودی صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ پہلا نمبر فراہیم کا تھا۔

"تم کیا بننا چاہتے ہو؟" مودی صاحب نے سوال کیا۔

"ہیرو۔" بڑے شرمیلے انداز میں فرزی نے جواب دیا۔

"کار چلانی آتی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"موٹر سائکل؟"

"جی نہیں..... سائکل چلا لوں گا۔"

فرزی کا جواب سُن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ اسی طرح کے کچھ اور سوال کر کے فراہیم کو کمرے سے باہر بھیج دیا گیا۔

اب باری امیر حیدر کی تھی۔ چھوٹے سے قد کا گورا چٹا نوجوان لڑکا جب سہراب مودی جیسی لمبی چوڑی قد آور شخصیت کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو انھوں نے حیران حیران نگاہوں سے اس خوبصورت لڑکے کی طرف نیچے سے اوپر تک دیکھا اور دل میں سوچا کہ اتنا کم عمر اور معصوم لڑکا کیا فلموں میں کہانیاں لکھے گا؟ لڑکا مودی صاحب کے دل کی بات بھانپ گیا اور اس سے پہلے کہ مودی صاحب کوئی سوال کرتے، اس نے برجستہ سہراب مودی سے کہا۔

"مودی صاحب..... میں دیکھنے کی نہیں، سننے کی

چیز ہوں۔''

چھوٹی سی عمر کے معصوم سے لڑکے کے منہ سے ایسی بڑی بات سُن کر مودی صاحب بہت متاثر ہوئے اور فوراً کہانی سننے کے لیے راضی ہوگئے۔ امیر حیدر نے بھی بغیر ایک لمحہ ضائع کیے ایک کہانی 'جیلر' کے عنوان سے مودی صاحب کو اس انداز میں سنائی کہ مودی صاحب نے نہ صرف کہانی پسند کی، بلکہ اس نوجوان کو بھی اپنے ساتھ ممبئی لے جانے کا فیصلہ کرلیا اور اسی وقت جیب سے روپے نکالتے ہوئے بولے۔

''نوجوان! یہ چار سو روپے رکھو اور بمبئی چلنے کی تیاری کرو۔ ہم وہاں تم کو بتائیں گے کہ اس کہانی کو فلم کے لیے کس طرح لکھا جائے گا۔ اب ہم کشمیر جارہے ہیں، واپسی میں تم ہمارے ساتھ بمبئی چلوگے...... تیار رہنا۔''

چار سو روپے اس وقت اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے اس نوجوان کے دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی جا رہی تھی اور ہاتھوں میں کپکپاہٹ ہونے لگی تھی، کیونکہ اب سے پہلے کبھی اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک کہانی کا معاوضہ اتنا بھی ہوسکتا ہے۔

امیر حیدر نے فوراً بازار جاکر ایک جوڑی نئے جوتے، دو تین نئے کُرتے، ایک ہولڈال اور ضرورت کا کچھ اور سامان خریدا اور مودی صاحب کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ مودی صاحب بات کے پکّے اور سچّے آدمی تھے۔ انھوں نے واپسی میں امیر حیدر کو بھی اپنے ساتھ لیا اور بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی پہنچ کر امیر حیدر نے 'منروا مووی ٹون' کے لیے اُس کہانی کو 'جیلر' کے عنوان سے فلمی انداز میں سیّد امیر حیدر کمال کے نام سے لکھا۔

'جیلر' کی کامیابی کے بعد سہراب مودی نے اپنی شہرۂ آفاق تاریخی فلم 'پکار' کی کہانی بھی سیّد امیر حیدر کمال سے لکھوائی۔ اس فلم نے کامیابی اور شہرت کے ایسے جھنڈے گاڑے کہ چاروں طرف کمال کے نام کا ڈنکا بج گیا اور ''باادب، باملاحظہ ہوشیار......'' کی آواز پوری فلم انڈسٹری میں گونجنے لگی۔

کمال امروہی ہندوستانی سینما کے لیے ایک بہت بڑی شخصیت کے روپ میں فلم 'پکار' سے اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب ہوئے۔ اُن کو اپنے آپ پر بہت بھروسہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے پہلی بار ایک فلمکار کے روپ میں یہ شرط رکھی کہ ان کا نام فلم کے پردے پر الگ سے ایک فریم میں دیا جائے گا۔

اس طرح ایک کہانی کار اور ایک مکالمہ نگار کی الگ سے پہچان کرانے میں کمال امروہی نے اس طرح پہل کی، ورنہ اس سے پہلے کہانی کار اور مکالمہ نگار کا نام فلمی پردے پر بہت سے ناموں کی بھیڑ میں کہیں چھوٹا موٹا سا آجاتا تھا۔ کہانی کار کو فلم انڈسٹری میں منشی کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور اس کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ فلم ساز یا ہدایت کار کے گھر کا کام اور بچوں کی دیکھ بھال تک کرلیا کرتا تھا۔

کمال امروہی نے پہلی بار فلم 'پکار' میں کہانی کار اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے پردے پر الگ سے نام دے کر ایک خاص کردار ادا کیا۔ فلم 'پکار' اپنے مکالموں کی وجہ سے یہ ثابت کرسکی کہ کوئی فلم مکالموں کی بنیاد پر بھی کامیاب اور مقبول ہوسکتی ہے۔ اس فلم کے مکالمے ہی اس فلم کی خاصیت بن گئے تھے۔

ان ہی دنوں خواجہ احمد عباس نے کمال امروہی کی ایک کہانی 'آہوں کا مندر' کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو

بہت مقبول ہوئی۔ عباس نے ہی کمال امروہی کو 'بامبے ٹاکیز' کے ہمانشو رائے سے ملوایا اور صرف اُنیس برس کی عمر میں ہی بامبے ٹاکیز کے شعبۂ کہانی (اسٹوری ڈپارٹمنٹ) کے سربراہ کمال امروہی بن گئے۔

ہمانشو رائے کے انتقال کی وجہ سے کمال امروہی کی مشہور کہانی 'آہوں کا مندر' پر فلم بنتے بنتے رہ گئی۔ اب بامبے ٹاکیز کا تمام کام اشوک کمار دیکھتے تھے۔ کمال امروہی نے فلم 'محل' کی کہانی لکھی اور اس کے ساتھ ہی وہ پہلی بار ہدایت کاری کے میدان میں داخل ہوگئے۔ حالانکہ اس فلم کے تمام معاملات اشوک کمار کے ہاتھ میں تھے، مگر بینر بامبے ٹاکیز کا تھا۔ فلم 'محل' (1949) اپنے وقت کی کامیاب ترین فلم تھی۔ اسی فلم سے ہندوستانی سینما میں سسپنس فلموں کے دور کا آغاز ہوا اور اداکارہ مدھوبالا کی پہلی کامیاب فلم بھی 'محل' ہی تھی جس سے مدھوبالا کو پہچان ملی۔ اس فلم کے ایک گانے...... ''آئے گا آنے والا'' سے لتا منگیشکر پر بھی کامیابی کے دروازے کھل گئے۔

ایک بار ایک دوست نے کمال امروہی کو کھانے پر مدعو کیا۔ وہاں ممتاز نام کی ایک خوبصورت لڑکی سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ کھانے کی میز پر وہ لڑکی کمال امروہی کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ جب وہ میز سے اُٹھ کر گئی تو کمال صاحب نے اپنے دوست سے دریافت کیا کہ کیا یہ لڑکی فلموں میں کام کرنا چاہتی ہے؟ اُن دنوں کمال صاحب کو فلم 'محل' کے لیے ہیروئن کی تلاش تھی۔ دوست نے بتایا کہ ممتاز کئی فلموں میں کام کرچکی ہے اور اس دعوت کا مقصد بھی یہی تھا کہ ممتاز (مدھوبالا کا اصلی نام) کو آپ سے ملوایا جائے۔ اس طرح چھوٹی فلموں کی اداکارہ ممتاز بڑی فلم 'محل' کی ہیروئن مدھوبالا بن گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلم 'محل' میں مدھوبالا بے حد خوبصورت دکھائی دی ہے اور اعلیٰ درجے کی فلموں کے لیے وہ اسی فلم سے اپنی پہچان بنا سکی۔

اشوک کمار اس فلم کے ہیرو تھے۔ کمال امروہی کو ان کے مکالموں کی ادائگی پسند نہیں تھی۔ وہ اشوک کمار کو بالکل نئے انداز میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ کمال امروہی نے فلم کی شوٹنگ درمیان میں ہی رُکوادی اور تین ماہ تک وہ اشوک کمار کے ساتھ فلم کے مختلف مناظر پر اور اُس کہانی میں اشوک کمار کے کردار کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ آخرکار جب اشوک کمار اس کردار میں پوری طرح اُتر گئے، تب کمال امروہی نے فلم کی شوٹنگ دوبارہ شروع کی اور نو دس ماہ میں ہی فلم مکمل کرکے نمائش کے لیے پیش کردی۔

اشوک کمار کی انگلیوں میں دبی سگریٹ کا جلتے رہنا اور اُس کے جلنے سے اشوک کمار کا چونکنا اور اشوک کمار کے چلنے کا انداز، یہ سب فلم کی خصوصیات بن گئی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلم 'محل' ہندوستانی سینما کے لیے میل کا پتھر ثابت ہوئی۔

فلم 'محل' کے ہٹ ہوتے ہی کمال امروہی کا نام

ہندوستانی سینما پر چھا گیا اور پھر 1950 میں انھوں نے جب اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی تو اس کا نام 'محل پکچرز' ہی رکھا۔ 1954 میں انھوں نے اپنی فلم 'دائرہ' بنائی جو ناکام ہوگئی۔ یہ فلم ایک ایسی عورت کی کہانی تھی جو غلط فہمی کا شکار ہوکر ایک بوڑھے شخص سے شادی کر لیتی ہے اور پھر شروع ہوتا ہے اس کے استحصال کا سلسلہ۔ اس وقت یہ فلم ہندوستانی سینما کی پہلی آرٹ فلم کہلائی اور ایک تبصرہ نگار نے فلم 'دائرہ' دیکھ کر کہا کہ کمال امروہی نے یہ فلم اپنے وقت سے تیس برس قبل ہی بنادی ہے۔ مینا کماری اس فلم کی ہیروئن تھیں۔

'محل پکچرز' کے قائم ہونے پر کمال امروہی نے ایک بہت خوبصورت فلم 'انارکلی' کے نام سے بنانے کا ارادہ کیا۔ اس فلم میں وہ مینا کماری کو ہیروئن لینا چاہتے تھے۔ 1951 میں ایک کار حادثے میں مینا کماری کے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی ٹوٹ گئی تھی اور وہ پونا کے ایک اسپتال میں زیر علاج تھیں۔

کمال امروہی ہاتھوں میں گلدستہ لیے، آنکھوں میں 'انارکلی' کا خواب سجائے اور دل میں مینا کماری کی چاہت کا جذبہ لے کر مزاج پُرسی کے لیے اسپتال گئے اور اپنی ہمدردی کا ایسا سکہ جمایا کہ مینا کماری دل و جان سے کمال پر فدا ہوگئی۔ مینا کماری کے والد علی بخش کو یہ عشق پسند نہیں آیا۔

آخرکار 15 فروری 1952 کو مینا کماری نے اپنے والد اور دونوں بہنوں کی مرضی کے خلاف کمال امروہی سے نکاح کر لیا۔ اس طرح کمال امروہی کی 'انارکلی' تو نہ بن سکی، مگر مینا کماری ان کے دل کی دھڑکن ضرور بن گئی اور اس کے ساتھ ہی 'دائرہ' بن کر فلاپ بھی ہوگئی۔ اس وقت کمال امروہی کی امروہہ والی بیوی محمودی بیگم سے دو لڑکے شاندار کمال، تاجدار کمال اور ایک لڑکی رخسار کمال تھے۔

کمال امروہی کی پہلی بیوی کا نام ماہ رُخ بتول تھا اور وہ بے حد خوبصورت عورت تھیں۔ کمال امروہی پیار سے ان کو 'بانو' کہا کرتے تھے۔ شادی کے ایک برس بعد ہی پہلے بچے کی پیدائش کے وقت ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ کمال امروہی کی دوسری شادی بھی امروہہ میں ہی آل زہرہ عرف محمودی بیگم سے ہوئی۔ یہ تینوں بچے ان کی اسی بیوی سے ہیں۔ مینا کماری ان کی تیسری بیوی تھیں اور ان کو کمال امروہی کے تینوں بچوں سے بے حد پیار تھا۔ بچے بھی مینا کماری کو بہت چاہتے تھے اور پیار سے چھوٹی امی کہہ کر پکارتے تھے۔

مینا کماری کے انتقال (1972) اور فلم 'پاکیزہ' کی بے پناہ کامیابی کے بعد کمال امروہی نے رامپور کی ایک بہت خوبصورت لڑکی بلقیس سے نکاح کر لیا۔ ان کی یہ چوتھی بیوی اتنی خوبصورت تھی کہ فلم 'رضیہ سلطان' کی شوٹنگ پر جب وہ کمال صاحب کے ساتھ آتی تھیں تو ہیما مالینی کی خوبصورتی بھی ماند پڑ جاتی تھی۔ 'رضیہ سلطان' کی ناکامی سے ٹوٹ کر جب کمال امروہی بہت بیمار رہنے لگے تو انھوں نے بلقیس کو ایک بڑی رقم (شاید پچاس لاکھ) دے کر اپنی طرف سے آزاد کر دیا۔

'دائرہ' کی ناکامی کے بعد کمال امروہی نے ایک حسین خواب دیکھا اور فلم 'پاکیزہ' کی تیاری شروع کر دی۔ کمال امروہی اس فلم کو اپنی زندگی کا ایک شاہکار بنانا چاہتے تھے۔ مینا کماری اس فلم کی ہیروئن بھی تھیں اور کمال امروہی کی بیوی بھی۔ کمال امروہی کے پرسنل سکریٹری باقر علی کو یہ ہدایت تھی کہ مینا کماری کے میک اپ روم میں کسی کو جانے کی اجازت نہ دی جائے۔

ان دنوں گلزار مشہور فلم ساز و ہدایت کار بمل رائے کے اسسٹنٹ تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ بمل رائے کے کسی کام سے گلزار مینا کماری سے ملنے اسٹوڈیو گئے تھے اور ان کے میک اپ روم میں اپنی نظمیں سنا رہے تھے۔ باقر علی سے اسی بات پر مینا کماری کا جھگڑا ہو گیا اور مینا کماری یہ کہہ کر اپنے بہنوئی مزاحیہ اداکار محمود کے گھر چلی گئی کہ جب کمال امروہی خود اُسے بلانے آئیں گے، تبھی وہ کمال صاحب کے گھر واپس جائے گی۔

کمال صاحب بھی بڑے خوددار انسان تھے۔ لہٰذا 'پاکیزہ' کی شوٹنگ درمیان میں ہی رُک گئی۔ کمال صاحب کی بھی ضد تھی کہ مینا کے بغیر 'پاکیزہ' مکمل نہیں کریں گے۔ اس درمیان 'پاکیزہ' کے ساتھ بھی کئی حادثے ہوئے۔ ایک بار اسٹوڈیو میں آگ لگنے سے تمام کاسٹیوم اور قیمتی سامان جل کر خاک ہو گیا۔

اسی درمیان بطور فلم ساز کمال امروہی نے کشور ساہو کی کہانی اور اُن ہی کی ہدایت میں فلم 'دل اپنا اور پریت پرائی' کی تکمیل کی اور یہ فلم بہت کامیاب ثابت ہوئی۔

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ کے۔ آصف نے اپنی مشہور زمانہ فلم 'مغل اعظم' کی کہانی سب سے پہلے کمال امروہی سے ہی لکھوائی تھی، اور یہ وہی کہانی تھی جس پر 'انارکلی' کے نام سے کمال امروہی خود ایک فلم بنانا چاہتے تھے۔ بعد میں دونوں میں کسی بات پر خیالات کا ٹکراؤ ہو گیا اور کے۔ آصف نے تین دوسرے ادیبوں، (وجاہت مرزا چنگیزی، امان اللہ خان اور احسن رضوی) کے ساتھ ہی کمال امروہی کو بھی شامل کر کے ایک ٹیم بنائی اور الگ الگ مناظر اِن ادیبوں سے لکھوائے۔ حالانکہ اس فلم کے مناظر کو سنوارنے اور مکالموں کو بھاری بھرکم بنانے میں کمال امروہی نے سب سے زیادہ محنت کی تھی۔

اسی کے ساتھ مجھے 14 مارچ 1974 کا وہ دن یاد آیا جب میں نے کمال امروہی سے ان کے امروہہ والے گھر کے آنگن میں بیٹھ کر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ طویل انٹرویو کیا تھا، اور اس کے بعد بھی بہت سی فلمی اور ذاتی باتیں آف دی ریکارڈ انھوں نے بتائی تھیں۔ فلم 'پاکیزہ' زبردست کامیاب ہو چکی تھی، اور وہ اپنی اگلی فلم 'رضیہ سلطان' کا خاکہ ذہن میں بنا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کو ایک اور فکر نے گھیرا تھا، اور وہ یہ کہ کمال امروہی چاہتے تھے کہ ان کی چہیتی بیٹی رُخسار زہرا کی شادی اُن کے وطن امروہہ میں ان کے شایان شان ہونی چاہیے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے آبائی مکان کے اس حصے کو نئے سرے سے تعمیر کرانے کا ارادہ کیا، جو انھوں نے اپنے تایا زادوں کے پاکستان چلے جانے پر کسٹوڈین سے خریدا تھا، اور یہ تایا زادے کوئی اور نہیں، بلکہ عالمی شہرت یافتہ رئیس امروہی، جون ایلیا، سید محمد تقی اور سید محمد عباس جیسے جید لوگ تھے۔ جن کا بچپن اور نوجوانی کا کچھ حصہ اسی گھر کے آنگن میں کھیلتے، کودتے، لکھتے اور پڑھتے ہوئے گزرا تھا۔ کمال امروہی نے اس مکان کو قدیم و جدید طرزِ تعمیر کے مطابق بنوایا، اور 5 جون 1976 کو بڑی دھوم دھام سے اپنے بزرگوں کے مکان کی اُسی ڈیوڑھی سے اپنی دُلاری لاڈلی بیٹی رُخسار زہرا کو رخصت کیا جسے پیار سے وہ 'بٹیا' کہا کرتے تھے۔ راقم الحروف بھی اس شادی میں شریک تھا۔

اُسی انٹرویو میں کمال صاحب نے اپنے قلم سے لکھے ہوئے چند یادگار مکالمے بھی سنائے تھے جن سے اُن کے قلم کی جادوگری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

فلم 'مغل اعظم' کا ایک منظر، جو آصف صاحب نے فلم میں شامل نہیں کیا، کمال امروہی کو بہت پسند تھا اور فلم

میں اس منظر کو شامل نہ کیے جانے کا دکھ بھی تھا۔ انھیں کے الفاظ میں.....

فلم 'مغلِ اعظم' کا ایک جملہ، جو میں نے لکھا تھا اور مجھے بہت پسند تھا، مگر بدقسمتی سے وہ فلم میں نہیں آیا۔ نہ معلوم کیوں آصف صاحب نے اس کا استعمال نہیں کیا۔ وہ سین کچھ اس طرح تھا.....

سلیم ایک شہزادہ تھا اور انارکلی ایک کنیز تھی۔ ایک رات سلیم کو نیند نہیں آتی اور اسی بے قراری کے عالم میں وہ اپنے بستر سے اٹھ جاتا ہے اور درجن سنگھ سے کہتا ہے کہ میں ابھی انارکلی سے ملنے اس کے حجرے میں جا رہا ہوں، جہاں وہ اس وقت موجود ہے۔ درجن سنگھ بہت منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اتنے بڑے ہندوستان کا شہزادہ کنیزوں اور غلاموں کے گھر جائے گا، یہ مناسب نہیں ہے۔ کل جب یہ بات اکبر اعظم کو معلوم ہوگی تو کتنا افسوس ہوگا۔ سلیم کیوں کہ بڑا ہی ضدی اور ہٹیلا تھا، اس لیے نہیں مانتا اور درجن سنگھ کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

سلیم کمند ڈال کر اوپر اٹاری میں پہنچ جاتا ہے۔ نیچے درجن سنگھ پہرہ دے رہا ہے۔ سلیم نے دیکھا کہ شمع کی روشنی میں انارکلی سو رہی ہے اور شاید خواب میں سہم رہی ہے اور اس لیے سہم رہی ہے کہ شاید وہ خواب میں شہزادے کو ہی دیکھ رہی ہے اور ساتھ ہی کچھ سمٹ بھی رہی ہے۔ نہ جانے خواب میں کیا ہوا کہ گھبرا کر اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا کہ شہزادہ خود اس پر جھکا ہوا اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ اس کو یقین نہیں آیا اور وہ سمجھی کہ یہ شاید خواب ہی ہے اور میں جاگ نہیں رہی ہوں۔

جب اچانک سلیم اس سے کہتا ہے کہ تم جاگ اٹھی ہو اور یہ خواب نہیں ہے۔ میں حقیقت میں تمھارے قریب موجود ہوں۔ تب وہ گھبرا کر اٹھ جاتی ہے اور سوال کرتی ہے۔ "آپ یہاں کیسے آ گئے؟ اس وقت اگر آپ کو یہاں دیکھ لیا گیا تو مجھ پر بڑی مصیبت نازل ہوگی۔"

سلیم کہتا ہے۔ "یہ تو رات کا وقت ہے اور اس اندھیرے میں مجھے یا تمھیں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔" انارکلی کہتی ہے۔ "عالم پناہ کی نگاہیں پتھر کی دیواروں میں دراڑیں ڈال کر دیکھا کرتی ہیں۔"

یہ سُن کر شہزادہ غصہ میں آ جاتا ہے اور انارکلی کو بستر سے اٹھا لیتا ہے، کہتا ہے۔ "کیا تو ہر وقت اکبر اعظم سے سہمی رہے گی؟ ابھی تک تجھے یہ معلوم نہیں کہ کون تجھ سے محبت کرتا ہے..... آ..... آج میں تجھے اپنا تعارف کراؤں..... وہ صرف اکبر اعظم ہیں اور میں ان کے ماتھے پر پڑا ہوا وہ نشان ہوں جو شیخ سلیم چشتی کی درگاہ کی چوکھٹ پر رگڑتے رگڑتے پیدا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر وہ انارکلی کو بستر پر پھینک دیتا ہے اور اس کے حجرے سے باہر نکل آتا ہے۔"

کمال امروہی کے قلم میں جادو تھا۔ وہ مکالموں کو اس طرح سجا سنوار کر لکھتے تھے کہ مکالمے اپنا پورا اثر فلم بینوں پر چھوڑتے تھے۔ اسی طرح جب کمال امروہی نے فلم 'بہرام خاں' لکھی تو اس کے ایک منظر میں اکبر اعظم کو کسی نے بہکایا کہ بہرام خان آہستہ آہستہ تمھارے ہاتھ سے تختِ سلطنت کو کھینچ رہا ہے اور اپنے لیے تختِ سلطنت کی بنیاد رکھ رہا ہے، جس کی دلیل یہ دی گئی کہ اس کے یہاں اب اولاد بھی ہو گئی ہے (عبدالرحیم خانخاناں)۔ جب اکبر کو یقین آ گیا کہ واقعی یہ سب سے بڑا سیاستداں ہے۔ اب اس کے یہاں اولاد بھی ہو گئی ہے اور یہی حکومت کی ریڑھ بھی ہے۔ یہ جب چاہے سلطنتِ مغلیہ کو الٹ سکتا ہے۔ یہ خبر بہرام خاں تک بھی پہنچ گئی اور چونکہ وہ انتہائی وفادار تھا، اس لیے اس کو بہت رنج ہوا اور وہ اپنی صفائی

دینے کے لیے خود اکبر کے سامنے حاضر ہوا۔ اپنی صفائی میں اس کے منہ سے ایک ہی جملہ نکلا۔

"یہ وہ جملہ ہے جو مجھے میرے لکھے ہوئے مکالموں میں بے حد پسند ہے۔"

کمال صاحب یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔

"بہرام خاں نے کہا تھا..... "ہاں مہابلی! بہرام باغی ہے۔ وہ بہرام، جس نے سلطنتِ مغلیہ کی حدود کو دھکیلتے دھکیلتے اور ان سرزمینوں میں اپنا گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے اتنا وقت گزار دیا کہ اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو گرد اڑی، اس گرد سے اس کی داڑھی کا سر سفید ہو گیا..... " یہ سُن کر اکبر بھی رو دیا۔"

کمال صاحب 'پاکیزہ' کا ایک مکالمہ جو انھیں بہت پسند تھا، سناتے ہیں..... "اسی طرح فلم 'پاکیزہ' میں جب اشوک کمار اپنی محبوبہ سے باہر نہیں نکاح کر کے لے اپنے گھر لے کر آتے ہیں، تو ان کے باپ نے کہا....." یہ ایک بازاری گالی ہے جو تم ہمارے خاندان کو نہیں دے سکتے۔"

اسی طرح فلم 'رضیہ سلطان' میں جب شہزادہ رکن الدین کی عیاشیوں اور مظالم کی خبر سن کر بادشاہ التتمش رضیہ کو کمان سونپ کر واپس آتا ہے تو فریادی کی فریاد سن کر تلوار ہاتھ میں لیے شہزادے کی تلاش میں جاتا ہے جو اپنی ماں شاہ ترکان کی پشت کے پیچھے چھپا بیٹھا ہے۔ وہاں بادشاہ اپنی بیوی شاہ ترکان سے کہتا ہے کہ.....

"یہ تیرے بدچلن بیٹے میرے کسی ایسے ناکردہ گناہ کی سزا ہیں جو شاید اب مجھے بھی یاد نہیں۔"

یہ کمال امروہی کے دل کی آواز تھی جو انھوں نے اپنے قلم کے ذریعے فلمی اسکرین پر رقم کر دی تھی۔

اردو کے مقبول ترین اور عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے فلم 'پکار' دیکھ کر اس کی زبان اور لہجے کے بارے میں بہت متاثر ہو کر ایک تبصرے میں لکھا تھا.....

"زبان بھی سبحان اللہ، امیر حیدر کمال کی، اعلیٰ اور بے حد اعلیٰ زبان۔"

کمال امروہی کی صلاحیتوں کا یہ عالم کہ فلم 'پاکیزہ' کے ایک سین میں جب فلم کے ہیرو راج کمار شادی کرنے کے لیے ہیروئن مینا کماری کو لے جا رہے ہیں تو راستے میں ایک اوباش قسم کے شخص سے جھگڑا ہو جاتا ہے اور پولیس فریقین کو تھانے میں لے جاتی ہے، جہاں ایک بزرگ اور شفیق سے تھانیدار صاحب جب راج کمار سے دریافت کرتے ہیں کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ تو جواب میں راج کمار بتاتے ہیں کہ وہ ایک فاریسٹ آفیسر ہیں۔ تھانیدار صاحب کھڑے ہو جاتے ہیں اور بڑے مشفقانہ لہجے میں کہتے ہیں کہ..... "آپ جیسے باعزت شخص کا اس معاملے میں تھانے میں آنا اچھا نہیں لگا۔ آپ جا سکتے ہیں۔" کمال صاحب کے قلم کا کمال یہ تھا کہ وہ ایک ہی جملے میں پورے سین کو سمیٹ کر لکھ دیتے تھے۔

'پاکیزہ' ابھی ادھوری ہی تھی، جب مینا کماری، کمال امروہی کا گھر چھوڑ کر اپنے بہنوئی مزاحیہ اداکار محمود کے گھر چلی گئی تھیں۔ کمال کی ضد تھی کی وہ 'پاکیزہ' کو مینا کے بغیر مکمل نہیں کریں گے۔ لہٰذا کئی برس کے بعد سنیل دت، نرگس، خیام اور چترا کی کوششوں سے مینا کماری اور کمال امروہی کے درمیان 'پاکیزہ' کو مکمل کرنے کا سمجھوتہ ہوا اور اس طرح 14 برس کے لمبے عرصے کے بعد جب 'پاکیزہ' مکمل ہو کر پردہ سیمیں پر آئی تو اس کی کامیابی دیکھنے کے لیے مینا کماری زیادہ دن زندہ نہ رہ سکیں۔ 4 فروری 1972 کو ممبئی میں اور 12 فروری 1972 کو پورے ہندوستان میں 'پاکیزہ' نمائش کے لیے پیش ہوئی اور 31 مارچ 1972 کو مینا کماری نے اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔

کمال امروہی کی اس فلم نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ اس کے ساتھ ہی کمال صاحب کے پاس بہت سے فلمسازوں کے آفر آئے، مگر کمال صاحب نے 'رضیہ سلطان' کے روپ میں ایک اور حسین خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ہیما مالنی اور دھرمیندر کو لے کر بڑے عالیشان انداز میں اس فلم کو شروع کیا گیا۔ یہ ایک تاریخی فلم تھی اور اس کی شوٹنگ پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔

کمال صاحب بڑی محنت سے یہ فلم بنا رہے تھے۔ اپنے وقت کی اس سب سے مہنگی فلم کو فلم بینوں نے قبول نہیں کیا اور کمال صاحب کو بہت بڑی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دس برس کی محنت اور لگ بھگ ساڑھے چھ کروڑ کی لاگت سے بنی یہ شاندار فلم پہلے ہی ہفتے میں فلاپ ہو گئی۔ اسی درمیان ان کے چھوٹے بیٹے تاجدار امروہی نے کمال امروہی کی کہانی پر ایک چھوٹے بجٹ کی فلم 'شنکر حسین' بنائی، اس فلم کے گیت کافی مقبول ہوئے مگر فلم نہ چل سکی۔ اس فلم کی ہدایت کمال امروہی کے معاون ہدایت کار یوسف نقوی نے دی تھی اور اس فلم کا موضوع قومی یکجہتی تھا۔

کمال صاحب پرفیکشن (Perfection) کے حامی تھے۔ کتنا ہی پیسہ لگ جائے، کتنا ہی وقت لگ جائے کوئی پرواہ نہیں، مگر سین میں پرفیکشن آنا چاہیے۔ فلم 'رضیہ سلطان' کے زمانے میں انھوں نے ایک شاہی دعوت کے سین میں دیسی گھی کے کھانے بنوائے تھے۔ جب لوگوں نے اس بارے میں دریافت کیا کہ کیمرے میں دیسی گھی یا ڈالڈا گھی کے بارے میں کیا پتہ چلے گا؟ تب کمال صاحب نے کہا تھا کہ بادشاہ کی طرف سے دعوت ہو رہی ہے۔ دعوت میں جو لوگ شامل ہیں جب وہ دیسی گھی کے کھانے تناول فرمائیں گے تو ان کے چہرے کے تاثرات سے پتہ چلے گا کہ وہ کتنا لذیذ کھانا کھا رہے ہیں۔

اسی طرح 'پاکیزہ' میں مینا کماری کا جھمکا گلاب سے بھری ہوئی حوض میں گر جاتا ہے اور اس کی کنیز کی بڑی خواہش ہے گلاب کے حوض میں نہانے کی۔ جب وہ جھمکا تلاش کرنے حوض میں کودتی ہے اور باہر نکلتی ہے تو اس کے چہرے کے تاثرات سے پتہ چلتا ہے کہ آج گلاب کے پانی میں نہا کر وہ کتنی خوش ہے۔ اس طرح کمال صاحب آرام آرام سے اپنی مرضی کی فلم بناتے تھے۔ فلم بنانا ان کی مجبوری یا ان کا دھندا نہیں تھا بلکہ وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے فلم بناتے تھے۔

فلمی دنیا کے لیے ان کی حیثیت کئی طرح سے قابل قدر ہے۔ وہ جب سہراب مودی کے لیے فلم 'جیلر' لکھ رہے تھے تو فلمی ادیبوں میں سب سے کم عمر کے ادیب تھے۔ فلموں میں کہانی کاروں اور مکالمہ نگاروں کی کوئی وقعت کمال امروہی سے پہلے نہیں تھی۔ انھوں نے ادیبوں کو ایک خاص، قابل احترام اور اہم مقام دلانے میں پہل کی۔ فلم 'محل' کی ہدایت اور کہانی لکھ کر انھوں نے ہندوستانی سنیما میں سسپنس فلموں کا آغاز کیا۔ اشوک کمار اور مدھوبالا کو نئے انداز میں پیش کر کے معیاری سینما کے لیے ایک خاص حیثیت بخشی۔ اردو زبان کے خوبصورت اور بے ستورے شاندار، پُر وقار مکالموں کی داغ بیل فلم 'پکار' سے ڈالی۔ 'دائرہ' کے روپ میں ہندوستانی سینما کی پہلی آرٹ فلم بنائی۔ "آئے گا آنے والا......" گیت 'محل' کے لیے گا کر لتا منگیشکر بھی ہندوستانی فلم سنگیت میں اپنا مقام بنا سکیں۔

کمال امروہی نے کہانی کار اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے جیلر، پکار، محل، دائرہ، میں ہاری، شاہجہاں، بہرام خاں، رومیو جولیٹ، مزار، پھول، دل اپنا اور پریت پرائی، مغل اعظم، بھروسہ، پاکیزہ، شنکر حسین اور 'رضیہ سلطان' جیسی فلمیں ہندوستانی سینما کو دیں۔

'رضیہ سلطان' کے بعد وہ 'آخری مغل' نام سے بہادر شاہ ظفر کی زندگی پر ایک فلم بنانا چاہتے تھے، مگر خود ان کی زندگی نے ساتھ نہیں دیا۔ اس کے ساتھ ہی راجیش کھنہ کے ساتھ فلم 'مجنوں' بھی شروع کی تھی، مگر 15 لاکھ روپے خرچ کر کے فلم کا شاندار مہورت ہوا اور فلم اس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ کمال صاحب کے کئی خواب ادھورے رہ گئے۔ نکلتی جھونپڑی میں ٹیکس کے پرابلم کو لے کر بھی وہ ایک فلم بنانا چاہتے تھے۔ مگر ان کی گرتی ہوئی صحت نے اس پروجیکٹ کو بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔

انھوں نے اپنی فنی اور تخلیقی زندگی میں اعلیٰ درجے سے کسی قدر کم درجے کی تخلیق سے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ فن اور تخلیقِ فن کی دنیا کے بے حد غیر مطمئن آدمی تھے۔ وہ خود کمال تھے اور انھیں ہر لمحہ کمال کرنے کی جستجو ستاتی رہتی تھی۔

اعلیٰ مرتبے کے تخلیق کار ہمیشہ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ان کا معاملہ بھی یہی تھا۔ وہ ایک مثالیہ پسند یا آدرش وادی (Idealistic) شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک ادیب اور ایک فنکار کی حیثیت سے ہمیشہ ایک اعلیٰ اور ارفع ادب پارے اور فنی شاہکار کی تلاش اور طلب میں رہتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ یہی خواہش رکھی کہ عوام ان کی سطح تک پہنچیں۔ وہ اردو ادب کی تاریخ اور تہذیب کے شاہکار تھے۔

اردو زبان اور فلموں کو کئی تاج محل، دربار عام، دربار خاص جیسے شاہکار عطا کرنے والے اس فن کار نے 11 فروری 1993 کو دل کی حرکت بند ہو جانے سے باندرہ، بمبئی کے ایک نرسنگ ہوم میں اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔ اس طرح ہندوستانی سینما کا ایک دور ختم ہو گیا۔

■

Anees Amrohvi F-5, First Floor, Jawahar Park (w), Laxmi Nagar, Delhi - 110092, M.: 9811612373, Email: qissey@rediffmail.com

زیب النساء سعید

ادبی کوئز

(1) مولانا ابوالکلام آزاد کا تاریخی نام کیا تھا؟
(الف) غلام محی الدین (ب) ابوالکلام
(ج) فیروز بخت (د) محی الدین احمد

(2) سید مسعود حسن رضوی ادیب کہاں پیدا ہوئے تھے؟
(الف) اناؤ (ب) لکھنؤ
(ج) بہرائچ (د) الٰہ آباد

(3) فراق گورکھپوری کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟
(الف) 2 ستمبر 1892 (ب) 3 مارچ 1893
(ج) 20 اگست 1895 (د) 28 اگست 1896

(4) مولانا غلام رسول مہر نے خود اپنا کون سا اخبار جاری کیا تھا؟
(الف) زمیندار (ب) انقلاب
(ج) مہر نیم روز (د) پیسہ

(5) تاجور نجیب آبادی کا اصل نام کیا تھا؟
(الف) احسان اللہ خان (ب) اکرام اللہ
(ج) افغان اللہ خان (د) فضل اللہ خان

(6) محمد دین تاثیر کا آبائی وطن کہاں تھا؟
(الف) پنجاب (ب) اتر پردیش
(ج) کشمیر (د) دہلی

(7) ان میں کون سی کتاب آل احمد سرور کی نہیں ہے؟
(الف) نئے اور پرانے چراغ (ب) ذوق جستجو
(ج) تنقیدی اشارے (د) ہندوستان کدھر؟

(8) اوپندر ناتھ اشک کہاں پیدا ہوئے تھے؟
(الف) امرتسر (ب) لدھیانہ
(ج) پشاور (د) جالندھر

(9) علامہ اقبال کی مثنوی 'اسرار خودی' کو کس سنہ میں سو سال پورے ہوئے؟
(الف) 2012 (ب) 2013
(ج) 2014 (د) 2015

(10) ماہنامہ 'شب خون' کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا تھا؟
(الف) جون 1965 (ب) جون 1966
(ج) جولائی 1966 (د) جولائی 1965

(11) داغ دہلوی کا پورا نام کیا تھا؟
(الف) نواب محمد علی خان (ب) نواب مرزا خان
(ج) مرزا اجل خاں (د) نواب یوسف خاں

(12) آنند نرائن ملا کہاں کے ہائی کورٹ میں جج مقرر ہوئے تھے؟
(الف) مدراس (ب) دہلی
(ج) الٰہ آباد (د) کلکتہ

(13) پروفیسر محمد مجیب کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟
(الف) لکھنؤ (ب) دہلی
(ج) پانی پت (د) حیدرآباد

(14) مجنوں گورکھپوری نے کس یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا؟
(الف) حیدرآباد یونیورسٹی
(ب) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
(ج) کلکتہ یونیورسٹی (د) گورکھپوری یونیورسٹی

(15) ماہنامہ 'ادیب' کب سے شائع ہونا شروع ہوا تھا؟
(الف) مئی 1941 (ب) جون 1942
(ج) مئی 1943 (د) جون 1944

(16) 'عقد ثریا' (تذکرہ فارسی گویاں) کس کی تالیف لطیف ہے؟
(الف) میر تقی میر (ب) غلام ہمدانی مصحفی
(ج) میر حسن دہلوی
(د) قیام الدین قائم چاند پوری

(17) فیض احمد فیض صدی کس برس منائی گئی تھی؟
(الف) 2010 (ب) 2011
(ج) 2012 (د) 2013

(18) شوکت تھانوی نے اپنا کون سا روزنامہ جاری کیا تھا؟
(الف) نقاد (ب) سرپنچ
(ج) انکشاف (د) طوفان

(19) میر قدرت اللہ قاسم کے تذکرہ 'مجموعہ نغز' کو کس نے مرتب کیا تھا؟
(الف) مولوی عبدالحق (ب) حافظ محمود شیرانی
(ج) نصیر الدین ہاشمی (د) محی الدین قادری زور

(20) کالی داس کی تصنیف 'شکنتلا' کا اردو ترجمہ کس نے کیا تھا؟
(الف) عبدالباری آسی (ب) حیدر بخش حیدری
(ج) مرزا کاظم علی جوان (د) مظہر علی خان ولا

(21) مولوی نذیر احمد کا ناول 'فسانۂ مبتلا' کا پہلا اڈیشن کب چھپا تھا؟
(الف) 1885 (ب) 1887
(ج) 1888 (د) 1889

(22) 'عجائبات فرنگ' کس کا لکھا ہوا سفرنامہ ہے؟
(الف) مولوی بشیر الدین (ب) منشی نرائن جہاں
(ج) یوسف خاں کمبل پوش
(د) خلیل احمد اشک

(23) 'تلاش کی جستجو' کس کی لکھی ہوئی خود نوشت ہے؟
(الف) انتظار حسین (ب) شہرت بخاری
(ج) مرزا ادیب (د) حمید نسیم

(24) 'مغرب کے تنقیدی اصول' کس کی کتاب ہے؟
(الف) وزیر آغا (ب) سجاد باقر رضوی
(ج) کلیم الدین احمد (د) باقر مہدی

(25) واجد علی شاہ کی کلکتہ آمد کب ہوئی تھی؟
(الف) 12 مئی 1856 (ب) 20 مئی 1857
(ج) 12 مئی 1858 (د) 22 مئی 1859

(26) عطا حسین خان تحسین کی کتاب 'نوطرز مرصع' کا ترجمہ 'باغ و بہار' کے نام سے کس نے کیا تھا؟
(الف) حیدر بخش حیدر (ب) میر شیر علی افسوس
(ج) محمد حسین کلیم (د) میر امن دہلوی

(27) افلاطون کی کتاب 'ری پبلک' کا اردو ترجمہ 'ریاست' کے نام سے کس نے کیا تھا؟
(الف) ڈاکٹر ذاکر حسین (ب) سید سجاد حسین
(ج) سید عابد حسین (د) غلام السیدین

(28) ستمبر 1918 میں منظر عام پر آنے والا رسالہ 'کہکشاں' کس کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا؟
(الف) سید ممتاز علی (ب) راشد الخیری
(ج) امتیاز علی تاج (د) خواجہ حسن نظامی

(29) 'جگت گرو' (1580-1627) کے نام سے کون سی شخصیت مشہور تھی؟
(الف) ابراہیم عادل شاہ اول
(ب) ابراہیم عادل شاہ ثانی
(ج) علی عادل شاہ اوّل
(د) علی عادل شاہ ثانی

(30) 'تہذیب نسواں' لاہور کی اشاعت کس سنہ میں ہوئی تھی؟
(الف) 1894 (ب) 1895
(ج) 1897 (د) 1898

(31) رسالہ 'زمانہ' کے پہلے مدیر کون تھے؟
(الف) شیو برت لال ورمن (ب) منشی دیا نرائن نگم
(ج) منشی پریم چند (د) مہاشہ سدرشن

(32) کنہیا لال کپور کس کے شاگرد تھے؟
(الف) مرزا فرحت اللہ بیگ
(ب) عظیم بیگ چغتائی
(ج) پطرس بخاری (د) قاضی عبدالغفار

(33) 'گرد راہ' کس کی خود نوشت ہے؟
(الف) خلیق ابراہیم خلیق
(ب) اختر حسین رائے پوری
(ج) ادا جعفری
(د) اکبر حمیدی

(34) وامق جونپوری کا اصل نام کیا تھا؟
(الف) رضی احمد زیدی (ب) احمد مجتبیٰ زیدی
(ج) احمد رضی مجتبیٰ (د) اجتبیٰ رضوی

(35) سیح الہ آبادی نے اپنا کون سا دوسرا نام اختیار کیا تھا؟
(الف) اجتبیٰ زیدی (ب) مرتضیٰ زیدی
(ج) مصطفیٰ زیدی (د) مجتبیٰ زیدی

(36) راجندر سنگھ بیدی نے پہلی ملازمت کس شعبے میں اختیار کی؟
(الف) پوسٹ آفس (ب) ریلوے
(ج) پبلسٹی ڈپارٹمنٹ (د) آل انڈیا ریڈیو

(37) 1857 میں ان میں سے کس شخصیت کی پیدائش ہوئی تھی؟
(الف) عبدالحلیم شرر (ب) منشی سجاد حسین
(ج) مرزا ہادی رسوا (د) شبلی نعمانی

(38) صفی اورنگ آبادی کا ان کے والد نے بچپن میں کیا نام رکھا تھا؟
(الف) میر بہبود علی (ب) بہاء الدین صفی
(ج) محمد بہاء الدین (د) بہبود علی صدیقی

(39) عبدالسلام ندوی کس ادارے کے سرگرم رکن تھے؟
(الف) انجمن ترقی اردو (ب) دارالمصنفین
(ج) ادارہ ادبیات اردو (د) ادارہ دارالترجمہ

(40) برج نرائن چکبست نے کون سا پیشہ اختیار کیا تھا؟
(الف) ڈاکٹر (ب) انجینئر
(ج) وکیل (د) مدرس

(41) برج موہن دتاتریہ کیفی کا انتقال کس شہر میں ہوا؟
(الف) غازی آباد (ب) بجنور
(ج) دہلی (د) مرادآباد

(42) 'گودڑ کا لال' کس کا لکھا ہوا ناول ہے؟
(الف) عباسی بیگم (ب) اکبری بیگم
(ج) نذر سجاد (د) صغرا ہمایوں

(43) سرسید احمد خان کے لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کس نے فریضہ انجام دیا تھا؟
(الف) ظفر علی خان
(ب) عنایت اللہ دہلوی
(ج) مولوی وحید الدین سلیم
(د) مولوی عبدالحق

(44) سر شیخ عبدالقادر نے رسالہ 'مخزن' کب جاری کیا تھا؟
(الف) اپریل 1901 (ب) مئی 1902
(ج) اپریل 1903 (د) مئی 1904

(45) 'ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر' کس کا افسانہ ہے؟
(الف) سجاد حیدر یلدرم
(ب) مہدی افادی
(ج) میر ناصر علی
(د) نیاز فتح پوری

(46) 'محاسن کلام غالب' کس کی کتاب ہے؟
(الف) محمد حسین آزاد (ب) عبدالرحمٰن بجنوری
(ج) عبدالباری آسی (د) الطاف حسین حالی

(47) ملا رموزی کا اصل نام کیا تھا؟
(الف) احمد صدیق (ب) صدیق رضا
(ج) صدیق ارشاد (د) محمد صدیقی

(48) ڈاکٹر سید عابد حسین 1926 سے آخری وقت تک کس تعلیمی ادارے سے وابستہ رہے؟
(الف) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ب) جامعہ ملیہ اسلامیہ
(ج) دہلی یونیورسٹی (د) الہ آباد یونیورسٹی

صحیح جوابات

1. ج	2. ج	3. د	4. ب	5. الف
6. ج	7. ب	8. د	9. د	10. ب
11. ب	12. ج	13. الف	14. ج	15. الف
16. ب	17. ب	18. د	19. ب	20. ج
21. الف	22. ج	23. د	24. ب	25. الف
26. د	27. الف	28. ج	29. ب	30. د
31. الف	32. ج	33. ب	34. ب	35. ج
36. الف	37. د	38. د	39. ب	40. ج
41. الف	42. ب	43. ج	44. الف	45. د
46. ب	47. ج	48. ب		

تاریخ ادب اردو (جلد یازدہم)

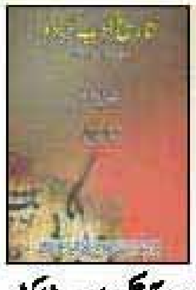

مصنف: محمد انصار اللہ

صفحات: 540، قیمت: 164 روپے، پہلی طباعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد شمس الدین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

اردو زبان و ادب کی تاریخ پر اب تک کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر سیدہ جعفر جیسے اہم تاریخ نویسوں کے علاوہ دیگر کئی مؤرخین نے اردو ادب کی تاریخ قلم بند کی ہے۔ اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے کئی اہم کام کیے ہیں۔ ان میں سے ایک وقیع کام تاریخ ادب اردو کی تقریباً سترہ جلدوں کا اشاعتی سلسلہ بھی ہے۔ جن کی اب تک گیارہ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس کے مصنف پروفیسر محمد انصار اللہ نے دیگر تاریخی کتابوں سے ہٹ کر علاقائی اعتبار سے اردو ادب کی تاریخ پیش کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں گیارہ علمی و ادبی مراکز کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جن میں فیض آباد، کانپور، الہ آباد، بنگال، گجرات، احمد آباد، بمبئی، دکن، کرناٹک و اطراف کے علاوہ بیرون ممالک یعنی ایران، افغانستان، نیپال، برما اور سری لنکا میں اردو کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر علاقے کو شاعری مثلاً غزل، مرثیہ، مثنوی، ریختی اور نثر وغیرہ پر تقسیم کرکے شعرا اور نثر نگار کی خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کئی جگہ مذہبی نثر کا عنوان دے کر اس موضوع سے متعلق بھی معلومات فراہم کی گئی ہے۔

فیض آباد کی ادبی شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے اعجاز، ترقی، سوزاں، بریاں، ناسخ، آتش، وہاب، رفعت، خلیق، خلق، انیس، نامی، رشک، رند، واقف، والہ کا نام غزل گو شعرا میں، نازک، دولھن کا شاعرات میں، انور، شغل، میر کا مرثیہ نگاروں میں تذکرہ کرنے کے علاوہ حازم، محقوق اور احمد علی کی خدمات بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کانپور کے ادبا کا تذکرہ کرتے وقت مہر، ناسخ، سید، رشک، خرم، رشک، فرد، سرور، یوسف، اور عباس علی فاروقی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کانپور کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ شروع زمانے میں کانپور کے کئی نام سامنے آتے ہیں۔ کمپ، کنپو، کنہپور، کانہہ پور اور کانپور۔ الہ آباد کی شخصیات کا بیان کرتے ہوئے ناسخ، نادر، اعظم، قدسی، افضل، مظلوم، فریاد، اعظم، جلال، قران، انور، حسین، کرامت علی، شوکت نادری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ خطہ بہار کی ادبی شخصیات کے بارے میں بتاتے ہوئے خیالی، قدوی، عاشق، راجا، راسخ، فرحت، یاس، فرد، محترم، ترقی، شہود، راسخ، عاشق، قمر علی، شہود اور ذوالفقار علی کا ذکر ملتا ہے۔

بنگال اور مضافات یعنی مرشد آباد، کلکتہ، ہوگلی، ڈھاکہ اور سلہٹ کی ادبی شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے مرزا محمد عسکری، حمایت علی، عجائب رام، میر مبارک علی، ہدم اور فصیح جیسی ادبی شخصیات کی خدمات کا ذکر ہوا ہے۔ صوبہ متوسط یعنی برار، برہانپور، بھوپال، جبل پور اور ناگپور جیسے مقامات کی ادبی شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے جنرل، جانباز، احسن، حافظ شجاع الدین، دولھا، اشکر، روبیت، مقتدور، مسکین، کرم، واصل، احمد یار خاں، علی اکبر، تمکین اور حشمت کی خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گجرات یعنی احمد آبادی، بڑودہ، بھڑوچ، بھگین، سورت، کھمبایت کی شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے باقر، وحید، نصیری، شیدا، صاحب، ضاحک، ذاکر، عباس، کریم، محب، اخلاص، فرحت، تمکین، مخفی، احمد، عقیب، اختر، عشق، لطیف، شمس، کاظم اور احمد کی خدمات بیان کی گئی ہیں۔ گجرات کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ گجرات کا قدیم نام 'گوجر راشٹر' یعنی گوجروں کی مملکت بتایا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ گوجر بعد میں 'شدھ' ہو کر راجپوت کہلائے۔ بمبئی کی شخصیات کے بارے میں بتاتے ہوئے سپاہی، محی الدین، یوسف، فاطمہ عبد القادر، ابراہیم مقبہ، نظام الدین، یوسف اور صالح محمد کی خدمات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ دکن یعنی حیدرآباد، اورنگ آباد، کرنول کی اہم شخصیات کی خدمات پر نظر ڈالتے ہوئے شاداں، نصیر، حفظ، اولیں، شرر، شہرت، آفاق، مسرت، حمید، طوفان، حقلاں، فیض، قاسم، لعل، بابا قادری، حسین علی، رتن لعل، شاہ علی، جعفر، صالح، شوق، عمر، غلام نبی، سعید الدین، ظہور، شہسوار، جوہر اور واقف کی خدمات کا تذکرہ ملتا ہے۔ کرناٹک اور اس کے متعلقات یعنی میسور اور مدراس کے بارے میں بتاتے ہوئے میر محمد حیات اور عبد الغفور کی خدمات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ بیرون ملک یعنی ایران، افغانستان، نیپال، برما اور لنکا میں اردو کی تاریخ بیان کرتے ہوئے محمود، سفیر، خورشید، جناب کشن نرائن، مولوی رمضان الحق، محمد صالح، مسرور، باجن اور ناصر کی خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے منقسمہ ہر حصے کے آخر میں حواشی و تعلیقات دیے گئے ہیں اور تقریباً ڈھائی سو مآخذ موجود ہیں۔ جس سے مصنف کی وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں ادبی شخصیات کے ہمہ جہت پہلو پر گہری نظر ڈالی گئی ہے اور ان کی تخلیقات کو پیش کرتے ہوئے ان کی قدریں بھی متعین کی گئی ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو مواد اور عنوان کے اعتبار سے یہ قابل قدر کتاب ہے۔ ویسے تاریخ کے حوالے سے دوسری کتابیں بھی قومی اردو کونسل نے شائع کی ہیں مگر یہ کتاب منفرد نوعیت کی حامل ہے۔ کیونکہ یہ کتاب طلبا اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

ہند کی مایۂ ناز ہستیاں و دیگر مضامین

مصنف: بی شیخ علی

صفحات: 176، قیمت: -/35 روپے، تیسری طباعت: 2015

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: جمال اختر، D-238 تیسری منزل، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

کسی بھی قوم کا بنیادی اثاثہ اس کے معصوم بچے اور نوجوان ہوتے ہیں۔ جنھیں آنے والے وقت میں قوم کی باگ ڈور سنبھالنی ہوتی ہے۔ جیسی ان کی تربیت ہوگی اسی انداز سے وہ اپنی قوم کو آگے لے جانے کا کام کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے ہی نونہالان قوم کو ان کے بزرگوں کے عظیم کارناموں سے واقف کرایا جاتا ہے، تاکہ ان کے اندر بھی

اپنی شخصیت کو ابھارنے اور سنوارنے کا شوق و جذبہ پیدا ہو سکے۔ درسی کتابوں کا جہاں تک تعلق ہے اس کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں، کہیں ضخامت اور کہیں متعصبانہ رویے کے باعث بعض اہم شخصیتوں کے کارنامے شامل نصاب نہیں ہو پاتے۔ اسی کمی کو محسوس کرتے ہوئے محترم بی شیخ علی صاحب نے اپنی کتاب 'ہند کی مایہ ناز ہستیاں و دیگر مضامین' میں علم و عمل کی شاہراہ پر گامزن رہ کر اپنے آپ کو شہرہ آفاق شخصیت کا حامل بنانے والے بزرگوں کے کارناموں کو نہایت ہی عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔

کتاب 'ہند کی مایہ ناز ہستیاں و دیگر مضامین' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ہندوستانی مسلمانوں کو کسی نہ کسی سطح پر متاثر کرنے والے رہنماؤں کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس حصے کی پہلی کڑی ٹیپو سلطان ہیں، جنھوں نے وطن کی بقا کے لیے نہ صرف تخت و تاج کو اپنے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا بلکہ اپنی جان عزیز کو بھی قربان کر دیا۔ سلطان شہید ہماری قوم کے ان جانبازوں میں سے ہیں جن پر جتنا ناز کیا جائے کم ہے۔ اس حصے کی دوسری کڑی سرسید احمد خاں ہیں، جنھوں نے قوم کی ڈوبتی نیا کو اس وقت پار لگایا جب کہ اس کے بچ نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ سرسید کے کارناموں کو سلسلے وار اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ ان کی شخصیت قارئین پر پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ جہاں مذکورہ دونوں شخصیات نے سیاست اور تعلیم کے ذریعے قوم کے پرچم کو بلند رکھا وہیں ایک ایسی شخصیت بھی تھی جس نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کو اس کے ماضی کی یاد دلا کر جھنجھوڑنے کا کام کیا۔ یہ عظیم شخصیت مولانا الطاف حسین حالی کی تھی۔ مولانا حالی کا شمار قوم کے ان محسنین میں ہوتا ہے جنھوں نے مسلمانوں کے اندر نشاۃ ثانیہ کا جذبہ پیدا کیا۔ مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری میں پنہاں پیغامات کے ساتھ ان کی انسان دوستی پر بھی بخوبی روشنی ڈالی گئی ہے۔ علامہ اقبال کی فلسفیانہ بلندی پر بھی ایک جامع مضمون ہے۔ جس میں اقبال کے فلسفہ خودی کے مختلف مراحل کو با ترتیب پیش کیا گیا ہے۔

جدید ہندوستان یا یہ کہیں کہ منقسم ہندوستان میں اگر کسی شخص نے مذہب اور سیاست کے میدان میں اپنی قوم کی بھرپور نمائندگی کی ہے تو وہ مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ مولانا آزاد کی قیادت کے دو پہلو تھے۔ ایک حریت کے میدان میں قوم کی رہبری اور دوسری تہذیب و تمدن میں مذہبی رہنمائی۔ انھوں نے بنگال کی سرزمین سے پرزور انداز میں آواز اٹھائی کہ ہندوستان ہمارا ہے۔ ہندو مسلم تفرقے عارضی ہیں۔ غیر ملکی عیاری کسی کے کام نہ آئے گی۔ ملک سے وفاداری اسلام کا پیغام ہے۔ حریت ہر قوم کا حق ہے۔ اتحاد و اتفاق میں تقویت ہے۔ غرض مولانا آزاد نے ہوا کا رخ بدلنا چاہا اور مسلمانوں کو پھر اسی منزل پر لانے کی کوشش کی جہاں وہ 1857 کے انقلاب سے پہلے تھے۔ اس مضمون میں مصنف نے مولانا آزاد کی شخصیت کے علمی اور سیاسی پہلوؤں کو بہت ہی مختصر انداز میں پیش کیا ہے، اگر ان کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں، اخلاق و کردار پر بھی ہلکی سی خامہ فرسائی کی گئی ہوتی تو یہ مضمون اور بھی عمدہ ہو سکتا تھا۔ اگلا مضمون ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت پر ہے۔ جو کہ مذکورہ تمام مضامین کی بہ نسبت زیادہ دلچسپ ہے۔ کیونکہ اس مضمون میں جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین کے علم و نظریے پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، وہیں ان کی اخلاقی خوبیوں پر بھی بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے جن سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کتاب کے دوسرے حصے میں مسلمانوں کی سماجی، تہذیبی، اقتصادی اور تعلیمی صورت حال پر بعض مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ جن میں آغاز اسلام کے کچھ دنوں بعد ہی مسلمانوں کے آدھی دنیا پر قابض ہو جانے کے اسباب بیان کرتے ہوئے موجودہ دور میں مسلمانوں کی صورت حال کا موازنہ کیا گیا ہے اور ان اسباب کو واضح کر کے موجودہ دور کے مسلمانوں سے اپنے اسلاف کی راہوں پر چلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مصنف نے اسلامی تہذیب و ثقافت جیسے اہم موضوعات کو جو کہ طوالت کے متقاضی تھے نہایت ہی ہنرمندی کے ساتھ ان مختصر مضامین میں سمو دیا ہے، جن سے ایک عام قاری بھی اکتاہٹ کا شکار ہوئے بغیر اپنے آپ کو واقف کرا سکتا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، شکریے کی مستحق ہے کہ اس کے ذریعے لگاتار ایسی کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں جن سے نہ صرف اردو زبان کو فروغ مل رہا ہے بلکہ وہ بچوں کی کردار سازی میں بھی معاون ثابت ہو رہی ہیں۔

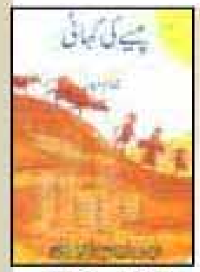

پیسے کی کہانی

مصنف: غلام حیدر

صفحات: 80، قیمت: 22 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عبیدالرحمٰن، 11، اولاد، برہمپترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، اردو ادب کی معیاری کتب کے شانہ بہ شانہ دیگر علوم کی کتابیں بھی اردو میں منتقل کر کے شائع کرتی ہے۔ یہ لائق تحسین قدم ہے۔ اس عمل سے نہ صرف اردو زبان کا فروغ ہو رہا ہے بلکہ ایسے علوم جو اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں ہیں اس سے اردو قارئین محظوظ اور مستفید ہوتے ہیں جو اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کی قرأت پر قدرت نہیں رکھتے۔ قومی کونسل نے جہاں ادبی و تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں، وہیں ادب اطفال کی ضرورت و اہمیت کو دیکھتے ہوئے ادبا و شعرا کی تخلیقات شائع کر کے ادب اطفال کی روایت کو فروغ دے رہی ہے۔ کیونکہ بچپن ہی سے بچوں میں مطالعے کا ذوق پیدا کیا گیا تو ابتدا ہی سے ان کی ذہنی و اخلاقی آبیاری ہو سکے گی اور مستقبل تابناک ہوگا۔ کونسل کے ڈائرکٹر ارتضیٰ کریم کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں "بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کر سکو۔" ادب اطفال کی روایت کا تانا بانا آزاد، حالی، اقبال، اسماعیل میرٹھی، افسر میرٹھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیع الدین نیر سے ہوتا ہوا غلام حیدر، وکیل نجیب، اسد رضا اور دیگر تخلیق کاروں تک پھیلا ہوا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'پیسے کی کہانی' جناب غلام حیدر صاحب کی تصنیف ہے۔ بچوں کی ذہنی سطح کو ملحوظ خاطر رکھ کر آپ بیتی کے انداز میں سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں پیسے کی کہانی / آپ بیتی بیان کی گئی ہے۔ بظاہر کتاب تو پیسے کی کہانی ہے جو قدیم عہد سے لے کر عہد حاضر تک پیسے کی بتدریج ارتقائی شکل و صورت کو آشکار کرتی ہے مگر بین السطور میں سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی حرکیات کو نشان زد کیا جا سکتا ہے۔ انسان جیسے جیسے ترقی کی منازل طے کرتا گیا پیسے کی شکل و صورت میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ مصنف نے پیسے کی کہانی بیان کرنے کے لیے کل 9 عنوانات قائم کیے ہیں۔ پہلا عنوان 'میں کون ہوں' کے تحت پیسے کا تعارف پیش کیا ہے۔ مختلف ممالک میں پیسے کے مختلف نام، مختلف شکل و صورت اور قدر و قیمت کو واضح کیا ہے۔ اس کے بعد مختلف عنوانات کے تحت پیسے کی ارتقائی شکل سامنے آتی ہے۔ قدیم زمانے میں انسان جنگلوں میں اپنی زندگی بسر کرتا تھا اس عہد میں پیسے کا تصور نہیں تھا تو خرید و فروخت کے لیے اشیا کے عوض اشیا کا نظام رائج تھا۔ جانوروں، پتھروں کے ہتھیار، اوزار اور غذائی اجناس کو ہی خرید و فروخت میں استعمال کیا جاتا تھا، اس کے بعد معدنیات یعنی سونا، چاندی، لوہا اور تانبا وغیرہ کے دریافت ہو جانے سے انسان نے اس کے اوزار اور برتن بنا کر استعمال کرنا شروع کیا اور اسی سے لین دین کرنے لگے، گویا اس کی اہمیت دولت کی ہوگی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، انسان نے

سکونت کی زندگی اختیار کی، سماجی رشتے قائم ہوئے، شہروں کا عروج ہوا اور سلطنتیں قائم ہونے لگیں، روزگار کی روشنیاں بڑھنے لگیں تو پیسے کے ظاہری رنگ و روپ میں بھی بدلاؤ آیا۔ مصنف نے اگرچہ پیسے کی کہانی بیان کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر عہد کی تہذیبی وثقافتی حرکیات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ عہد بہ عہد قائم ہوئی سلطنتوں، اس کے ذریعے چلائے گئے سکوں اور اس عہد کی تاریخی، تہذیبی و سماجی خصوصیات سے بھی قاری روشناس ہوتا چلا جاتا ہے۔ بچوں کے ساتھ ساتھ یہ کتاب بڑوں کے لیے بھی لائق مطالعہ ہے۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب اور جاذب نظر ہے جو خصوصاً بچوں کے لیے تیار کی گئی کتابوں کا لازمی جزو ہے۔ البتہ اندرونی صفحات پر مختلف ادوار کے سکوں کی جو تصاویر اتاری گئی ہیں وہ بالکل غیر واضح ہیں۔ امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی کمی کی تلافی کردی جائے گی۔

کاغذ کا واسدیو

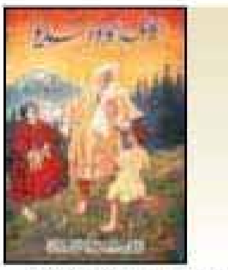

افسانہ نگار: پریم ناتھ در

صفحات: 118، قیمت 63 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عاقل زیاد، موضع بہادرا، پوسٹ ہرنیا، ضلع بستی پور (بہار)

تجریدی آرٹ دراصل کیا ہے، اس بارے میں ماہرین کے نظریات بھی پیش نظر ہیں، تاہم کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت میں ابھی کچھ اور کہنے کی گنجائش ہے۔ گویا آڑی ترچھی لکیروں کی بنا پر معنی پیدا کرنے کی کوشش اور اسی طریقہ کار کی بنیاد پر تخیل کے اظہار کو تجریدی آرٹ کہیں تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ سوال ہے کہ ایسا فن جو عام قاری کی دسترس سے باہر ہو کیا اسے مقبولیت مل سکتی ہے۔ جیومیٹری باکس کی مدد سے ایک معینہ فریم میں بہت سارے مثلث، مربع، مستطیل کھینچ لیے جائیں، اتنے کہ بھی ایک دوسرے میں پیوست ہوں۔ اب اس میں سے کوئی ایک کو علاحدہ کرنا میرے خیال میں بلاوجہ کی مغز ماری ہوگی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایسے فن کو مقبولیت نہیں مل پائی یا پھر یہ کہ ایک خاص عرصہ میں ہی شروع ہوئی اور دم توڑنے لگی۔ وارث علوی بھی غالباً جدید افسانہ نویسی کے بارے میں یہی نظریہ رکھتے ہیں کہ حقیقت نگاری اور علامت نگاری جب دونوں فنکار کی دسترس میں نہ ہوں تو اسے تخیل یا تجریدیت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

بہرحال، اس وقت میرے سامنے پریم ناتھ در کا ایک افسانوی مجموعہ ہے جس میں نو عدد افسانے ہیں۔ اس کی کئی کہانیوں کو دوبارہ پڑھ کر بھی کردار نگاری یا پلاٹ بندی کی فضا تک نہیں پہنچ سکا۔ ایسا نہیں کہ 'کاغذ کا واسدیو' میں شامل کہانیاں فن سے عاری ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کہانیوں میں فکر ہی فکر ہے اور ایک کیفیاتی تسلسل، لیکن ان میں پلاٹ بندی یا کردار نگاری قدرے معدوم ہے۔ کبھی کوئی کردار شے میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے تو کبھی شے کردار میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔ اس کی مثال ایسے بھی دی جاسکتی ہے مثلاً ساکت ہوا اور صاف ستھرے آسمان میں کوئی بادل کا ٹکڑا اچانک کرۂ ارض کے کسی براعظم جیسا نظر آنے لگے اور دیکھتے دیکھتے روئی کے گالوں میں بدلنے لگے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں میں نہ کوئی تجسس باقی رہے اور نہ ہی کوئی دلچسپی ہی رہ جائے۔ "کاغذ کا واسدیو" کے مقدمہ میں ناقد سید احتشام حسین نے لکھا ہے کہ "پریم ناتھ در کے افسانے اپنے پلاٹ یا کرداروں کے نام سے ذہن میں زندہ نہیں رہتے بلکہ اپنے تاثرات اور فضا کی وجہ سے کیفیت پیدا کرتے ہیں۔" ان تمام باتوں کے باوجود یہاں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ مجموعے میں شامل کہانیاں اس وقت لکھی گئیں جب ملک میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ ظاہر ہے، اس وقت ترقی پسندی کا بول بالا تھا اور متحدہ ہندوستان میں لکھنے والوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ حالانکہ جنگ آزادی کے دوران یا اس کے بعد تک ایک طرف بھوک، افلاس، نقل مکانی جیسے مسائل تو دوسری جانب برطانوی سامراجیت کے نقوش، تقسیم کا کرب اور استحصال و جبر کی اذیت ہر جانب محسوس کی جارہی تھی۔ ایسے میں جہاں دیگر بڑے افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا وہیں در نے اشاریت، رمزیت اور تجریدیت کو اپنا محبوب آلۂ کار بنایا۔ یقیناً یہ بات قابل تحسین ہے کہ ایسے وقت میں انھوں نے مروجہ روایات سے الگ ہٹ کر اپنے لیے جو راہ چنی وہ بالکل نئی تو نہیں تھی، تاہم اردو افسانہ نگاروں یا برصغیر کے افسانہ نگاروں کے لیے ایک چیلنج ضرور تھا۔ اس سے یہ اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ پریم ناتھ در کو مغربی ادب سے گہری دلچسپی رہی ہوگی۔ تاہم ان کے افسانوں میں مشرقی تہذیب اور خاص کر ہندوستانی معاشرے کا گہرا سایہ نظر آتا ہے۔ مجموعے میں شامل کہانیوں میں عموماً وہی مسائل سلگتے نظر آتے ہیں جن میں بھوک، افلاس، جینے کی آرزو اور آزادی کی خواہشیں کلبلاتی ہیں۔ ظاہر ہے یہی سب معاصر ترقی پسندوں کا خاص موضوع ہوا کرتا تھا اور در نے اپنے افسانوں میں ایسے ہی موضوعات میں انفرادی طور پر رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ اجمالی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ در اگر رمز شناس تھے تو فکری اظہار میں شوخی کے بھی متحمل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں کے مطالعے سے قاری کو مایوسی نہیں ہوتی۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جملوں کی تراکیب میں اب بھی ایسی تازگی ہے کہ قریب سات دہائیوں سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے بعد ان میں نیا پن بہرحال جھلکتا ہے۔ کچھ مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں:

"پھر جب بھی روک روک کر عزیزہ نے باپ کو چاندی والی بات سنائی تو دونوں بڑی بے دلی سے چھنے لگے..." (گیت کے چار بول)

"چنانچہ اس سرے پر بیٹھے بیٹھے ہی میں ان کے اس سرے والی زندگی کو دیکھ رہا تھا۔" (تخیل تکمیلی)

"سورتیاں کالے کہرام میں ایسے گم ہوگئی تھیں جیسے گرجتی کڑکتی گھٹاؤں نے ننھی منی سی بجلیاں نگل لی ہوں..." (آخ تھو)

"ایک عام سڑک کی طرح میں نے اس تختی کی بھینگی کو ایک جھٹکے میں سیدھا کردیا پھر..." (غلط فہمی)

قومی کونسل کو اس بات کے لیے مبارکباد دی جانی چاہیے کہ موجودہ وقت میں جب ادب کے طلبا، و دیگر شائقین ادب کو اسلاف کے کارناموں سے واقفیت کم ہو رہی ہے یا ان کے شہ پارے کمیاب ہیں، ایسے میں ایسی کتابیں شائع کررہی ہے جن سے اسلاف کے ادبی کارنامے نئی نسل کے ذہنوں میں روشن ہوسکیں۔ مگر کتابوں کی اشاعت میں قومی کونسل کو اس بات کی گنجائش بھی رکھنی چاہیے کہ دیباچے کے ساتھ یا الگ سے مصنف کے بارے میں مختصر ہی سہی معلومات فراہم کرائی جائیں۔

متن، معنی اور تھیوری

مصنف: پروفیسر قدوس جاوید

ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

سنہ اشاعت: 2015 قیمت: 201 روپے

مبصر: ڈاکٹر رحمت شمیم ملک، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر

پروفیسر قدوس جاوید بنیادی طور پر نقاد ہیں۔ ان کی تنقید کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ ابتدائی دور میں وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے مضامین سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کی تنقیدی تصانیف میں — ادب اور سماجیات، شعر نثر آہنگ، اقبال کی جمالیات، اقبال کی تخلیقیت اور متن، معنی اور تھیوری — شامل ہیں۔ 'متن، معنی اور تھیوری' ان کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ اور یہ مابعد جدید تنقید پر ایک نہایت مربوط و مبسوط کتاب ہے۔ اس میں نظری اور اطلاقی دونوں جہتوں کو جاننے کی کاوش

ملتی ہے۔اس کتاب میں مابعد جدید ادبی تھیوری کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ "متن، معنی اور تھیوری" میں بین المتونیت پر بھی دو مضامین — بین المتونیت، اور بین المتونیت: اطلاقی امکانات — شامل ہیں۔اردو میں بین المتونی تنقید پر نہایت کم لکھا گیا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے نہ صرف جولیا کرسٹیوا کے نظریہ بین المتونیت کو اردو میں رائج کرنے کی کوشش کی بلکہ انھوں نے اس کا اطلاقی نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم لکھتے ہیں:

"قدوس جاوید کا شمار عصر حاضر کے منفرد اور ممتاز نقادوں میں ہوتا ہے۔مابعد جدید تنقید میں — گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، ضمیر علی بدایونی اور فہیم اعظمی — کے بعد قدوس جاوید کا نام نہایت مستند اور معتبر ہے۔ان کے ہاں مابعد جدید تھیوریز کا نہایت وسیع اور وقیع مطالعہ ملتا ہے۔"

پروفیسر قدوس جاوید ادب کی تفہیم میں ہمیشہ وقت کے متوازی چلتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدی فکر میں مواد اور جدلیاتی پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔انھوں نے ہمیشہ ادب کی تفہیم میں متبادل پیراڈائم سے کام لیا ہے۔اور روایتی گلیشے سے خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ پروفیسر قدوس جاوید کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے نئی ادبی روایات اور ادبی تھیوریز کا غائر اور وسیع مطالعہ کیا ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے ادبی تنقید کی تفہیم میں فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی تصانیف سے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین نہایت عمیق اور جامع ہوتے ہیں۔اور کم پڑھے لکھے قارئین کو ان کی تنقید کی تفہیم میں تھوڑی بہت دشواری ضرور پیش آتی ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید کی تنقیدی بصیرت کی تفہیم کے لیے بین العلومی مطالعہ کا ہونا ازحد ضروری ہے۔اس کے بغیر ان کی تنقیدی کاوش کو پورے طور پر سمجھنا مشکل ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید کا شمار صف اول کے مابعد جدید نقادوں میں ہوتا ہے۔انھوں نے مابعد جدید تھیوری اور اس کے ابعاد پر کافی اہم مضامین لکھے ہیں۔ان کی تھیوری فہمی کے قائل ناقدین میں گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی، ارتضیٰ کریم اور ناصر عباس نیر وغیرہ شامل ہیں۔ان سبھوں نے ان کی تنقیدی صلاحیت اور ادبی تھیوری فہمی کو کافی سراہا ہے۔ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

"مابعد جدید تنقید کی شعریات پر جن لوگوں نے جم کر لکھا ہے،ان میں ایک اہم نام پروفیسر قدوس جاوید کا ہے۔ان کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک طرف مابعد جدیدیت کے نظری پہلوؤں کو مثالی مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش ملتی ہے،دوسری طرف اردو میں تھیوری کے ذمہ دارانہ اطلاق کی سعی ملتی ہے۔نیز انھوں نے اردو کی مابعد جدید تنقید کے بعض پہلوؤں کا محاکمہ کیا ہے۔قدوس جاوید صاحب تھیوری کے مسائل کی سادہ تشریح سے بھی کام لیتے ہیں،اور ان مسائل کی تفہیم کے ضمن میں خود ایک اپنی نظر یا اپنی بصیرت بھی ظاہر کرتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ان کی تنقید کے وہ حصے قابل قدر ہیں جہاں وہ تھیوری، یا اس کے کسی ایک نکتے کی نئی تعبیر پیش کرتے ہیں، یا تھیوری کی بنیادی بصیرت کو کام میں لاتے ہوئے، اپنی ادبی روایت کا مطالعہ کرتے ہیں۔"

پروفیسر قدوس جاوید تین دہائی سے مابعد جدید نظریات پر مسلسل مضامین لکھ رہے ہیں اور یہ سفر ہنوز اسی سرعت سے جاری وساری ہے۔مابعد جدید تنقید کی روایات کو آگے بڑھانے میں بھی ان کا نہایت اہم رول رہا ہے۔اردو کی مابعد جدید تنقید میں ان کی کاوشوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید نے ہمیشہ روایتی تنقید لکھنے سے گریز کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ روایتی تنقید لکھنا دراصل تضیع اوقات ہے۔وہ کلاسیکی ادبی متون کا مطالعہ بھی جدید ادبی نظریات کی روشنی میں کرتے ہیں۔اس ضمن میں ان کے مضمون "اقبال: لفظ و معنی اور مابعد جدید تھیوری"، حکیم منظور کی غزلیہ ساخت، یوسف ٹینگ: بہار بصیرت، رسول نازکی کی شاعری وغیرہ کو بطور خاص دیکھا جاسکتا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کا یہ تنقیدی اختصاص ہے کہ وہ اپنی تنقید میں اعتدال اور توازن کا حد درجہ خیال رکھتے ہیں اور اپنی تنقید میں متن یا شخصیت کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔

پروفیسر قدوس جاوید اپنی تنقید میں بین العلومی مطالعے کو خاص ترجیح دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ جدید ادبی تھیوریز کی تفہیم و تنقید بغیر بین العلومی مطالعے کے نہیں کی جاسکتی ہے۔ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اردو تنقید میں روایتی مضامین اور تکرار کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں بیشتر ناقدین دوسری زبانوں کی شعریات سے کم واقف ہیں۔اعلیٰ اور ارفع تنقیدی بصیرت کے لیے بین العلومی مطالعہ ازحد ضروری ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید کی تصنیف "متن، معنی اور تھیوری" مابعد جدید تنقید کی جہتوں کی تفہیم میں نہایت معاون ہے۔اس کے انفراد و امتیاز کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ "اردو میں مابعد جدیدیت ایک Dominant Point Of View کے طور پر ادبیت کے تقریباً سارے حصار توڑ چکی ہے۔ مصنف، متن اور قاری کے حوالے سے "تھیوری" کی مسافت، معنویت اور امکانات سے متعلق غلط بحث نے جو غلط فہمیاں اور گمراہیاں پھیلائی ہیں، یہ کتاب "متن، معنی اور تھیوری" ان سب کا جواب ہوسکتی ہے"۔

اولین سہ لسانی قانونی لغت (انگریزی/اردو/ہندی)

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

صفحات: 802، قیمت: 700 روپے، لائبریری اڈیشن 895 روپے

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی-2

مبصر: مصباح الدین صدیقی (ڈپٹی لجسلیٹو کاؤنسل، وزارت قانون)

قانون میں سب سے پہلی انگریزی اردو لغت جو "کمرشل اینڈ لیگل انگلش ہندوستانی ڈکشنری" کے نام سے موسوم ہے، ایک انگریز مصنف ڈاکٹر فالن نے 1858 میں لکھی تھی۔ دوسری انگریزی اردو قانونی لغت دگا پرشاد نے لکھی، اس کا نام "کنسائز انگلش اردو لا ڈکشنری" ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن 1905 میں الٰہ آباد سے رام نرائن نے شائع کیا تھا۔علاوہ ازیں حیدرآباد، لاہور و دیگر مقامات سے تقسیم ہند سے قبل شائع ہونے والی مختلف قانونی لغات بھی تاریخی نقطۂ نظر سے قابل قدر ہیں۔کافی عرصہ پہلے ریاست جموں و کشمیر کی جوڈیشل اکادمی نے انگریزی اردو قانونی فرہنگ شائع کی تھی۔اس کے علاوہ اسی اکادمی نے کچھ تعزیری قوانین کی انگریزی ہندی اردو فرہنگ بھی شائع کی تھی۔ یونیورسل لا پبلشنگ کمپنی نے بھی سہ لسانی قانونی لغت شائع کی ہے مگر وہ فارسی رسم الخط میں نہ ہو کر دیوناگری رسم الخط میں ہے۔ 2013 میں محمد ارشاد حنیف کی انگریزی۔اردو لغت بھی منظر عام پر آئی ہے۔ اسی سال قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بھی فرہنگ اصطلاحات انگریزی—اردو کا پہلا ایڈیشن شائع کیا تھا۔اس فرہنگ کو بھی حتمی شکل دینے میں مؤلف کا کلیدی رول رہا ہے۔

آزاد ہندوستان میں قانونی ادب کے میدان میں خاص کر لغت نویسی کے تعلق سے بہت کم کام ہوا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق زیر تبصرہ لغت ملک کی پہلی معتبر سہ لسانی قانونی لغت ہے۔اس میں نہ صرف قانونی بلکہ آئینی، انسانی حقوق، صحافتی، پارلیمانی، مسلم قانون وغیرہ کی اصطلاحات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مؤلف نے لغت میں مرکزی قوانین کی فہرست کو مع اردو و ہندی مترادفات شامل کرکے قارئین و مستفیدین کے لیے حوالہ جاتی سہولت پیدا کردی ہے۔اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں قانون سے متعلق اہم ویب سائٹ اور جرائد وغیرہ کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔

اس لغت میں انگریزی اصطلاحات کے اردو و ہندی مترادف الفاظ کے انتخاب میں

مؤلف نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ انگریزی الفاظ کے ہندی و اردو مترادف الفاظ خود وضاحتی ہوں اور مزید تشریح کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ البتہ جہاں جہاں شدید ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں وہاں اصطلاحات کی وضاحت کر دی گئی ہے جیسے English Mortgage کے لیے اردو یا ہندی مترادف انگریزی زبان سے مفہوم واضح نہیں ہوتا اس لیے اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اسی طرح قانون میں جو Estoppel کا تصور ہے اس کی بھی مثالوں کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے۔ اکثر لوگ ہر پرانے وکیل کو سینئر وکیل سمجھنے لگتے ہیں جبکہ سینئر ایڈووکیٹ کی تقرری باقاعدہ قانونی طریقے سے ہوتی ہے۔ اسی لیے مؤلف نے اس اصطلاح کو بھی وضاحت طلب سمجھا۔ علاوہ ازیں قوانین کی تعبیر کے اصولوں کی اس طرح وضاحت کر دی گئی ہے کہ قارئین ان کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں۔

مؤلف نے اردو و ہندی مترادفات کا انتخاب کرتے وقت قانون اور قانون کے تعبیری اصولوں، نظائر عدالت، معتبر لغات کے مستندین و مؤلفین کے ذریعے مستعمل مترادفات، وزارت قانون کے ذریعے مرکزی قوانین، قواعد و ضوابط، قانونی کتب، عدالتی فیصلوں کے تراجم میں مستعمل الفاظ کو ممکنہ حد تک من و عن اس لغت میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ کہیں کہیں اتفاق نہیں کیا ہے۔ مؤلف نے ان دونوں زبانوں کے الفاظ کے انتخاب کے لیے ایک ہی پیمانہ اپنایا ہے۔ اس کے علاوہ متروک انگریزی الفاظ کو شامل نہ کرنے کے معاملے میں مکمل احتیاط برتی ہے۔ مثلاً لغت میں لفظ Mankind کی جگہ Humankind شامل کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی دستاویزات میں بھی اب لفظ Humankind استعمال کیا جا رہا ہے۔ چونکہ لفظ Mankind سے صنفی امتیاز کی بو آتی ہے۔

مختلف شعبہ جات میں گوناگوں تبدیلیوں کے ساتھ زبان کا ارتقائی سفر جاری رہتا ہے، بہت سے الفاظ غیر مروج ہو جاتے ہیں اور بہت سے نئے الفاظ وجود میں آ جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل environmental justice, cloning, stalking, surrogate, voyeurism, gender discrimination, inalienable (as a human rights term) جیسے الفاظ عام نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انکشافات زمانہ اور نئے قوانین وضع کیے جانے کے باعث پرانی لغات کافی حد تک اپنی افادیت کھو چکی ہیں۔ مؤلف نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ بیشتر رائج الوقت قانونی اصطلاحات کو لغت میں شامل کیا جائے مگر ساتھ ہی انھوں نے بڑی انکساری کے ساتھ اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لغت ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں یہ بھی رقم بند کر دیا ہے کہ کچھ الفاظ مؤلف قصداً چھوڑ دیتا ہے تو کبھی سہواً ایسا ہو جاتا ہے اور ساتھ میں ایک اچھا مشورہ یہ بھی دیا ہے کہ مترجمین، مبصرین و دیگر لوگوں کو سیاق و سباق کے مطابق صحیح مترادف تلاش کرتے وقت کئی لغات دیکھنی چاہئیں۔ ہر لغت کی اپنی الگ خوبیاں ہوتی ہیں۔

دراصل یہ لغت مؤلف کی علمی استعداد اور عملی تجربہ کا ایک معتبر دستاویزی ثبوت ہے۔ وہ تقریباً درجن قانونی کتب کے مصنف ہیں اور حکومت ہند کے ایڈیشنل لیجسلیٹو کاؤنسل، سی اے ٹی الٰہ آباد بینچ کے رجسٹرار، دہلی ہائی کورٹ کے انٹر پیٹر و ایڈووکیٹ، وزارت قانون کے مختلف زبانوں کے ماہرین پر مشتمل ورکنگ گروپ کے رکن رہ چکے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ مؤلف وقتاً فوقتاً ان الفاظ کی فہرست تیار کرتے رہیں گے جو اس لغت میں چھوٹ گئے ہوں یا جو قانون کے نئے الفاظ ان کی یا قارئین کی نظر میں آئے ہیں تاکہ آئندہ شائع ہونے والے ایڈیشن میں انھیں شامل کیا جا سکے۔ امید کی جاتی چاہیے کہ یہ لغت ان ریاستوں کے جج صاحبان، عملے، وکلا، اساتذہ، طلبا اور دیگر ایسے قارئین کے لیے جو قانون میں دلچسپی رکھتے ہیں مفید ثابت ہوگی جن کی پہلی یا دوسری سرکاری زبان ہندی یا اردو ہے یا جہاں لوگ اردو ہندی لکھتے، پڑھتے اور بولتے ہیں۔

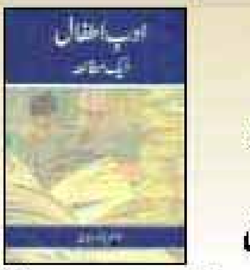

ادب اطفال ایک مطالعہ

مصنف: بانو سرتاج
صفحات: 196، قیمت: 200 روپے، سن اشاعت: 2015
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: عادل احسان، 310، جہلم ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

بانو سرتاج بیک وقت کئی درجن کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ انھوں نے افسانے، تاریخ، طنز و مزاح، لوک ادب کے ساتھ بچوں کے لیے تقریباً تین درجن کتابیں تخلیق کی ہیں۔ ان کا خاص میدان ادب اطفال ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیق کے ذریعے ان کی پرورش اور تعلیم و تعلم کو ترجیح دی ہے۔ مصنفہ نے بچوں کی ابتدائی، ثانوی تعلیم کی اصلاح اور ضروریات پر خاص توجہ دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی اصلاح، منصوبہ سازی اور اسکول جیسے موضوعات کو اپنی تخلیق کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ بچوں کی تدریس سے متعلق گزشتہ کئی دہائیوں سے بہت کچھ لکھا جا رہا ہے مگر ان کی دلچسپی کا سامان اچھی طرح سے میسر نہیں ہو رہا ہے۔ مصنفہ کا نظریہ ہے کہ ادب اطفال کی کہانیوں میں 95 فیصد تفریح کا موضوع ہونا چاہیے اور پانچ فیصد میں کچھ ایسی باتیں ڈالی جانی چاہئیں جس سے کہ ان کے اندر نئی سوچ اور نئی امنگ پیدا ہو سکے۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں ایسی روانی، سلاست اور شگفتگی ہو کہ پڑھتے ہی ان کے دل میں ایک نیا جوش پروان چڑھے اور ایسے ہی ذوق و شوق سے وہ اپنے مطالعے میں اضافہ کر سکیں۔

بانو سرتاج نے اپنی کتاب 'ادب اطفال ایک مطالعہ' میں مختلف رسائل و جرائد میں شائع مضامین کو شامل کیا ہے۔ یہ سارے مقالات بچوں سے متعلق ہیں۔ جن میں بچوں کی تربیت اور فکر کو نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے یہ سارے مضامین مشاہدات و تجربات اور معلومات کے حامل ہیں۔ پہلا حصہ ادب اطفال اور نفسیات اطفال کے باہمی رشتہ میں بچوں کے کردار اور ان کی نفسیات سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ ادب اطفال حکمت اور پیش کش میں اولاد کی تعلیم و تربیت اور ان کی ذہنی نشو و نما کو بہترین ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بچوں کے ادب پر گفتگو، مشورہ، تجاویز، لائحہ عمل، مسائل، جدو جہد کے خاکے اور منصوبے کو ایک علامت کے ساتھ خوبصورت مالا میں پرو دیا ہے۔ اس کے علاوہ پریوں کی کہانی میں بچوں کی خصوصیات پر زور دیا ہے۔ مصنفہ کا ماننا ہے کہ جب تک کہانی میں تحیر اور تجسس نہیں ہوگا تب تک کہانی اپنے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ پائے گی۔ ادب اطفال کی کہانیوں میں ذہنی استطاعت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے مثبت نظریہ فکر پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ کلاسکس کی کہانیوں سے بھی بچے واقعات اور ماحول سے واقف ہو جاتے ہیں۔ بچے ٹیلی ویژن پر کارٹون دیکھنا پسند کرتے ہیں، جس کی بنا پر آج بے شمار رنگین کارٹون کے پروگرام پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ آج کا سائنسی عہد اینی میشن کا جادوئی دور ہے اس میں کوئی انسان ایسی چیز پیش کرتا ہے جس میں کچھ نیا پن ہوتا ہے، اس کو دیکھ کر آنکھیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ دور حاضر کا ترقی یافتہ سائنسی عہد، سائنس فکشن کا جدید ترین تحفہ ہے۔ اس کے ذریعے بچوں کے اندر سائنس کے علوم اور خصوصیات کو سامنے لایا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان میں سائنسی رجحان کو فروغ دیا جاتا ہے۔ سائنس فکشن ایک ایسا موضوع ہے جس میں کوئی انسان صرف کسی چیز کا تصور کرے اور اچانک وہ نظروں کے سامنے آ جائے تو یہ اس کے لیے ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دیتی ہے پھر وہ اسی کو حقیقت مان بھی لیتا ہے۔ لوری، پالنے اور صبح کے گیت سے ممتا کی مٹھاس اور پیار کی خوشبو آتی ہے۔ اس میں اپنے پن کا احساس ہوتا ہے۔ لوری میں صداقت کی زمین ہوتی ہے تو تخیل کا بے کراں آسمان بھی ہوتا ہے۔ اردو میں بچوں کے ڈرامے انسانی زندگی کا

ایک ایسا آئینہ ہے۔ اس سے بچے ہی نہیں ان کے والدین اور دوسرے فرد بھی کچھ نہ کچھ سیکھ کر اپنی زندگی میں تبدیلیاں لاسکتے ہیں۔ اردو میں بچوں کا ادب اس کے مسائل اور ان کا حل اس کتاب کا سب سے اچھا موضوع ہے۔ اس میں بچوں کے ادب اور ان کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ بانو سرتاج کے مطابق بچوں کا ادب خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو یا کسی بھی واسطے سے ان کی رسائی ہوگی ہو وہ بچوں تک پہنچنا لازم ہے۔

مجموعی طور پر بانو سرتاج نے 'ادب اطفال ایک مطالعہ' ترتیب دے کر ادب اطفال کے شیدائیوں کو بہترین تحفہ پیش کیا ہے۔ ممکن ہے اس کتاب کے مطالعے سے کچھ علم دوست بچوں کے ادب کی طرف خاص نظر رکھیں گے اور ان کی صورت حال کو از سر نو زیادہ پرکشش بنائیں گے۔ ادب اطفال میں مصنفہ نے جو خیال ظاہر کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ بانو سرتاج لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب ترتیب دے کر بچوں کی زندگی کو ایک نئے رنگ میں ڈھال دیا ہے جس سے آنے والی نسل اس سے فیض یاب ہوگی۔

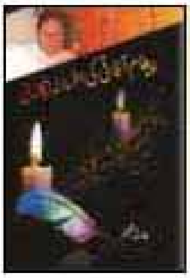

پیغام آفاقی کی افسانہ نگاری

مصنف: عارفہ شبنم

صفحات: 168، قیمت: 200، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: سلمان عبدالصمد، N-106 فرسٹ فلور، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

انگلیوں پر گنے چنے معاصر فکشن نگاروں میں پیغام آفاقی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ان کا سرمایہ ادب نہ صرف فنی نقطہ نظر سے قابل التفات ہے بلکہ موضوعاتی پس منظر میں بھی انسانی ذہن و شعور کو اجاگر کرنے کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں جن موضوعات کو مس کیا، وہ انسانی معاشرے سے مکمل طور پر مربوط ہیں۔

پیش نظر مجموعہ 'پیغام آفاقی کی افسانہ نگاری' عارفہ شبنم کی تنقیدی نوعیت کی کتاب ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ، جو چھانوے صفحات پر مشتمل ہے، دراصل عارفہ شبنم کے ایم فل کا مقالہ ہے۔ دوسرے حصے میں ان دونوں مباحثے کا مواد شامل اشاعت ہے، جو پیغام آفاقی کے اکلوتے افسانوی مجموعہ 'مافیا' پر دہلی اور ممبئی میں منعقد کیے گئے۔ ان مباحثوں کے شرکا میں قاضی عبدالستار، پروفیسر قمر رئیس، جوگندر پال، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر شفیق اللہ، پروفیسر غضنفر، پروفیسر عبدالرحمن ہاشمی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ شرکا نے پیغام آفاقی کے فکر و فن پر جو گفتگو کی ہے، وہ نہ صرف پیغام آفاقی کے فنی رویے کو سمجھنے میں معاون ہے، بلکہ تمام افسانوی تحریروں کے افہام و تفہیم میں بھی مددگار۔ شاید انھی باتوں کے پیش نظر ان مباحثوں کو ایم فل کے مقالے کا ضمیمہ بنا دیا گیا۔ چار ابواب پر منقسم حصہ اول میں پیغام آفاقی کی زندگی کے نشیب و فراز، ان کی ادبی خدمات بشمول ناول نگاری اور تیسرے باب میں خصوصاً ان کے افسانوں کا فنی و فکری جائزہ لیا گیا ہے۔ عارفہ شبنم نے جن پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے پیغام آفاقی کے افسانوں کا مطالعہ کیا ہے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنقیدی دہلیز پر قدم رکھتے ہی نوجوان ذہن بھی کچھ نہ کچھ اپنی رائے رکھنے لگ جاتا ہے جو کہ خوش آئند ہے۔ عارفہ شبنم نے پیغام آفاقی کی کہانیوں کے تجزیے کے لیے جو جو عناوین قائم کیے ہیں، ان سے بالکل واضح ہے کہ معاشرتی مسائل سے کیسے ان کی کہانیاں رشتے استوار کرتی ہیں۔ انھوں نے آفاقی کے موضوعات، سماجی موضوعات، استحصال، دہشت گردی، رشوت خوری، بے روزگاری، جنسی بے راہ روی، بدلتی حقیقتیں، درمیانی طبقہ، ویل گاؤ، قوموں کا زوال، سیاسی موضوعات، معاشی موضوعات اور دیگر فنی زاویوں سے جائزہ لیا ہے۔ مطالعاتی زاویوں کا یہ انداز انتہائی دلکش ہے اور قابل تفہیم بھی۔

پیغام آفاقی نے اپنی کہانیوں اور ناولوں کو جن موضوعات پر مرتکز کیا ہے، انھیں انھوں نے انتہائی قریب سے دیکھا ہے۔ عموماً تخلیق کار رفتہ رفتہ تجرباتی اور مشاہداتی معاملات کو تخیلاتی رنگ میں رنگ کر کوئی تخلیق پیش کرتا ہے۔ پیغام آفاقی کا معاملہ ذرا دیگر تخلیق کاروں سے مختلف ہے۔ کیونکہ وہ تجربے اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ تجزیاتی اور تبصراتی [کسی حد تک قانونی] نگاہ بھی کھول کر رکھتے ہیں، بلکہ رکھنا ہی پڑتا ہے۔ یہ مجبوری بھی ان کے ادب کو دلکش بناتی ہے۔ اس طرح ایک واقعہ مختلف زاویوں سے پرکھے جانے کے بعد ہی فکشن کا حصہ بنتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسانی ذہن جس معاشرے میں پروان چڑھتا رہتا ہے، وہ معاشرہ بھی واضح شکل میں تو کبھی تمثیلی اور علامتی طور پر ہمیشہ اس فرد کے ساتھ رہتا ہے۔ پیغام آفاقی نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، وہ موضوعات تقریباً ہر تخلیق کار کے یہاں بھی ہوتے ہیں۔ موضوعات کبھی مشاہدے کی دین ہوتے ہیں تو کبھی تجرباتی معاملات پر مبنی۔ تاہم آفاقی کے یہاں یہ موضوعات نہ صرف مشاہداتی ہیں، بلکہ 'ذاتی' نوعیت کے بھی ہیں۔ ان کے ادب کا مطالعہ اعتدال پسندی، سچے مشاہدے، جیسے تجربے، رشتوں کے متنوع رویے، سماجی اونچ نیچ اور حالات کے نشیب و فراز پر مبنی صورت حال کا عکاس ہے۔ یہی رویے ان کے سرمائے کو درد آشنا، سماجی مسائل سے قریب اور انسانی دلوں میں بلند ہمتی، اولوالعزمی اور بلند خیالی کے احساسات و جذبات کی جوت جگاتے ہیں۔ لفظی انتخاب اور زبان و بیان کی چاشنی سے قریب تر تشبیہات و استعارات ان کی کہانیوں کو عام فہم بنانے میں مدد و معاون ہیں۔ فنی رچاؤ، لفظی پیکر تراشی کا فنکارانہ مظاہرہ ان کے فن کا خاصہ ہے۔ فلسفیانہ اساس سے قطع نظر عصری آگہی اور غیر مناسب رویوں پر تیکھے طنز نے ان کے رویوں کو زمانے کی نبض شناسی سے قریب تر کر دیا ہے اور ان کے موضوعات نظروں میں ایسی تصویریں بھی ابھار دیتے ہیں، جو زمانے کی بے ترتیب اور بے ہنگم فضا کی غماز ہیں۔ عارفہ نے بھی انھیں تناظر میں پیغام آفاقی کی کہانیوں کا دلکش تجزیہ کیا ہے، جو کہ ان کی تنقیدی صلاحیت کا بین ثبوت ہے۔

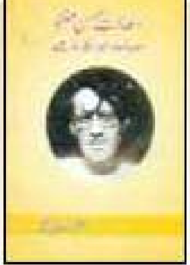

سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے

ڈاکٹر برج پریمی

صفحات: 346، قیمت: 500 روپے

ناشر: رچنا پبلی کیشنز، تھیپا، 1/3 نصیب نگر، جانی پور، جموں

مبصر: ڈاکٹر آصف، شعبۂ اردو، گوتم بدھ یونیورسٹی، گریٹر نوئیڈا، یوپی

زیر نظر کتاب ڈاکٹر برج پریمی کی منٹو شناسی اور منٹو پریم کا ایک ضخیم مرقع ہے۔ منٹو کی محبت و عقیدت سے سرشار ہو کر فاضل مصنف نے کہیں بھی جانب داری سے کام نہیں لیا، بلکہ اصول نقد کی کسوٹی پر منٹو کے فن اور فکر کو ایک محقق کی طرح پرکھا، اور ایک ناقد کی طرح اس کے معائب و محاسن کو طشت از بام کیا تاکہ قاری کھرے اور کھوٹے میں تمیز کر سکے۔ اور منٹو کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کر سکے۔ منٹو کی ادبی اور فنی حیثیت ہمیشہ مسلم رہی ہے لیکن غالب کی طرح وہ ناقدری زمانہ کا شکوہ و نوحہ کرتے رہے، کیونکہ رجعت پسندوں نے انھیں ترقی پسند کہا اور ترقی پسندوں نے رجعت پرست کہہ کر ناٹ باہر کیا۔ جبکہ منٹو طبعاً آزاد خیال تھے وہ نظریات اور سکہ بند تصورات کے تابع نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اشتراکیت سے انھیں قربت تھی لیکن اس کو اپنا جزو ایمان نہیں بنایا۔ انھوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو کسانوں اور مزدوروں کا ادیب نہیں کہا۔ انھیں انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں سے دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انسانی زندگی کی نفسیات کو ایسے المیہ کے ساتھ بیان کیا کہ قاری اپنے باطن کی جڑیں ہلتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ اپنی تخلیقات میں انسان کی ازلی جبلت پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ بتا سکیں کہ انسان کا قدیم رشتہ حیوانی جبلے سے ہے۔ منٹو کردار نگاری کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے برے سے برے کرداروں میں سے

انسانیت کی خوشبو چھوڑ لیتا ہے۔ بقول منٹو "ایشر سنگھ کے نام جو حیوان ہو کر بھی اپنی انسانیت کھو نہ سکا"۔ منٹو نے طوائفوں اور دلالوں کی زندگی کو اپنے افسانوں میں انسانی ہمدردی کے ساتھ پیش کیا۔ منٹو کے فن کے بارے میں مختصراً یہ کہا جائے کہ انھیں افسانہ لکھنے کا گر معلوم تھا جو انھیں کے ساتھ منوں مٹی میں چھپ گیا۔ فن ہے تو بے جان ہوگا۔

یہ کتاب چھ ابواب پر محیط ہے۔ باب اول کو دو ذیلی عناوین "حیات" اور "شخصیت کے عناصر ترکیبی" میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 'حیات' کے ضمن میں فاضل مصنف نے منٹو کے حیات و ممات سے متعلق معمولی سے معمولی جزئیات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ بطور خاص لفظ منٹو کی بڑی جانفشانی سے تحقیق کی ہے، جو مصنف کی منٹو سے عقیدت کا مظہر ہے۔ 'شخصیت کے عناصر ترکیبی' کے ذیل میں منٹو کے لاابالی مزاج اور اضمحلالی کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ منٹو کی ناکامی و ناامیدی کے احساس کو تخلیقات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم 'اردو کا مختصر افسانہ منٹو تک' پر مشتمل ہے۔ اس باب میں افسانے کے آغاز و ارتقا سے بحث کی گئی ہے اور منٹو سے پہلے اردو افسانے کی تکنیک، ہیئت، اور مواد میں جو تغیر در آیا تھا اس کا بتدریج مطالعہ کیا گیا ہے۔ باب سوم 'منٹو کی افسانہ نگاری' سے متعلق ہے۔ جس میں منٹو کی افسانہ نگاری کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ہر دور کے نمائندہ افسانوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، تاکہ قاری منٹو کے ذہنی اور فکری رویے سے روشناس ہو سکے۔ نیز اس باب میں منٹو کی ترجمہ نگاری کے فن اور صحافتی زندگی کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ باب چہارم 'منٹو کے مضامین، انشائیے اور خاکے' پر محیط ہے۔ جس میں منٹو کے ادبی، سیاسی و سماجی اور فلمی مضامین کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مضامین اور انشائیے کی مروجہ تعریف کی روشنی میں ان مضامین کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کیا گیا ہے۔ باب پنجم 'مکتوبات' پر مشتمل ہے۔ اس میں منٹو کے وہ خطوط شامل ہیں، جو انھوں نے اپنے ہمدم دیرینہ احمد ندیم قاسمی کو لکھے تھے۔ ان خطوط میں منٹو کی ذات کے اسرار و رموز کا عکس ملتا ہے۔ باب ششم 'منٹو کے دوسرے ادبی کارنامے' سے متعلق ہے جس میں منٹو کے تراجم، ریڈیائی ڈراموں، ناول اور صحافت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور ان کے فکری اور فنی محاسن کا بنظر غائر مطالعہ کیا گیا ہے۔

'سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے' ڈاکٹر برج پریمی کی تحقیق عرق ریزی اور جگر کاوی کا ثبوت ہے۔ جس میں انھوں نے منٹو کی تخلیقات کا مطالعہ انتہائی جانفشانی، محنت، لگن اور غیر جانبداری سے کیا ہے۔ اور بڑے خوبصورت انداز میں منٹو کے افسانوں، ڈراموں اور دوسری غیر افسانوی نثر کو تاریخی سیاق و سباق میں جامعیت کے ساتھ پیش کیا۔ جو منٹو کی شخصیت اور فن پر حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ جس سے افسانوی ادب کا کوئی بھی طالب صرف نظر نہیں کر سکتا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1986 میں شائع ہوئی، اور اپنی شہرت و مقبولیت کی وجہ سے بہت ہی کم عرصے میں ختم ہو گئی۔ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ جو 2013 میں منصۂ شہود پر آیا۔

شبلی اور جہان شبلی

مصنف/ناشر: ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی

صفحات: 208، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2015

مبصر: صبا تمکین، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اردو زبان و ادب میں بے شمار ایسے صاحبان قلم پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے مختلف زاویوں سے ادب کے خزانے کو مالا مال کیا۔ صرف کسی خاص فن یا موضوع پر ہی انھوں نے کام نہیں کیا بلکہ متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی اور انھیں نئی جہتوں اور بلندیوں سے آشنا کیا۔ شبلی کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مگر نئی نسل ان کے روشن کارناموں سے واقف نہیں ہے۔ ایسا ہی ایک نام علامہ شبلی نعمانی کا بھی ہے جو بیک وقت سیرت نگار، مورخ، شاعر، انشا پرداز اور نقاد ہیں۔ ان کی تمام خدمات کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ شبلی کی ذات و خدمات کو نئی نسل تک پہنچانا ضروری ہے۔ محمد الیاس اعظمی کی زیر تبصرہ کتاب 'شبلی اور جہان شبلی' ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف وقتوں میں سیمیناروں میں پڑھے ہیں۔ کل دس مقالات ہیں جن میں شبلی کی کثیر الجہات شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔

علامہ شبلی کا دائرہ کار بے حد وسیع اور متنوع ہے۔ علم و ادب، شعر و نقد، تاریخ، سیاست، تعلیم و تدریس، سیرت و سوانح کلام و عقائد ان کے بنیادی موضوعات تصنیف و تالیف تھے۔ ملک و ملت کے لیے دردمندی اور مسلمانان عالم کے لیے جد و جہد ان کا مقصد حیات تھا۔ جس سے ان کے دائرہ کار میں وسعت پیدا ہوگئی۔

علامہ شبلی اسلامی اقدار و روایات پر بے حد فخر محسوس کرتے تھے اور کسی قسم کا حملہ برداشت نہیں کرتے تھے۔ پہلے مقالے میں اسی حمیت و غیرت کے اثر سے لکھی جانے والی تحریروں کا ذکر ہے۔ دوسرے مقالے میں علامہ شبلی کے فلسفۂ تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ تیسرا مقالہ ان کے تعلیمی نظریات کو بیان کرتا ہے، چوتھے مقالے میں شاعری کے حوالے سے ان کے نظریات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کے مقالے میں شبلی کے مراسلات جو تعداد میں 24 ہیں انھیں بیان کیا گیا ہے۔ یہ مراسلات پہلی بار اس مقالے میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ مقالہ شبلی صدی بین الاقوامی سیمینار میں پیش کیا گیا تھا۔ اور معارف کے 'شبلی نمبر' میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

ظفر حسن ایبک نے ترکی میں الفاروق اور سیرۃ النبی کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کی تفصیلات اس مقالے میں ہیں۔ اس کے بعد علامہ شبلی اور لسان الصدق ہے جو انجمن ترقی اردو کے ترجمان سہ ماہی اردو ادب دہلی کے اکتوبر تا دسمبر 2014 میں چھپ چکا ہے۔ الہلال اور البلاغ اور زمیندار کے مطالعے پر مبنی مقالات اسی مجموعے کے لیے لکھے گئے ہیں جہاں شبلی شناسی کے کئی نئے پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔ شبلی کی کئی نئی تحریریں، خطوط، مراسلات اور نئے خیالات سامنے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ شبلی کی وفات پر تعزیتی نظموں کے ساتھ مختصر مضامین اور مراسلات جو زمیندار میں چھپے تھے انھیں بھی شامل کیا گیا ہے۔ سیرۃ النبی سے متعلق مراسلات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ سلامہ میر محمد مولا پنڈی، لکھنؤ اور رنگون وغیرہ میں شبلی کی وفات پر جو تعزیتی جلسے ہوئے ان کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔

یہ تمام مقالات بہت عرق ریزی اور لگن کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ان تمام مقالات کو کتابی شکل دے کر انھوں نے شبلی شناسی میں اہم اضافہ کیا ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعے نئے حقائق اور شبلی کے بعض نئے خیالات سے اہل علم روشناس ہوں گے۔ یہ کتاب شبلی شناسی کی راہ میں بہت مفید ثابت ہوگی۔

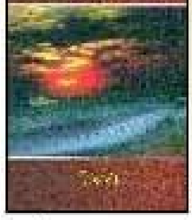

فکر و نظر

مصنف: ڈاکٹر ستار ساحر

صفحات: 208، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: سمیہ مجیدی، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

'فکر و نظر' تحقیقی و تنقیدی نوعیت کی کتاب ہے۔ ڈاکٹر ستار ساحر کی اس سے قبل سات کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، جن میں زیادہ تر کتابوں کا موضوع تنقیدی ہے۔

کتاب میں بائیس مضامین ہیں، جن کی نوعیت مختلف ہے۔ ان مضامین میں اردو کی فلمی بولیاں بھی شامل ہیں، دکنی شعر و ادب کی تدریس اور ان پر چند معروضات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی اقبال اور ساحر لدھیانوی کی شاعری کے اوصاف پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اہل قلم خواتین میں ڈاکٹر عرشیہ جبیں کے مجموعے 'روشن زاویے' اور زینت بشیر کی تصنیف 'بصارت منت' کا تنقیدی جائزہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ڈاکٹر ساحر نے 'اپنی بات' کے عنوان سے کتاب کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید سجاد حسین اور ڈاکٹر سید فضیل احمد نے بھی کتاب سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

پہلا مضمون 'دکنی شعروادب کی تدریس ـــ چند معروضات' ہے۔ دکنی ادب سے ڈاکٹر ستار ساحر کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مذکورہ کتاب میں اس حوالے سے چار مضامین شامل ہیں۔ جن میں "دکنی شعروادب کی تدریس ـــ چند معروضات اور 'مم ن سعید اور ان کی تصنیف خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل" ہیں۔ بلاشبہ ان مضامین کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مصنف کو دکنی ادب سے خاص شغف ہے۔ مضمون 'دکنی شعروادب کی تدریس ـــ چند معروضات' میں مصنف نے ادب کو نظم اور نثر کے حصے میں تقسیم کرکے ایک استاد کی حیثیت سے ان معروضات کی نشاندہی کی ہے، جن کا سامنا دکنی ادب کی تدریس کے دوران ایک استاد کو مختلف مواقع پر کرنا پڑتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اکثر استاد دو الگ اصناف میں فرق نہیں کرپاتے، اس کی وجہ ان کی کم علمی بھی ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر ساحر نے اپنے مضمون میں ان نکات پر زیادہ توجہ دی ہے کہ جن سے بیشتر لوگ کم واقف ہوتے ہیں۔ انھوں نے مثنویات، غزلیات، چند اہم قصوں اور گیتوں کے علاوہ سب رس جیسی اہم کتاب پر گفتگو کی ہے اور دکنی ادب کی لسانی خصوصیات کا جائزہ بھی لیا ہے۔

'علامہ اقبال کی اسلامی فکر (شخصیت اور شاعری کے حوالے سے)' میں جہاں مصنف نے اقبال کی فلسفیانہ شاعری کا مجموعی طور پر مطالعہ کیا ہے، وہیں ان کی شخصیت کو بھی اسلامی فکر اور عشق رسولؐ سے سرشار بتایا ہے۔ مصنف نے اقبال کی مشہور نظم 'خضر راہ' اور 'طلوع اسلام' کے چند اشعار کو پیش کرکے اقبال کے فکروفن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

'مجنوں گورکھپوری کی نظریاتی تنقید' کے عنوان سے ایک مضمون کتاب میں شامل ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے مجنوں گورکھپوری کی تنقیدی کتابوں کے مختصر تعارف کے بعد ان کی تنقید نگاری کے مختلف پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔

مذکورہ کتاب میں ایک مضمون 'ساحر لدھیانوی اور ان کی فلمی شاعری' ہے۔ فلمی نغمہ نگاری کو جن شعرا نے بام عروج تک پہنچایا ان میں جاں نثار اختر، شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، جاوید اختر اور ندا فاضلی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری کا بڑا حصہ ادبی شاعری کے ذیل میں آتا ہے۔ حالانکہ مصنف نے مذکورہ مضمون میں ساحر لدھیانوی کی فلمی شاعری کو ہی اپنے مطالعے کا محور بنایا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ ساحر کی فلمی شاعری میں غزل کی نازک خیالی، حب الوطنی، اخلاقی اقدار، دنیا کے نظام کو بدلنے کی بے چینی کے ساتھ ساتھ ترقی پسند خیالات کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔

'دکن میں اردو غزل ـــ 1960 کے بعد' زیر تبصرہ کتاب میں شامل ایک اہم مضمون اس لیے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ مصنف نے اس مضمون میں 1960 کے بعد کے اہم و معروف شعرا کے رنگ تغزل پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور چند اشعار کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ ان شعرا میں شاذ تمکنت، مضحک حسین، سلیمان اطہر جاوید، راشد آذر، اقبال خسرو اور سلیمان خمار وغیرہ اہم ہیں۔

کتاب کا ایک مضمون 'ریختی گوئی اور اس کا سماجی پس منظر' ہے۔ یہ مضمون ریختی گوئی کی مختصر تاریخ اور اس کے پس منظر کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ ان مضامین کے علاوہ 'امجد حیدرآبادی کی رنگ انتخابی'، 'رب کے حضور میں'، 'تحقیقی شاہکار، روشن زاویے ـــ ایک جائزہ'، 'مصحفی افضل کے گل بوٹے' اور 'مادری زبان ـــ ذریعہ تعلیم' وغیرہ مضامین بھی کتاب میں شامل ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک اچھی کتاب ہے۔

نئی نظریاتی جہات

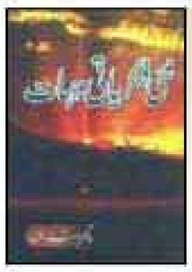

مصنف: ڈاکٹر اے ج مالوی

صفحات: 224، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: اوشین پبلشنگ ہاؤس، جموں اینڈ کشمیر

مبصر: ڈاکٹر صبا خانم، ایف 18-8، تھیس روڈ، جنگا پائی، نئی دہلی

ادب کو نئے نئے زاویوں سے دیکھنے اور پرکھنے کی روایت ایک زمانے سے چلی آرہی ہے۔ نئے نئے نظریات اور تحریکوں نے ادب کو بدلنے میں ہمیشہ سے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر نئے نظریات ادب میں داخل نہ ہوں تو ادب پر جمود کی کیفیت طاری ہوجائے گی اس لیے نئے نظریات کا ادب میں داخل ہونا بھی ادب کی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔

'نئی نظریاتی جہات' بھی نئے نظریات اور نئے خیالات سے وابستگی رکھتی ہے۔ اس کتاب کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلے حصے میں ڈاکٹر اے ج مالوی کی تنقید وتحقیق کے فن پر غلام صدیقی، بلراج بخشی اور محمد حسن ندوی کے مضامین شامل ہیں، یہ مضامین اے ج مالوی کے فکروفن پر روشنی ڈالتے ہیں۔

جن کی 'ویدک ادب اور اردو'، 'ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز'، 'اردو سیکھیں'، 'پریم چند سوانح باتصویر'، 'شری مد بھگوت گیتا (منظوم یزدانی)' اور اردو میں 'ہندو دھرم' جیسی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں تنقیدی اور تیسرے حصے میں تحقیقی مقالات شامل ہیں۔ تنقیدی مضامین میں 'مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ'، 'اردو زبان و ادب کا خدمت گزار اور تاجدار گوپی چند نارنگ'، 'معاصر اردو غزل کے امتیازات'، 'دلت نظمیہ تخلیقیت کے آتش فشاں کا پھول جینت پرمار'، 'نظمیہ شاعری کا آفتاب چندر بھان خیال'، 'سکھی سرونجی کا نظمیہ رنگ و آہنگ'، 'عذرا پروین کی تانیثی شاعری کا فکری اور فنی انفراد' شامل ہیں۔ تحقیقی حصے میں ان کے گراں قدر مضامین 'ویدک ادب اور اردو' اور 'ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز' ہے۔ یہ دونوں مضامین حقیقتاً اے ج مالوی کی گہری تحقیقی بصیرت کا ثبوت ہیں۔ 'ویدک ادب اور اردو' یہ مضمون اردو لسانی ادب کی تحقیق میں بلاشبہ ایک نیا باب ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر اے ج مالوی نے اردو کے نام سے بحث کی ہے۔ انھوں نے اب تک پیش کیے گئے اس نظریے کو یکسر رد کیا ہے کہ اردو ترکی نژاد لفظ ہے، اور اس کے معنی لشکر کے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحقیق میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی جڑیں ویدک عہد اور ویدک ثقافت میں موجود ہیں۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ "اردو زبان کی زندہ اور دھڑکتی ہوئی جڑ ویدک ثقافت میں موجود ہے۔ اس کی حقیقی جڑ کی تلاش میں ہم کو ویدک تہذیب کی گہرائیوں اور اونچائیوں میں مستغرق ہونا پڑے گا۔ ....انگریزوں نے اس خوبصورت اور حسین زبان کو (camp) کی زبان کہا اور اصل اردو کے معنی لشکر، فوج یا بازار کے نہیں ہیں اور نہ ہی یہ ترکی نژاد لفظ ہے بلکہ 'اردو' خالص ویدک لفظ ہے۔" (ص 188)

اس مقالے میں ڈاکٹر اے ج مالوی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لفظ 'اردو' ویدوں میں موجود ہے۔ اس مقالے کی ابتدا میں ڈاکٹر اے ج مالوی نے چاروں ویدوں کا تعارف مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے اصل نکتے کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ لفظ اردو سنسکرت نژاد ہے اور اس کی جڑیں ویدک عہد میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر اے ج مالوی کا یہ دعویٰ کس حد تک قوی ہے اس بات کا فیصلہ تو اردو کے ماہرین لسانیات ہی کریں گے مگر اس بات میں شک نہیں کہ ڈاکٹر مالوی کی اس نئی تحقیق سے اردو داں طبقے میں ایک نئی بحث کا آغاز ضرور ہوگا۔

دوسرا تحقیقی مضمون بعنوان 'ہے رام کے وجود پر ہندوستاں کو ناز' ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر اے جے مالوی نے اردو میں رامائن کے منظوم تراجم کی کئی مثالیں پیش کی ہیں جس سے کہ اردو کے سیکولر مزاج پر روشنی پڑتی ہے یہ بھی ایک معلوماتی مضمون ہے۔

تنقیدی مضامین کے حصے میں سات مضامین شامل ہیں۔ جن میں 'مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ، اردو زبان و ادب کا خدمت گزار اور تاجدار گوپی چند نارنگ، معاصر اردو غزل کے امتیازات، دلت نظمیہ شاعری کے آتش فشاں کا پھول جینت پرمار، نظمیہ شاعری کا آفتاب چندر بھان خیال، سیفی سرونجی کا نظمیہ آہنگ، اور عذرا پروین کی تانیثی شاعری کا فکری وفنی انفراد۔ تنقیدی مضامین کا آغاز 'مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ' سے ہوتا ہے۔ اس مضمون میں مابعد جدیدیت کی مفصل تعریف بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی گوپی چند نارنگ کے مابعد جدیدیت سے متعلق نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا مضمون گوپی چند نارنگ صاحب کے سوانحی حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں ان کی حیات و خدمات کا جائزہ ان کی کتب کی فہرست کے ساتھ مفصل طور سے لیا گیا ہے۔ 'معاصر اردو غزل کے امتیازات' یہ مضمون بلاشبہ معلوماتی بھی ہے۔ اس کو پڑھ کر ڈاکٹر اے جے مالوی کے معاصر اردو غزل کے فن اور موجودہ غزلیہ منظرنامے پر ان کی گہری نظر کا پتہ چلتا ہے۔ دلت نظمیہ شاعری کے آتش فشاں کا پھول جینت پرمار یہ مضمون بھی قابل توجہ ہے۔ اس میں انھوں نے جینت پرمار کی نظمیہ شاعری کا تجزیہ گہرائی سے کیا ہے۔ اور مثالیں دے کر ان کی شاعری کی افادیت اور مقصدیت واضح کی ہے۔ 'عذرا پروین کی تانیثی شاعری کا فکری اور فنی انفراد' اس مضمون میں ڈاکٹر اے جے مالوی نے عذرا پروین کے کلام میں موجود تانیثیت کے گہرے اثرات کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے عذرا پروین کی نظموں کا فکری وفنی تجزیہ مع مثالوں کے پیش کیا ہے۔ عذرا پروین کی نظموں میں موجود تلخی اور گھٹن کو ان مثالوں کے ذریعے بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر اے جے مالوی کی یہ کتاب عمدہ تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کی یہ کتاب سنجیدہ تحقیق وتنقید کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

اکیلا ھنس

مصنف/ناشر: شرافت حسین

صفحات: 192، قیمت: 200، سنہ اشاعت: 2015

مبصر: گلشن، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، (دہلی یونیورسٹی) نئی دہلی

شرافت حسین نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ اور ایک زمانے میں ماہنامہ شاعر، بیسویں صدی، روبی اور شمع وغیرہ میں پابندی سے ان کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ مگر شاعری کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ چنانچہ ان کے تین شعری مجموعے 'رشتوں کے ذائقے' (2004)۔ 'میری دنیا میرے لوگ' (2007)۔ 'تھوڑی سی زندگی' (2014)، اور ایک افسانوی مجموعہ 'کنویں کے باسی' (2011) شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے بیشتر افسانوں میں ہندوستانی بنکروں کی زندگی، ان کی بدحالی، پسماندگی، کم مائگی، بے بسی، استحصال، نفسیاتی پیچیدگیاں اور مسائل و معاملات کی ترجمانی ملتی ہے۔ انھوں نے بنکروں کی زندگی اور ان کے روزمرہ کے کام دھندے سے متعلق ایسے گوشے اپنے افسانوں کے ذریعے عوام تک پہنچائے ہیں جن سے ابھی تک ملک کا ایک بڑا طبقہ ناواقف تھا۔

'اکیلا ہنس' شرافت حسین صاحب کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں کل 38 افسانے ہیں ان میں خصوصاً ہندوستانی بنکروں کی اور وہاں کے ناگفتہ بہ حالات، باشندوں کے درد و کرب و مسائل کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مذکورہ کتاب میں پہلا افسانہ 'جیٹھ کی ایک دوپہر' ہے جس میں مصنف نے بجلی کی کٹوتی اور گرمی کی شدت سے پریشان لوگوں کی واضح تصویر کشی کی ہے۔ دوسرا افسانہ 'گلاب کا پودا' ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے سماج کے تنگ نظریات پر اپنی ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور ان کے بعض اہم پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ اور کہتے ہیں "لوگ پڑھ لکھ کر اتنی ترقی کر رہے ہیں لیکن سماجی دائرہ ویسے کا ویسا ہی تنگ ہے بلکہ اور تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی مذہب اور ذات پات کے جھمیلے میں پہلے ہی الجھتی تھی، اب مسلک میں اور الجھتی جا رہی ہے۔ سمجھ نہیں آتا انسانوں کو کتنے خانوں میں بانٹا جائے گا۔ انسانیت اور آپسی بھائی چارے کی وقعت ہی نہیں رہ گئی......." اسی سلسلے کی ایک کڑی 'اپنی مٹی' افسانہ ہے۔ جس میں ایسے والدین کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دینے کے باوجود پریشان ہیں کیونکہ ان کا بیٹا اپنے والدین کو تنہا چھوڑ کر پیسہ کمانے کی ہوس میں بدیس جا بستا ہے۔ دوسری جانب 'دل اور دنیا' افسانے میں ایسی بیٹی کا ذکر کیا ہے جو اپنے والدین کی عزت کی خاطر اپنی محبت، اپنی چاہت کو بھی قربان کر دیتی ہے۔ اس مجموعے میں غبار، جھنکو چاچا، یہ کیسی صبح، تیشۂ ندامت، گھور کل یگ، بو، شیطان، امن کے خوگر، گھر واپسی جیسے بہترین افسانے موجود ہیں جو سماج کی تلخ سچائیوں پر مبنی ہیں۔

مختصراً یہ کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے چاہے وہ گھریلو مسائل ہوں، سیاسی، سماجی، مذہبی یا نفسیاتی۔ یعنی ہر طبقے کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس پر بھرپور طنز کیا ہے۔ اس لیے ان کی خاص توجہ پلاٹ اور مرکزی خیال پر ہوتی ہے جو موضوع کو بلند فکری اور نیا زاویہ نظر فراہم کرتی ہے جس سے ان کے افسانوں میں جان سی پڑ جاتی ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اطراف و جوانب میں رونما ہونے والے واقعات کو کھلی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور معاشرے میں اٹھ رہے مسائل کو نہایت بے باکی سے بیان کرتے ہیں۔ جن پر بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں۔

اردو علمی آگھی

مصنف: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری

صفحات: 280، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: دار الادب پبلی کیشنز، بڈگام، کشمیر

مبصرہ: شاہدہ شاہد، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو زبان کی تدریس اور تعلیم سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن سے اردو زبان بالخصوص اور دوسری زبانوں کی تدریس کے مسائل کا علم ہوتا ہے۔ تدریس زبان کے مسائل کی نوعیت بہت مختلف ہوتی ہے۔ وقت اور حالات کے اعتبار سے ان میں تبدیلی بھی آتی ہے۔ املا اور رسم الخط کا مسئلہ آج بھی مختلف فیہ ہے۔ اس لیے ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے جس میں تدریس زبان کے بنیادی مسائل سے بحث کی گئی ہو اور اس کے مختلف پہلوؤں کو نئے سیاق میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہو۔ کشمیر ہندوستان کا واحد ایسا خطہ ہے جہاں حکومتی سطح کے اسکولوں میں اردو لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ وہ اردو کے استاد بھی ہیں اس لیے انھیں تدریس زبان کے مسائل کا ادراک ہے۔ ان کی کتاب 'اردو علمی آگہی' میں شامل مضامین ان مسائل کا احاطہ بھی کرتے ہیں اور اپنے تجربات کی مدد سے انھیں حل کرنے کی راہ بھی بتاتے ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کی کتاب 'اردو علمی آگہی' میں پیش گفتار کے علاوہ 13 مضامین شامل ہیں۔ ان تمام مضامین کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے اردو زبان کی تدریس سے ہے۔ پہلا مضمون 'اردو زبان کی تحریری صورت' زبان سے بنیادی نکات سے متعارف

کرایا جاتا ہے۔ اس میں مصنف نے حروفِ تہجی اور اس کی تاریخ، رسم الخط، رموز و اوقاف، لکھاوٹ، تلفظ، خوش خطی اور اردو کے ذخیرۂ الفاظ وغیرہ سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اسی طرح 'اردو تدریس کے مقاصد' کے تحت انھوں نے آموزش زبان کی چار مہارتوں کا ذکر کیا ہے جس میں سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کس سطح پر کس قسم کا مضمون پڑھانا چاہیے، کس عمر کے بچوں کی ذہنی صلاحیت کیا ہوتی ہے اور یونیورسٹی میں زبان پڑھانے کا طریقہ کیا ہونا چاہیے ان سے بھی انھوں نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ تدریس اردو کے مسائل کا ذکر کتاب میں شامل تقریباً تمام مضامین میں ہے مگر یہ کتاب میں شامل ایک مقالے کا عنوان بھی ہے۔ جس میں انھوں نے ان مسائل کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور سہ لسانی فارمولے کی خوبیوں اور خامیوں کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔

تدریس زبان کے مختلف طریقے ہیں لیکن کوئی ایک طریقہ ایسا نہیں ہے جسے ہر سطح پر استعمال کیا جاسکے۔ زور کشمیری نے تدریس زبان کے لیے جن طریقوں کا ذکر کیا ہے ان میں براہ راست طریقہ کار، تقابلی طریقہ کار، قواعدی طریقہ کار، استقرائی طریقہ کار، معروضی طریقہ کار، کھیل کود طریقہ، منصوبی طریقہ کار وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام طریقے ایک ساتھ ایک سطح کے طلبا کے لیے معاون نہیں ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ کون سا طریقہ کس سطح کے طلبا کے لیے کارآمد ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے یہ لکھا ہے کہ ابتدائی سطح پر Play way یا کھیل کود کا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

ابتدائی سطح پر زبان کی تدریس سب سے زیادہ مشکل اور صبر آزما کام تا ہے۔ مصنف کو بھی اس بات کا احساس ہے اسی لیے انھوں نے اس مسئلے پر الگ سے ایک مضمون 'اردو پڑھانے کے ابتدائی طریقے' لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے آموزش زبان کے دو طریقے تحلیلی اور ترکیبی بیان کیے ہیں۔ زبان کی تدریس میں امدادی وسائل کی بہت اہمیت ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ لکھنا، پڑھنا سیکھ لینے کے باوجود کچھ باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں، اسی طرح بولنا اور سننا سیکھنے کے بعد بھی بہت سے الفاظ کا تلفظ معلوم نہیں ہوتا یا کوئی بات کرتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے زبان کی ان مہارتوں کو مکمل کرنے کے لیے کچھ سمعی اور بصری وسائل استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ مصنف نے امدادی وسائل کی فہرست بھی درج کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کون سے آلات کس درجے میں استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زبان و ادب کی تعلیم و تدریس میں دوسرے روایتی امدادی وسائل کے ساتھ ساتھ گراموفون، ٹیپ ریکارڈر، اور دیگر برقی آلات مثلاً پروجکٹر، DVD پلیئر اور کمپیوٹر وغیرہ بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ اب تو صرف کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے ہی بہت سے کام لیے جاسکتے ہیں۔

ان بنیادی معلومات اور مسائل سے نبرد آزما ہونے کے بعد استاد کی ایک بڑی ذمے داری منصوبہ سبق تیار کرنا بھی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری منصوبہ سبق کی اہمیت سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ وہ اسے تدریس کی سب سے اہم شے قرار دیتے ہیں۔ تدریس کے اس پہلو سے انھوں نے بہت اچھی بحث کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی بھی کام منصوبہ بندی کے بغیر اچھی طرح انجام نہیں دیا جاسکتا۔ تدریس کے کچھ مقاصد ہوتے ہیں۔ استاد جب سبق کی منصوبہ بندی کرتا ہے تو اس کی نگاہ ان مقاصد کے حصول پر ہونی چاہیے۔ منصوبہ بندی کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ استاد خود بھی موضوع کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اور پھر وہ طلبا کے سوالات اور ان کی الجھنوں کو آسانی سے رفع کرسکتا ہے۔ منصوبہ سبق کس طرح بنایا جاتا ہے اور اس میں کون کون سے مرحلے ہیں ان تمام باتوں کا انھوں نے تذکرہ کیا ہے۔ کتاب میں بطور نمونہ کچھ منصوبہ سبق بھی شامل ہیں۔

تدریس کی تین اکائیاں ہوتی ہیں۔ استاد، طالب علم اور نصاب۔ ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری نے ان تینوں پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ اچھے استاد، اچھے طالب علم اور عمدہ نصاب میں کون کون سی خوبیاں ہوتی ہیں یا ہونی چاہیے، ان پر تفصیلی گفتگو ہوئی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری کی کتاب 'اردو علمی آگہی' تدریس اردو زبان کے مختلف پہلوؤں کا تقریباً مکمل احاطہ کرتی ہے۔ اردو زبان کی تدریس میں یہ کتاب تمام سطحوں پر کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔

پنچھی جہاز کا

مصنف: حنیف سید

صفحات: 176، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: سید پبلی کیشنز، سوئی کٹرہ، آگرہ

مبصر: صالحہ صدیقی، ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'پنچھی جہاز کا' حنیف سید کا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں افسانوں کی کل تعداد چودہ ہے۔ جو الگ الگ موضوعات پر مبنی ہے۔ انھوں نے افسانوی نثر کے خاکے میں نئے نئے رنگ بھرے ہیں۔ کانٹوں کی چبھن، پھولوں کی مہک، چڑیوں کی چہچہاہٹ، بچوں کی مسکراہٹ، عاشق و معشوق، عورت کی بے بسی، لاچاری، مظلومی و محکومی، مالداروں کی دھونس، مظلوم عورت کی بے بسی، نوجوان نازنین کی تڑپ، وغیرہ تمام سنجیدہ موضوعات آپ کے افسانوں کا اہم حصہ ہیں۔

آپ کے افسانوں میں خوشگوار موسم کی تازگی بھی ہے، شرافت کے چولے میں ملبوس درندے بھیڑیوں کی درندگی بھی ہے۔ ایک طرف ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی ہے تو دوسری طرف بدلتے سماج و معاشرت سے رونما ہونے والی برائیوں کا کچا چٹھا بھی موجود ہے۔

حنیف سید کے افسانوں کے مطالعے کے بعد یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ آپ کے افسانوں میں تشبیہات و استعارات کی بے جا بھرمار نہیں ملتی، ہر کردار ان کے افسانوں میں انفرادی اہمیت رکھتا ہے۔ واقعہ نگاری، منظر نگاری تسلسل اور روانی ان کے افسانوں کا خاصہ ہیں۔ اگر ہم زبان کی بات کریں تو پاتے ہیں کہ آپ کے افسانوں کی زبان کہیں کہیں بہت دقیق ہے جس سے کہانی سمجھنے میں دشواری بھی ہوتی ہے۔ لیکن وہ ایسا انداز بیان اختیار کرتے ہیں کہ کہانی کا اصل مقصد اور معنی خود بخود قاری کے سامنے عیاں ہوجاتا ہے، جو کہ افسانے کی کامیابی کی دلیل ہے۔

اگر ہم ان کے اس مجموعے میں شامل افسانوں کی بات کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے پہلے اور دوسرے افسانے میں عورت کی لاچاری، بے بسی، مظلومی، ایک عورت کی معصومیت، ذہنی اور نفسیاتی کشمکش اور تصادم، صبر و استحصال کی جنگ کو بخوبی پیش کیا گیا ہے جو عورت کی اس صورت کو پیش کرتی ہے جو مجبوری، بے بسی اور لاچاری کے باعث ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لیے شرافت، شرم و حیا، خودداری سب کچھ اس آگ میں ڈال کر بھسم ہوجاتی ہیں۔

حنیف سید نے عورتوں کی نفسیات کو افسانوں میں خاص جگہ دی ہے۔ جیسا کہ ان کا دوسرا افسانہ لیجیے، جہاں ایک طرف ان کے افسانے میں ایک عورت کو کمزور، بے بس و لاچار دکھایا گیا ہے۔ وہیں دوسری طرف حنیف سید کی بلیغ النظری، وثوق مطالعہ تیز مختلف النوع مذاہب، رنگ و نسل، ذات پات، اور جداگانہ کرداروں کے حامل افسانوں خصوصاً عورتوں کی نفسیات کا باریک بینی سے کیا گیا مطالعہ اس بات کا گواہ ہے کہ ان کے اس افسانے 'تجدید سہاگ رات کی' میں عورت کی صورت حال بدل جاتی ہے۔ وہ طاقتور اور مضبوط ہوجاتی ہے۔ اس افسانے میں عورت کو طاقت ور دکھایا گیا ہے۔ ساتھ یہ بھی کہ کس طرح عورت اپنی شرم و حیا، اپنی شرافت، اپنی معصومیت اور مظلومیت کا چولا جب اتار

کر پھینک دیتی ہے تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ مرد سے آگے نکل جاتی ہے۔

آپ کا ایک اور مجموعے میں شامل افسانہ 'بچھا اسٹیل کے' میں موجودہ دور کی صورت حال میں سیاسی عورت کے ذہن کی عکاسی کی گئی ہے۔ ایک ایسی عورت کی تصویر پیش کی گئی ہے جو ایسا ذہن رکھتی ہے کہ مردوں کو خود سے کمتر دیکھنا چاہتی ہے، جو اعلیٰ رتبے پر پہنچ کر مردوں سے انتقام کی آگ میں عورتوں کو مردانے اور مردوں کو زنانے کپڑے پہنوا کر زنان خانے میں قید کر دیتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حنیف سید نے بدلتے وقت کی بدلتی عورتوں کی نفسیات پر نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کو اس طرح اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے کہ ہر عورت کا ہر روپ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

اسی طرح ان کے دیگر افسانے مثلاً باقی رہو میں، اشرف المخلوقات، گدھا اور سونا ہی لہو، آنسو حقیقت کے وغیرہ میں سماج و معاشرے کے الگ الگ مسائل و میلانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے افسانے سماج کا آئینہ ہیں جو ہمیں خبر دیتے ہیں کہ بدلاؤ جو خاموش قدموں سے آہستہ آہستہ اپنے پیر ہمارے درمیان ہی رہ کر کب مضبوط بنا لیتے ہیں، ان کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کی جیتی جاگتی تصویر بھی پیش کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ ادب کے سرمائے میں ایک اضافہ ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب وہ مقام دیا جائے گا جس کی یہ مستحق ہے۔

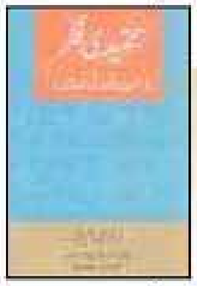

تنقیدی فکر

مصنف/ناشر: ڈاکٹر محمد ناظم علی

صفحات: 140، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: جولائی 2015

مبصر: محمد اسعد، ایچ 68، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

'تنقیدی فکر' ڈاکٹر محمد ناظم علی کی تازہ تصنیف ہے۔ اب تک ان کی چھ کتابیں آئینہ عصر، روح عصر، عکس ادب، حیدرآباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد سے حال تک، پروفیسر آل احمد سرور فکر و فن اور ادبی بصیرت زیور طبع سے آراستہ ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں ان تمام کتابوں پر مختلف رسائل و جرائد میں مبصرین کے شائع ہونے والے تبصروں کو اعترافیہ کے طور پر یکجا کر کے ڈاکٹر محمد ناظم علی نے 'تنقیدی فکر' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ سب سے پہلی کتاب 'آئینہ عصر' پر پانچ تبصرے دوسری کتاب 'روح عصر' پر بھی پانچ تبصرے، تیسری کتاب 'عکس ادب' پر چار تبصرے، چوتھی کتاب 'حیدرآباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد سے اب تک' پر نو تبصرے پانچویں کتاب 'پروفیسر آل احمد سرور فکر و فن' پر سات تبصرے اور چھٹی کتاب 'ادبی بصیرت' پر آٹھ تبصرے شامل ہیں۔ کتاب کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلا تبصرہ 2005 میں شائع ہوا اور سب سے آخری تبصرہ 2014 میں شائع ہوا۔ اس طرح چودہ سال کے وقفے کے دوران ڈاکٹر محمد ناظم علی کی کتابوں پر جتنے اہم تبصرے شائع ہوئے انھیں 'تنقیدی فکر' کے عنوان سے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ جس میں مختلف اہل قلم حضرات کے تنقیدی و تجزیاتی مضامین شامل ہیں اور ان تبصراتی مضامین میں ان کی کاوشوں کو سراہا گیا ہے اور ساتھ ہی زبان و ادب اور تہذیب و شائستگی سے ان کی گہری دلچسپی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جس سے نہ صرف ڈاکٹر محمد ناظم علی کی خدمات کا اعتراف ہوتا ہے بلکہ ان کی صلاحیتوں کو محسوس کرنے والے ادیبوں کی مخصوص دلچسپی کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کتاب میں شامل تمام تبصروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد ناظم علی کی تحقیقی و تنقیدی نثر کو مبصرین نے ستائش کی نظر سے دیکھا ہے اور ان کے انداز کو فطری اظہار کا وسیلہ بتایا ہے۔ ان تبصروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سادگی اور روانی ان کی تحریر کی خصوصیت ہے۔ طبیعت کی انکساری ان کی تحریروں میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ کسی بھی قسم کی عبارت آرائی اور پیچیدہ تراکیب سے پرہیز کرتے ہوئے عام فہم زبان کو تحریر کا وسیلہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس معاملے میں ادبیت سے زیادہ ترسیل کو اہمیت دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی کی کتابوں پر تبصرہ لکھنے والوں میں چند نامور ادیب ہی نہیں بلکہ حیدرآباد سے دلی تک کے چند ابھرتے ہوئے نثر نگار بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر یوسف سرمست، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے علاوہ ڈاکٹر صابر علی سیوانی، ڈاکٹر عسکری صفدر اور نادر المسدوسی وغیرہ کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ناظم علی کی کتابوں کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

اس کتاب کا پیش لفظ پروفیسر مجید بیدار، سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے لکھا ہے۔ اس سے اس کتاب کی اہمیت اور اس کے مضامین کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ محترم نادر المسدوسی صاحب نے 'ڈاکٹر محمد ناظم علی اردو ادب کی دلنواز شخصیت' مجیب صاحب نے 'چہرہ چہرہ آئینہ' محمد عبدالبصیر صاحب نے 'ڈاکٹر محمد ناظم علی کی نثری تصانیف کا جائزہ' ان کے والد محترم محمد خواجہ علی صاحب نے 'ڈاکٹر ناظم علی کے لیے میری دعائیں' کے عنوانات سے مضامین قلم بند کیے ہیں۔ ان مضامین سے ان کی ہمہ گیر شخصیت اور مختلف خصوصیات روزمرہ کی زندگی ان کے شب و روز کی مشغولیت اور اردو ادب سے ان کی دلچسپی اور وارفتگی کا بہتر طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

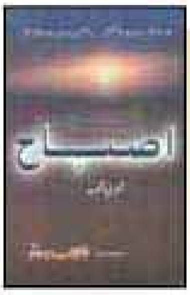

اصباح

شاعر: ڈاکٹر قطب سرشار

صفحات: 128، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد امتیاز احمد

کنٹریکچول لیکچرر، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی، ساؤتھ کیمپس

'عکس و آفاق' 1983، 'اوراق تازہ' 1993، 'اظہار' 2007 جیسے فکر انگیز مجموعوں کے بعد ڈاکٹر قطب سرشار کا چوتھا مجموعہ کلام 'اصباح' 2014 ان کے شعری ذوق و رجحان کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے۔ یہ مجموعہ چار گوشوں پر مشتمل ہے۔ پہلا گوشہ حمد باری تعالیٰ تین حمد پر مشتمل ہے۔ گوشہ نعت 'شہ کونین' میں دو نعت شامل ہیں۔ گوشہ سوم میں 28 غزلیں اور گوشہ چہارم میں 30 نظمیں بعنوانات 'ادراک، انّم الفقرا، ایک خط بعلوں میں، کریدو ملاحظہ چالوں، ایک سوال، اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو پھر، کوئی بھوکمپ ہی آجائے، رضا شی نے کہا، باوجود اس کے، تجھے آواز دیتا ہوں، آداب مہربان بکیں ہم، کوئی خواب سا، خبر جیسا کچھ بھی اور بہت پیچ کرتا ہے، جانے یہ کیسا موقف ہے، حیدرآباد، تمھارا عزم، حصار ذات، قلم لا دورے بن کی، شب کی باہوں میں، کاش، تم مفتوح کیوں ٹھہرے، عہد نو، تمام عمر، تم اور میں، فکر گلیج کا موقف، بیل ترودہ، تہذیب پیش و پس، ہالہ تھا اک علم و دانش کا وہ، شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ''متفرقات'' کا گوشہ بھی ہے، جس میں کچھ دو بیت اور چار بیت شامل کیے ہیں۔

پیش لفظ ان کے مشاہدے، تجربے اور محسوسات فکر و نظر کے محرکات کا پتہ دیتا ہے کہ ان کا سرچشمہ کہاں سے پھوٹتا ہے۔ یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوتی ہے کہ ان کا فکری ماخذ کتاب و سنت ہے۔ انھوں نے سرچشمہ قرآن سے آب حیات پی لیا ہے اور اب خواہاں ہیں کہ لوگ بالخصوص امت مسلمہ موہوم آب حیات کی لاحاصل جستجو چھوڑ کر اسی سے سیراب ہوں۔

ان کی فکر بہت ہی بلند ہے ادبی فکر میں انھوں نے کچھ اہم اساتذۂ ادب سے استفادہ کیا ہے اور اسلامی فکر میں وہ اقبال سے فیض یاب ہوئے ہیں:

حسن نظارہ نہ آلودہ کہیں ہو جائے
ذوق نظارہ سے پہلے پس منظر دیکھو

ان کے بہت سے اشعار میں انداز بیر بھی ملتا ہے:

ناداں ہوا حق ہو کیا ہو جائے گیا سرشار میاں
کہانی درد کی سرشار صاحب

وہ شعر کو برائے شعر نہیں لکھتے بلکہ اپنی فکری بالیدگی کے باعث انھوں نے مقصدی شاعری کی ہے۔ مگر مقصدیت میں خشک فلسفی نہیں بلکہ ایک شگفتہ اور خوش باش شاعر کے منصب پر برقرار رہے ہیں:

ہزاروں سالوں سے مجرم ہی سرخرو ٹھہرے — بھلا یہ جرم کا عرصہ معاف ہے کتنا
ہمارا حال ہے مصلوب احتوں کی طرح — ہمارے جھوٹ نے کتنے ہی سچ مٹا ڈالے

اس مجموعے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ انھوں نے بہت ہی معنی خیز اور بہانی ترکیبات کو از سر نو زندہ و دریافت کیا۔ ہر شعر میں یوں چسپاں کیا ہے کہ انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ شعور دیدۂ حیراں، ملبوسِ ظاہر، پیوست لمس، اجتہادی راز، سطوت فراز، ضموں کی ریت، امیدوں کے گھروندے، ظلمتوں کی شہ رگ، مسل سماعت، نور کے کمیں دھاگے، اجڑے ہوئے بدن کی زمیں وغیرہ اس کی کچھ مثالیں ہیں۔

اس کے علاوہ انھوں نے ان نظموں تمام عمر، تم اور میں، مگر سچ کا موقف، بیکل تر وہ تہذیب وحشی وپس میں ایک نئی طرز برتی ہے۔ اس میں طریقۂ کار یہ اپنایا ہے کہ یہ چار اشعار یعنی آٹھ مصرعوں کی غزل یا قطعہ نما نظم ہے۔ جس میں مطلع اور مقطع ایک ہی رہتا ہے یعنی مطلع کے آخر پر تکرار ہوتی ہے۔ دوسرے شعر میں مطلع کے پہلے مصرعے کو مکرر لایا جاتا ہے۔ تیسرا شعر بالکل ہی الگ یعنی خود مختار ہوتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

تم قید اختیار سے آزاد ہو گئے — میں شرط اعتبار کا پابند ہوں ابھی
سنسان شہر لاشوں سے آباد ہو گئے — تم قید اختیار سے آزاد ہو گئے
کل حادثے تھے آج فقط "یاد" ہو گئے — میں پل کے تجھیوں کو مگر قید ہوں ابھی
تم قید اختیار سے آزاد ہو گئے — میں شرط اعتبار کا پابند ہوں ابھی

(تم اور میں 110)

اس مجموعے کی خرابی یہ ہے اردو صاف کھٹکتا ہے۔

بہت سے موقعوں پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید لغت سامنے رکھ کر شعر لکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تاثیر اور بے ساختگی ہی مرحوم ہو جاتی ہے۔ امید ہے ان کے سابقہ مجموعوں کی طرح جہان علم و ادب میں اس مجموعے کی بھی خوب پذیرائی ہوگی۔

عالمی اردو مجلہ ادبی گزٹ (6)

مرتب: ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی
صفحات: 400، قیمت: 300 روپے، جنوری 2015
مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی، میاں سرائے سنبھل، یوپی 244302

معروف جریدہ 'ادبی گزٹ' کا ماہ جنوری 2015 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ یہ ایک خصوصی شمارہ ہے۔ جس میں بہت اہم مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اس مجلے کے اندراجات کو چار گوشوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آغاز میں 'ابتدائیہ' کے عنوان سے مرتب کی تحریر دی گئی ہے۔ اس کے بعد "خیال اپنا اپنا" کے عنوان سے ایڈیٹر کے نام قارئین کے خطوط دیے گئے ہیں۔ بعدہٗ سعید رحمانی کی 'مناجات' اور ڈاکٹر علی عباس امید اور ڈاکٹر صابر مرزا کی 'نعتیں' دی گئی ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر محبوب راہی کے مضمون 'شاد عارفی کی بازیافت' سے کتاب کے پہلے گوشے کے مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس گوشے میں ملک کے مشاہیر قلم کاروں کے لکھے ہوئے بڑے اہم مضامین یکجا کر دیے گئے ہیں۔ جن میں کچھ نمایاں حضرات کے نام و مضامین اس طرح ہیں۔ حقانی القاسمی کا 'زوال تحقیق کا منظر نامہ'، ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا 'ظہیر غازی پوری کا تنقیدی رویہ'، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا 'اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر سماجی اقدار'، شارق عدیل کا 'مری ہر بات کو تم لوگ دل سے باندھ کر رکھنا'، ڈاکٹر الف ناظم کا 'مصحفی کی شعری نگاری ایک مطالعہ'، قاضی مشتاق احمد کا 'تعلیمی نکات'، محمد عرفان جون پوری کا 'مخطوطہ اکبر الہ آبادی میں پردے کا ذکر' اور شاہانہ مریم کا مضمون 'تحفظ حقوق نسواں اور اردو شاعری' ان کے علاوہ کچھ اور ادیبوں کی تخلیقات بھی دی گئی ہیں۔ اس طرح اس گوشے میں کل بیس مضامین زینت قرطاس کیے گئے ہیں۔ جن میں کچھ تحقیقی ہیں، کچھ تنقیدی اور کچھ تعارفی و تجزیاتی بھی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مرتب مجلہ نے اس گوشے میں تنوع اور رنگا رنگی کا ایک حسین و دلکش چمن سجا دیا ہے۔

جی تو چاہتا ہے کہ مضامین پر بھی کچھ لکھا جائے مگر اختصار اس کی اجازت نہیں دیتا۔

کتاب کا دوسرا گوشہ 'نظمیں، غزلیں' کے لیے مختص ہے۔ اس حصے میں جن شعرا کا کلام شامل کیا گیا ہے ان میں ظفر گورکھپوری، مہدی پرتاپ گڑھی، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، شارق عدیل، مظفر حنفی، عبدالرحیم نشتر، سلیم اختر ہوا فتوری قابل ذکر ہیں۔ گوشۂ شاعری میں کچھ نظمیں اور غزلیں دی گئی ہیں۔ نظموں میں اسلم ایڈووکیٹ کی نظم اردو سے متعلق ہے۔

کتاب میں اگرچہ اور بھی حمد، غزلیات دی گئی ہیں۔ وہ بے شک بھی ہیں۔ جن کی اہمیت کا اندازہ تو مطالعہ کتاب سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد افسانوں کا گوشہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصے میں جن افسانہ نگاروں کی کاوشیں شامل ہیں۔ ان میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، سراج فاروقی، شاکر کریمی، قاضی مشتاق احمد، آنند لہر بطور خاص ہیں۔ اس حصے کے آخر میں صابر فخر الدین کے کچھ انشائیے بھی دیے گئے ہیں۔ جو اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔

اس کے بعد کتاب کا چوتھا اور آخری حصہ 'آئینہ در آئینہ' عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں شاد عارفی: حیات و جہات، تازہ ہوا تنقیدی اشارات، تمل ناڈو میں اردو کی سمت و رفتار، چھتا فن کار، اکیسویں صدی کا چیلنج اور ملی تعلیمی ایجنڈہ، عکس دوار، سارے موسم اس کے ساتھ، پونہ یاترا، دل ہے آئینہ، تنقیدی تلازمے، فلک آثار، باقیات عصمت جاوید، ادبیات راجستھان، فکر و آہنگ، افکار عجیب، وغیرہ الشہ (39) تحقیقی اور اہم کتابوں اور رسالوں پر تنقید و تبصرے شامل کیے گئے ہیں۔ اس حصے میں جن مبصروں کے تبصرے شامل کیے گئے ہیں اور انھوں نے جس انداز سے کتابوں پر اپنے تاثرات رقم کیے ہیں۔ اس سے ان کتابوں کی اہمیت تو بڑھی ہی ہے ساتھ ہی اس مجلے کی افادیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ بحیثیت ایک مبصر کے میرے نزدیک کتاب میں شامل سبھی تبصرے فنی معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اور مختصر کتاب کا مکمل تعارف کراتے ہیں۔

عالمی اردو مجلہ 'ادبی گزٹ' اردو کے اہم رسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ زیر تبصرہ شمارے کو اس کے مرتب ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے جس محنت و صلاحیت کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ وہ اس میدان میں ان کی مہارت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس مجلے کی مجلس ادارت بھی اردو کے سرخیل اہل قلم پر مشتمل ہے۔ یہ مجلہ ہر اعتبار سے ہی لائق مطالعہ ہے۔ اور اپنے گراں قدر مواد کی بنا پر اس کو اردو ادب کی اہم دستاویز قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی جائے اشاعت "مدینہ ویل کیشنز، اودھن پورہ (کساری) مئو ناتھ بھنجن یوپی 275101 سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

■

بزم اردو، قطر کا تیرھواں بین الاقوامی سیمینار اور مشاعرہ

دوحہ (قطر): 15 دسمبر، اردو شاعری کا اگرچہ بڑا حصہ غزل اور اس جیسی صنفوں کو محیط رہا ہے پھر بھی کئی دوسری صنفیں اپنے امکانات متعین کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ مثنوی، قصائد اور مراثی نے غزل کے سامنے جس دور میں

اپنی بساط ادھی سمیٹ لی لیکن انجمن پنجاب کی کوششوں سے نظم نگاری کے لیے محمد حسین آزاد اور حالی نے جو ماحول سازی کی، اسی سے ہماری نظم نگاری نے کچھ ایسی موثر موجودگی کا ثبوت دیا جس کی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غزل کے پہلو بہ پہلو کسی اور صنف کے لیے کوئی گنجائش پیدا ہوتی ہے تو وہ فی زمانہ نظم ہی ہے۔ قطر کے سب سے قدیم ادبی ادارے 'بزم اردو' کے تیرھویں بین الاقوامی سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے اردو کے اہم نظم نگاروں کی خدمات پر گفتگو کے دوران مذکورہ باتیں کہیں۔

مہمان ذی وقار کی حیثیت سے کالج آف کامرس، پٹنہ کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر صفدر امام قادری نے اردو میں نظم نگاری کی تاریخ کی مختلف کڑیوں کو جوڑتے ہوئے یہ کہا کہ انگریزی تراجم اور انجمن پنجاب کی کوششوں سے اگرچہ اردو نظم کی بے پایاں ترقی ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے کافی پہلے سے اردو میں نظم نگاری کا سلسلہ قائم ہوچکا تھا۔ انھوں نے محمد قلی قطب شاہ، فائز دہلوی اور بالخصوص نظیر اکبرآبادی کی نظم گوئی کے امتیازات واضح کرتے ہوئے یہ بتایا کہ محمد حسین آزاد اور حالی سے کافی پہلے اردو میں نظم نگاری کے بہترین نمونے سامنے آچکے تھے۔ پروفیسر قادری نے غزل اور نظم کی مقبولیت اور فی زمانہ اہمیت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ دانش ورانہ افکار ونظریات کی پیش کش کے لیے اردو شاعری میں آج نظم سے بہتر کوئی دوسری صنف موجود نہیں۔ اسی لیے نظم کو بہر طور قائم رہنا ہے۔

سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے قطر کے ادبی حلقے کے روحِ رواں جناب محمد صبیح بخاری نے اردو کے مرکزی علاقے سے دور اردو کے چراغ کو روشن کرنے کے لیے بزم اردو، قطر کے اراکین اور دیگر اداروں سے متعلق ادبا اور شعرا کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ شاعری اور کسی خاص موضوع پر سیمینار منعقد کرکے ہم نے یہاں اپنی تہذیب وثقافت کو محفوظ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادیب اور شاعر حقیقت میں تہذیبی پیغامبر ہوتے ہیں اور دنیا میں انسانیت اور امن کی تبلیغ انھیں کے ذریعہ کامیابی کے ساتھ ممکن ہوپاتی ہے۔

جناب محمد حبیب النبی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اہلِ قطر کو بھی مبارک باد دی کہ ہر بار اردو کے نامور لکھنے والوں کو بلا کر وہ ایک خوش گوار ادبی ماحول قائم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پروگرام کی نظامت معروف شاعر اور بزم اردو کے سکریٹری جناب احمد اشفاق نے کی اور مہمانوں کا خصوصی تعارف پیش کرنے کی ذمہ داری قطر کی مختلف تنظیموں کے سربراہوں نے ادا کی۔

جشنِ اردو کے دوسرے روز بین الاقوامی رسالہ 'مصدف' کی رسم اجرا، بیت بازی اور مشاعرے کا سہ سطحی پروگرام منعقد ہوا۔ جس کی صدارت پروفیسر صفدر امام قادری نے کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے نیشنلسٹ کانگریس پارٹی کے جنرل سکریٹری، سابق مرکزی وزیر اور ممبر پارلیمنٹ جناب طارق انور نے شرکت کی۔ جناب طارق انور نے اردو زبان کی شیرینی اور مقبولیت کی یاد دلاتے ہوئے بزم اردو، قطر کے افراد کی بھرپور تعریف کی اور بتایا کہ اس محفل میں شریک ہوکر انھیں ایسا محسوس ہورہا ہے کہ وہ اپنے وطن میں ہی ہیں۔ مہمانِ ذی وقار کی حیثیت سے عرب شاعر کیپٹن ناصر السویدی اور فیصل حدادی نے بھی اپنے خصوصی خطابات سے مشاعرے کو رونق بخشی۔

مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر صفدر امام قادری نے اہالیانِ قطر کی ادب دوستی کی تعریف کرتے ہوئے ان کے ادبی کاموں سے اپنی سابقہ واقفیت کا ذکر کیا اور بتایا کہ دیارِ قطر میں رہنے والے مختلف شعرا ہم عصر ادبی دنیا میں خاصے نمایاں ہیں اور ان کے کلام کی رسائل میں اشاعت اور جن کے مجموعے شائع ہوگئے ہیں ان کی تحریروں کی بین الاقوامی سطح پر پذیرائی ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مشاعرے میں شعرا کے کلام کو سننے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ یہاں قدیم اور جدید ہر رنگ کے اہلِ قلم موجود ہیں۔ مشاعرے میں امجد علی سرور، شارق اختر، فرطاش سید، عزیز نبیل، احمد اشفاق، ندیم ماہر، اعجاز حیدر، فرزانہ صفدر، قیصر مسعود، زوار حسین، رضا حسین، اطہر ضیا، طاہر جمیل، سعادت علی، وسیع الحق، راقم اعظمی اور انوار کریم نے اپنا کلام سنایا۔ مشاعرے کی نظامت جناب احمد اشفاق نے کی۔

اس دو روزہ پروگرام میں جن اہم اشخاص نے اسے وقار بخشا، ان میں جناب حسن عبدالکریم چوگلے، جناب شہاب الدین احمد، جناب اعجاز حیدر، جناب محمد شفیق، جناب محمد عرفان اللہ، جناب سید فہیم الدین وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ بڑی تعداد میں شائقینِ اردو نے اس پروگرام میں شرکت کی اور ہوٹل سفائر پلازہ کے ہال کو اس خاص پروگرام کے لیے واقعتاً دلہن کی طرح سے سجایا گیا تھا۔

پریس ریلیز، بزم اردو قطر، 15 دسمبر 2015

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے آئین ہند کو مرتب کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لایا: پروفیسر سشما یادو

باباصاحب امبیڈکر نے صرف آئین نہیں ہندوستان کے مستقبل کا منشور مرتب کیا ہے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور قومی کونسل برائے فروغ سندھی زبان (وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند) کے اشتراک سے ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے 125ویں سال ولادت پر ایک روزہ قومی

اردو اور سندھی قومی کونسل کے اشتراک سے ایک روزہ قومی سیمینار ہمارے آئین کی تمہید کا ایک منظر

سیمینار بعنوان 'ہمارے آئین کی تمہید' کا انعقاد انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے آڈیٹوریم میں عمل میں آیا۔ اس سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے جناب اندریش کمار نے کہا کہ ہندوستان کے آئین کی روح کو سمجھے بغیر ملک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ آئین ہمیں ایک ایسا ضابطہ حیات دیتا ہے جس کے ذریعے ہم اپنے ملک اور قوم کی بہتر خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ماں اور مادر وطن سے پیار کرنا ایک اچھے شہری کی پہچان ہے۔ جناب اندریش کمار نے ہندوستان میں کثرت میں وحدت کے تعلق سے کہا کہ ہندوستان ایک یونٹ ہے۔ یہ مختلف علاقوں، ریاستوں یا زبانوں سے مل کر نہیں بنا ہے بلکہ بنیادی طور پر یہ ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے جہاں مختلف زبانوں، مذاہب اور نظریات کو پنپنے، پھلنے کے مواقع میسر ہیں۔ اس موقع پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے تمام مہمانان کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ انھوں نے باباصاحب امبیڈکر کی سماجی، سیاسی بصیرت اور دور اندیشی کو خراج عقیدت پیش کرتے

ہوئے کہا کہ ہندوستان کا اتنا جامع آئین بابا صاحب امبیڈکر جیسا وسیع تر ذہن رکھنے والا ہی مرتب کرسکتا تھا۔ انھوں نے صرف آئین ہی نہیں ہندوستان کے مستقبل کا منشور مرتب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آئین ہند ایک ایسا سماجی دستاویز ہے جس میں بابا صاحب امبیڈکر نے ملک کے محروم طبقات کے مفادات کا بھی خیال رکھا ہے اور ہندوستان کے تکثیری کردار کی روح اور رمز کو بھی آئین ہند میں سمو دیا ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے اس موقعے پر کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ زبان کی دیواریں گرادی جائیں اور تمام زبانوں کا ایک ہی آنگن ہو۔

سیمینار سے ہلدیو بھائی شرما، چیئرمین این بی ٹی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے آئین کی جانکاری ہم تمام ہندوستان کے باشندوں کو ہونی چاہیے۔ ہماری زندگی جب آئین کے مطابق گزرے گی تو پھر ملک میں تناؤ اور نفرت کا ماحول کم ہوگا۔ اپنے تعارفی کلمات میں سندھی کونسل کی وائس چیئرمین پروفیسر ارونا جیٹھوانی نے کہا کہ بابا بھیم راؤ امبیڈکر نے ہندوستان کو ایک ایسا آئین دیا جس کا بنیادی نقطہ سماجی انصاف ہے۔ پروفیسر سشما یادو (پرو وائس چانسلر، اگنو) نے بہت مختصر اور جامع انداز میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ آئین ہند کو مرتب کرنے میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لایا۔ انھوں نے اس موقعے پر علامہ اقبال کا یہ شعر بھی پڑھا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے آئین کے چار اہم ستون ہیں۔ مساوات، آزادی، انصاف اور بھائی چارگی۔ اس اعتبار سے ہمارا آئین ایک مکمل اور مضبوط آئین ہے۔ اس موقع پر خواجہ عبدالمنتقم نے یوم آئین پر بہت ہی جامع اور پر مغز تقریر کی۔ انھوں نے آئین کی تمہید کے حوالے سے کہا کہ اس میں پورے آئین کی روح سما گئی ہے۔ ڈاکٹر ایم کے جتیلی نے سندھی زبان کی جدو جہد اور آئین ہند میں اس کی شمولیت کے حوالے سے گفتگو کی۔ سیمینار میں قومی کونسل برائے فروغ سندھی زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر روی پرکاش ٹیک چندانی نے حاضرین اور مقررین کے ساتھ ساتھ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کا بھی شکریہ ادا کیا۔ سیمینار میں دہلی کی معتبر اور معزز شخصیات بھی شریک تھیں۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 نومبر 2015

فاصلاتی تعلیم کے مراکز میں اضافہ کیا جائے گا: پروفیسر ارتضیٰ کریم

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں فاصلاتی تعلیم کی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کونسل کے تحت فاصلاتی بورڈ کے حوالے کر دیے جائیں تو اس کے مفید اور اطمینان بخش نتائج سامنے آئیں گے۔ ممبران نے اس موقع پر یہ بھی کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے دور دراز علاقوں کے ہائی فاروق الاسلام، محمد خورشید صدیقی، پروفیسر دیے دیو سنگھ، پروفیسر محمود صدیقی، محترمہ حنیفہ مظفر، پروفیسر وہاب قیصر، ڈاکٹر نفیس احمد انصاری، پروفیسر نیلوفر خان، محترمہ انیس

قومی کونسل کے صدر دفتر میں فاصلاتی تعلیم سے متعلق میٹنگ کا منظر

تعلیم کے مراکز پر مفصل روشنی ڈالی اور مراکز کی کارکردگی کا جائزہ لیا۔ انھوں نے اس موقع پر کہا کہ آئی اے ایس کوچنگ کی تجویز زیر غور ہے۔ کونسل کے ممبران نے بھی تجاویز اور مشورے پیش کیے۔ ممبران کی اکثریت نے یہ تجویز رکھی کہ این جی او کے بجائے فاصلاتی تعلیم کے مراکز اسکول یا سکینڈری اسکول سے بھی رابطہ کیا جانا چاہیے۔ کچھ علاقوں میں فاصلاتی تعلیم کے مراکز میں اضافے پر بھی غور کیا گیا، خاص طور سے ان دور دراز علاقوں میں جہاں لوگوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ میٹنگ میں ڈاکٹر محمد عبدالحکیم اظہری، ڈاکٹر اسرائیل رضا، ڈاکٹر قاسم خورشید، جناب منوری بیگم کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، جناب انوار الحق، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر فیاض عالم، جناب مسرور سعید وغیرہ نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 نومبر 2015

جمیل الدین عالی معاصر تخلیقی ادب کا ایک روشن حوالہ تھے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

نئی دہلی: اردو کے معروف شاعر و ادیب جمیل الدین عالی کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ جمیل الدین عالی معاصر تخلیقی ادب کا ایک روشن حوالہ تھے۔ انھوں نے مختلف ادبی اصناف کی ثروت میں گراں قدر اضافہ

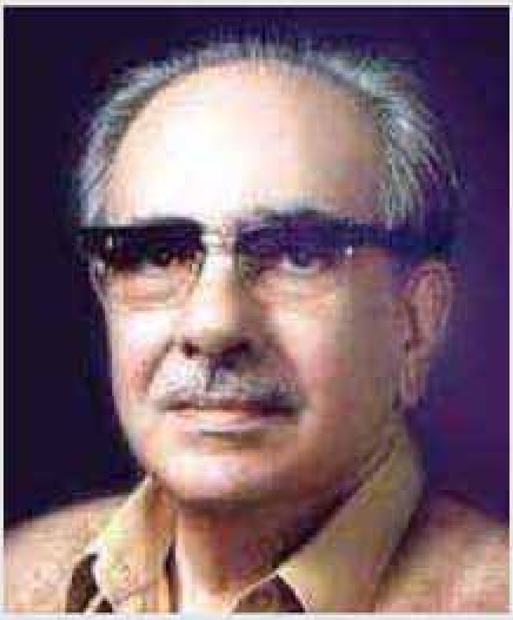

کیا ہے جس کا اعتراف پوری اردو دنیا نے کیا۔ دوہے کے حوالے سے پوری دنیا میں وہ ایک الگ شناخت رکھتے تھے۔ انھیں جتنی قدر و منزلت پاکستان میں حاصل تھی اس سے کہیں زیادہ محبوبیت اور مقبولیت ہندوستان میں ملی۔ ان کے انتقال سے دوہے کے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ جمیل الدین عالی نے ہند و پاک کے ثقافتی اور تہذیبی رشتوں کو مستحکم کرنے کے لیے بہت کوششیں کیں۔ اس تعلق سے انھوں نے تہذیبی اور ثقافتی مکالمے پر زور دیا اور جب بھی ہندوستان تشریف لاتے ہند و پاک کے باہمی ثقافتی رشتوں پر ضرور اظہار خیال کرتے تھے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ انھوں نے غزلیں، گیت اور دوہوں کے علاوہ دنیا میرے آگے، تماشا میرے آگے جیسے سفرنامے بھی لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ پاکستان نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اعلیٰ ادبی اعزازات سے سرفراز کیا۔

جمیل الدین عالی کی وفات پر قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ تعزیتی نشست میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی رحلت سے ادبی دنیا میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ان کا تعلق دہلی کی سرزمین سے تھا۔ ان کے آباؤ اجداد کا غالب اور لوہارو خاندان سے گہرا رشتہ تھا اور ان کی والدہ خواجہ میر درد کے خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت ان کی رگوں میں رچی بسی تھی اس لیے ہندوستان سے ہجرت کرنے کے باوجود ان کے دل میں اپنی مٹی سے محبت ہمیشہ قائم و دائم رہی۔ دوہے کی شکل میں وہ اپنی مٹی کو ہمیشہ خراج محبت پیش کرتے رہے۔

جمیل الدین عالی کے انتقال پر منعقدہ اس تعزیتی نشست میں قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایڈیٹر عبدالحی کے علاوہ کونسل کے دیگر اسٹاف بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، معاونہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 24 نومبر 2015

محبوب الرحمٰن فاروقی کی وفات ادبی صحافت کا بڑا خسارہ: پروفیسر ارتضیٰ کریم

نئی دہلی: معروف رسالہ ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی کے سابق ایڈیٹر محبوب الرحمٰن فاروقی کی وفات کو ادبی صحافت کا بڑا خسارہ قرار دیتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ محبوب الرحمٰن فاروقی اردو زبان

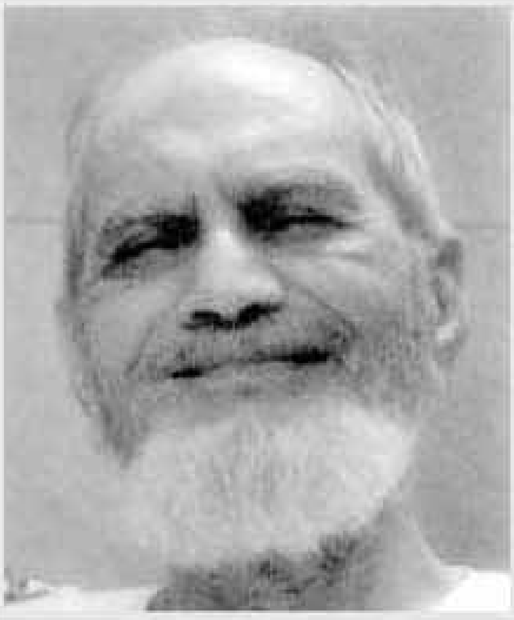

کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے اور انھوں نے اپنے دورِ ادارت میں ماہنامہ 'آجکل' میں اردو زبان کے مسائل اور اس کی ترقی و فروغ کے امکانات کے حوالے سے جو اداریے لکھے ان کا اردو حلقے پر گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے کہا کہ محبوب الرحمٰن فاروقی اردو زبان کے مسائل اور متعلقات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ خاص طور پر انگریزی اخبارات میں اردو یا اقلیتوں کے تعلق سے جو معلوماتی تحریریں شائع ہوتی تھیں وہ ان کے ترجمے کر کے اخبارات میں اشاعت کے لیے بھجوایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے دورِ ادارت میں نئی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو بھی پروان چڑھایا۔ 'آجکل' کے خصوصی شماروں اور گوشوں کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا جس کی وجہ سے رسالہ کی مقبولیت اور قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ محبوب الرحمٰن فاروقی اپنے اداریوں کے ذریعے اردو والوں طبقے کو خواب گراں سے بیدار کرتے رہتے تھے، یہ ان کا اہم کارنامہ ہے۔ انھوں نے ماہنامہ 'آجکل' کی جو ادارتی خدمات انجام دی ہیں وہ ادبی صحافت کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔

پریس ریلیز، معاونہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 دسمبر 2015

عصر حاضر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت

لکھنؤ: اترپردیش کے گورنر رام نائک نے کہا ہے کہ ملک کی سبھی ریاستوں میں اردو زبان بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔ ہندی، ہندوستان کی قومی زبان ہے اور ہندی کے بعد ملک میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اردو ہے۔ وہ ہوٹل کلارکس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت عصر حاضر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت موضوع پر منعقد دوروزہ سیمینار کا افتتاح کرنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی سبھی ریاستوں میں تین زبانوں کا سنگم ہونا چاہیے جس میں قومی زبان ہندی، متعلقہ ریاست کی زبان اور اردو شامل ہو۔ انھوں نے کہا کہ ملک کو مولانا ابوالکلام آزاد کی ضرورت و معنویت پر غور کرنا ہوگا۔ ہندوستان، ہندو مسلم سب کا ہے اور ہمیں ایسے پروگراموں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ میں ریاست کی 25 یونیورسٹیوں کا چانسلر ہوں اور یہ دیکھنا ہوگا کہ نوجوانوں میں مولانا آزاد کی معنویت و افادیت کا پیغام کیسے جائے کیونکہ ملک کا مستقبل نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ گورنر جناب رام نائک نے کہا کہ یہ سچ نہیں ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے کیونکہ یہ ہندی کے بعد ملک میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ گورنر نے کہا کہ پورے ملک میں ثقافتی نظریہ ہر جگہ ایک ہی ہے اور زبان جوڑنے کے لیے ہوتی توڑنے کے لیے نہیں۔ انھوں نے اس موقعے پر جاری کی گئی کتاب 'مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ' کو ہندی و ملک کی دیگر زبانوں میں شائع کرانے کا بھی مشورہ دیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے پروفیسر رضوان قیصر نے اپنے کلیدی خطبے میں بیگم حضرت محل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جھانسی کی رانی کو جس طرح یاد کیا جاتا ہے اس کے مقابلے بیگم حضرت محل کو فراموش کر دیا گیا۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مولانا آزاد کی مکہ میں ولادت سے لے کر کلکتہ میں قیام، ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور 'الہلال' و 'البلاغ' کی اشاعت سے لے کر 1947 تک کے سفر پر تفصیلی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا جو نصب العین تھا قوم نے اسے بھلا دیا لیکن آج بھی مولانا آزاد کی شخصیت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ مولانا آزاد کی توجہ اردو زبان اور قومی یکجہتی پر تھی اور آج دونوں پر سوالیہ نشان لگ رہے ہیں لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے نصب العین کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں کیونکہ جب تک ان کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوں گے ہندوستان مکمل نہیں ہوگا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے معزز مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے میر انیس، پنڈت نول کشور و دیگر رہنماؤں پر جلسہ کرنے کی بات کہی۔ انھوں نے ڈاکٹر عبدالستار دلوی کو مولانا آزاد پر مبنی مضامین یکجا کرکے کتاب مرتب کرنے پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے مختلف مقامات سے مضامین یکجا کرکے اس کتاب میں مولانا کی زندگی کو سمو دیا ہے۔ مولانا آزاد، ہندوستان اور جنگ آزادی کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب کافی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا 'اردو دستخط' گورنر رام نائک کے توسط سے ملا ہے۔ انھوں نے اس دستخط پر مبنی ایک چاندی کا سکہ جاری کرنے کی گزارش کی۔ انھوں نے لکھنؤ میں اردو گیلری کے لیے اراضی مہیا کرانے کی گورنر اور وزیر اعلیٰ سے درخواست کی۔ گورنر نے اس سلسلے میں ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ سیمینار میں کبیر صدیقی کی تیار کردہ مولانا آزاد پر مبنی مختصر سی ڈی بھی چلائی گئی۔ سیمینار کا دوسرا سیشن پروفیسر شارب ردولوی کی صدارت میں شروع ہوا جس کی نظامت پروفیسر شفیق اشرفی نے کی۔ اس سیشن میں مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر کے چند تکثیری پہلو موضوع پر پروفیسر عبدالستار دلوی، تکثیری معاشرہ میں مولانا ابوالکلام کی معنویت موضوع پر خواجہ اے منعم اور فیروز احمد بخت نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ آخر میں پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ جو بنیاد مولانا آزاد نے تعلیم کے شعبے میں رکھی ہے، آج بھی ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ آج ہم جس تکثیری معاشرہ کی بات کرتے ہیں اس کی پہلی اینٹ مولانا ابوالکلام آزاد نے رکھی تھی۔ اس موقعے پر طالبات نے قومی گیت بھی پیش کیا۔

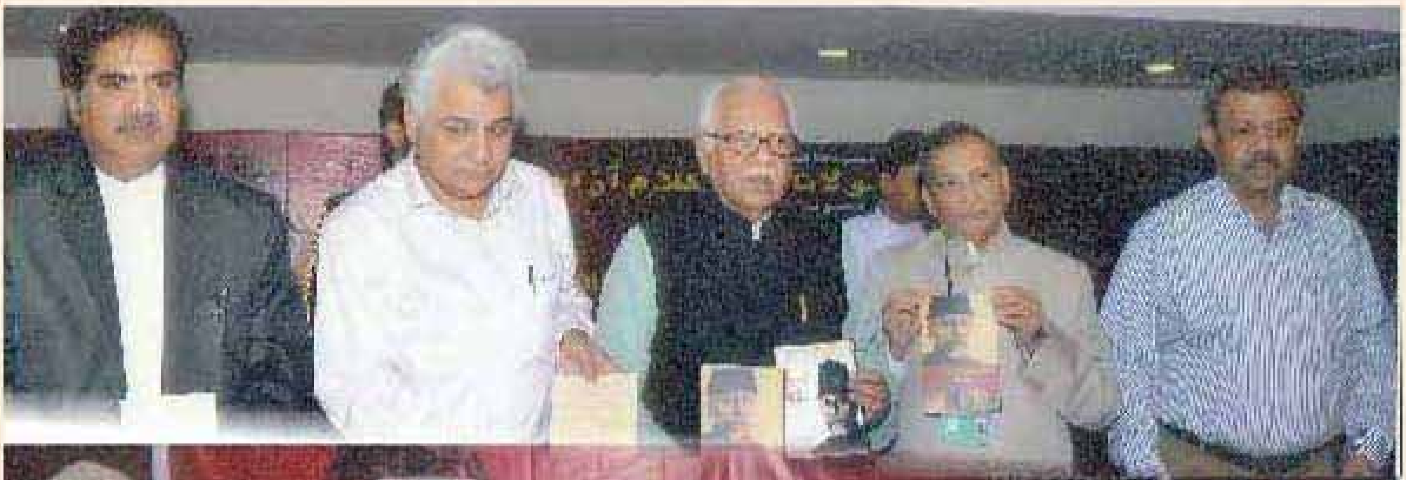

روزنامہ صحافت دہلی، 20 نومبر 2015

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

عربی وفارسی مخطوطات پر تین روزہ ورکشاپ

نئی دہلی: بے شمار مخطوطات ہنوز کتب خانوں میں بند ہیں اور تحقیق کی منتظر ہیں۔ یہ مخطوطات جب تک منظر عام پر نہ آجائیں ان کی حیثیت ایک طرح سے دفینے ہی کی ہے۔ ان دفینوں کو تحقیق کرکے وقف خاص وعام کر دینے کی ضرورت ہے اس لیے مخطوطات کی تدوین کی ٹریننگ دینے اور اس علمی اور تحقیقی ذوق کو عام کرنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار ایران کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر علی فولادی نے کیا۔ وہ شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام نیشنل مشن فار مینو اسکرپٹ (این ایم ایم)، وزارت سیاحت وثقافت حکومت ہند کے اشتراک سے فارسی، اردو اور عربی میں مخطوطہ شناسی اور ایڈیٹنگ کے لیے تیس روزہ ایڈوانس لیول کورس کے لیے منعقدہ ورک شاپ کی افتتاحی نشست سے بطور مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے قرآنی آیات کی روشنی میں مخطوطات کی اہمیت کو بیان کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے خطاب میں کہا کہ مخطوطات ہمارا علمی سرمایہ ہیں۔ ان کے تحفظ وبقا کے لیے جدوجہد جاری رہنی چاہیے۔ مخطوطات کا تحفظ اس کی ایڈیٹنگ اور طباعت ہے۔ اس کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے انھیں اپنانا چاہیے۔ اس موقعے پر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے اپنے خطاب میں مخطوطہ شناسی اور ایڈیٹنگ کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کرتے ہوئے کہا کہ مخطوطہ شناسی اور تحقیق کے لیے زبان وادب میں مہارت اور موضوع سے پوری مناسبت اور مخطوطہ کے مختلف نسخوں کا علم اور تقابلی مطالعہ لازمی شرط ہے۔ انھوں نے کہا کہ مخطوطہ کی ایڈیٹنگ کے لیے مختلف رسم خط پڑھنے میں مہارت حاصل کرنی پڑتی ہے، کیونکہ تمام مخطوطے ایک ہی رسم خط میں نہیں ہوتے ہیں اور پھر ہر عہد کا رسم خط الگ ہوتا ہے۔ پروفیسر خان نے مزید کہا کہ عربی مخطوطات کی تحقیق کے لیے عربی زبان اور قواعد سے واقفیت اور جدید دور کے تحقیقی اور علمی طریقوں سے واقفیت ضروری ہے۔ قبل ازیں این ایم ایم کی ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس باسو نے اپنے خطاب میں این ایم ایم کی حصولیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ قومی سطح پر ہونے والے اس ورکشاپ سے استفادہ زیادہ سے زیادہ کیا جانا چاہیے۔ ورکشاپ کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر چندر شیکھر صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے ورکشاپ کی اہمیت وافادیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ مخطوطات ملک کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہیں۔ نشست کی نظامت ورکشاپ کے نگراں ڈاکٹر علیم اشرف خاں، استاذ شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے کی۔ کلمات تشکر شعبۂ فارسی کے استاذ ڈاکٹر راجندر نے ادا کیے۔ اس موقعے پر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ پروفیسر ولی اختر، ڈاکٹر نعیم الحسن اثری، ڈاکٹر مجیب اختر اور ڈاکٹر محمد اکرم، ڈاکٹر اصغر محمود، شعبۂ فارسی کے اساتذہ ڈاکٹر علی اکبر شاہ، ڈاکٹر مہتاب جہاں، ڈاکٹر ضیا کے علاوہ شعبۂ فارسی، عربی اور اردو کے ریسرچ اسکالرس موجود تھے۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 17 نومبر 2015

اسلامک کیلی گرافی کی نمائش کا انعقاد

رامپور: فیسٹول آف انڈیا ماریشس 2015 کے تحت ہندوستانی ہائی کمیشن اور اسلامک ثقافتی مرکز ماریشس کے مشترکہ زیر اہتمام رامپور رضا لائبریری میں بیش قیمت اسلامک کیلی گرافی کی نمائش کا انعقاد کیا گیا۔ اس نمائش کا افتتاح مہمان خصوصی ماریشس کے نائب وزیر اعظم شوکت علی سودن کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مہمان ذی وقار وزیر ثقافت ماریشس سنت رام بابو اور ہندوستانی ہائی کمشنر انوپ کمار مدگل، اسلامک ثقافتی مرکز ماریشس کے صدر سمیع اللہ لوثین، اور رامپور رضا لائبریری کے نمائندوں کی حیثیت سے سید طارق اظہر اور ہمانشو سنگھ موجود رہے۔ تقریب کے آغاز پر سید طارق اظہر نے ماریشس کے نائب وزیر اعظم اور ہمانشو سنگھ نے وزیر ثقافت کو لائبریری کی شائع کردہ کتب کا تحفہ دیا۔ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے نائب وزیر اعظم شوکت علی سودن نے کہا کہ ہندوستانی ثقافت نے عالمی پیمانہ پر اپنی نہ مٹنے والی چھاپ چھوڑی ہے۔ ہندوستانی ثقافت دنیا کی تاریخ میں کئی نظریوں سے خصوصی مقام رکھتی ہے۔ یہ دنیا کی قدیم ثقافتوں میں سے ہے۔ اور دوسری خصوصیت اس کا تسلسل ہے۔ اس ثقافت نے نہ صرف اس پورے خطے کو تہذیب کا سبق پڑھایا ہے بلکہ ہندوستان کے باہر دیگر علاقوں کی اقوام کو مہذب بنایا ہے۔ مہمان ذی وقار وزیر ثقافت ماریشس سنت رام بابو نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان ثقافتی طور پر مزین ملک ہے۔ ہندوستان کی ثقافت میں کئی اجزا شامل ہیں جس میں ملک کی طویل تاریخ، منفرد جغرافیہ اور اس کے ساتھ ہی پڑوسی ممالک کے رسم وروایات اور نظریات بھی شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ پانچ ہزار سال سے زائد عرصے سے ہندوستان کے مختلف رسم ورواج، تہذیب اور زبانیں باہمی میل جول کی بہترین مثال ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں اتنے اعلیٰ کیلی گرافروں نے جنم لیا جن کی تخلیقات آج پورا ماریشس دیکھ رہا ہے۔ اس موقعے پر ہندوستانی ہائی کمشنر انوپ کمار نے بھی خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کئی مذہبی طریقۂ زندگی جیسے کہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بدھ وغیرہ کو شامل کیے ہوئے ہے۔ انھوں نے رضا لائبریری

چوتھے بین الاقوامی شاعری میلہ کے پروگرام میں فرحت احساس، عطاء الحق قاسمی اور دیگر شخصیات

کی تحریف کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی جانب سے ماریشس کے ناظرین کے لیے رضا لائبریری انڈو اسلامک تعلیم اور ثقافت کا خزانہ لے کر آئی ہے۔ اس موقع پر رضا لائبریری کی نمائندگی کرتے ہوئے سید طارق اظہر نے لائبریری کی تاریخ اور ثقافت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے تقریباً 50 کیلی گرافی میں قرآن پاک کی آیات، احادیث، دعائیں اور نوابین کے بارے میں لکھا ہوا رقعہ ناظرین کو دکھایا۔ تقریب کے اختتام پر ہمانشو سنگھ نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر ہندوستانی ہائی کمیشن کے ساتھ ساتھ ماریشس کے ناظرین کثیر تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ سیاسی تقدیر دہلی، 20 نومبر 2015

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام آل انڈیا قومی ثقافتی تقریب

امپھال: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام آل انڈیا قومی ثقافتی تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقع پر تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کے صدر وشوناتھ پرساد تیواری نے کہا کہ شاعری تخلیق کاروں کا قیمتی سرمایہ ہے۔ شاعر اپنے احساسات کی گہرائی سے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے اور اس کو معنی کا لبادہ دے کر اس کو الفاظ کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ انھوں نے میر، تلسی، غالب، بہاری، کالی داس کی نظموں کو بطور مثال پیش کرتے ہوئے یہ باتیں کہیں۔ افتتاحی پروگرام میں استقبالیہ کلمات اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر سری نواس راؤ نے پیش کیے اور اس اجلاس کی نظامت بھی کی۔ مشہور ڈوگری شاعرہ پدم سچدیو نے افتتاحی کلمات پیش کیے۔ اس موقع پر نظم خوانی کے اجلاس میں کنڑ سے ایچ ایس شیو پرکاش، انگریزی سے ایس پی کمار، ہندی سے لیلا دھر جاگوڑی، تمل سے بال سبرامنیم، تیلگو سے وی پاروتھم اور اردو سے عبدالاحد ساز نے اپنی نظمیں پیش کیں۔ اس کے علاوہ دیگر زبانوں کے تخلیق کاروں نے اپنی اپنی زبانوں میں نظمیں اور اس کا ترجمہ بھی پیش کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت معروف اڑیہ شاعر ہر پرساد داس نے کی جس میں آسامی میں نیلم کمار، ہندی میں گنگا پرساد وِمل، منی پوری میں رگھو لیشانگ تھم، مراٹھی میں پربھا ورکر، پنجابی میں دیپا، راجستھانی میں مال چند تیواری اور سنسکرت میں راما کانت شکل نے اپنی نظمیں پیش کیں۔ آخری اجلاس کی صدارت انگریزی اور آسامی زبان کی مشہور شاعرہ نیلسو لا آکو نے کی۔ اس اجلاس میں بانگلا زبان میں شوبھر بندھو پادھیائے، گجراتی میں ورشا داس، کشمیری میں فیاض دلبر، میتھلی میں وِبھاشنکر نوین، ملیالم میں انور علی، سندھی میں لکشمن دوبے اور اردو میں عادل رضا منصوری وغیرہ نے اپنی نظمیں پیش کیں۔

روزنامہ تحریر، دہلی، 7 نومبر 2015

اُردو میں معلوماتی مواد تیار کرنا اولین ترجیح: اسلم پرویز

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر پروفیسر محمد اسلم پرویز نے اس احساس کا اظہار

کیا ہے کہ طلبہ کو احساس کمتری سے باہر آتے ہوئے خود اعتمادی پیدا کرکے مسابقت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے کیونکہ محنت کی جائے تو کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔ اردو یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر کے طور پر حال ہی میں اپنی ذمے داری سنبھالنے والے پروفیسر محمد اسلم پرویز نے یو این آئی اردو سے خصوصی بات میں کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں معلوماتی مواد تیار کرنا اور اردو یونیورسٹی کے طلبہ کو انگریزی میں ماہر بنانا، ساتھ ہی دینی مدارس کے طلبہ کے لیے برج کورسز کی شروعات ان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ انھوں نے برج کورسز کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی کے ہر کورس کے لیے برج کورس تیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو میڈیم یا پھر دینی مدارس سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد یونیورسٹی کے کسی بھی کورس میں داخلے کے خواہش مند طلبہ کو فائدہ ہو۔ ان برج کورسز کے ذریعے اردو میڈیم یا دینی مدارس سے آنے والے طلبہ کی مواصلاتی مہارت اور بول چال کی انگریزی میں اس قدر سدھار لایا جائے کہ یہ طلبہ آسانی کے ساتھ اردو یونیورسٹی کے مختلف کورسز میں داخلہ پاسکیں۔ جناب اسلم پرویز نے کہا کہ اردو میں اقتصادیات، تجارت، سائنس اور ماحولیات سے متعلق کتابیں تیار کی جانی چاہیے تاکہ ان کتابوں کو اردو عوام تک پہنچایا جائے۔ اس کے لیے وقت دینا بھی ان کی ترجیح میں شامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر دینی مدارس کے طلبہ اصل تعلیمی دھارے میں آنا چاہتے ہیں تو یہ برج کورسز ایک پلیٹ فارم ثابت ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے اردو یونیورسٹی کی شروعات کے دور کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ دہلی میں یونیورسٹی کا ریجنل سنٹر انھوں نے ہی قائم کیا تھا۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے طلبہ کو روزگار سے جوڑنے کے منصوبوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو ذریعہ تعلیم والے طلبہ کی انگریزی مستحکم ہوجائے تو مارکٹ میں ان کے روزگار کے وسیع مواقع پیدا ہوں گے۔ ساتھ ہی طلبہ کے لیے اسکل ڈیولپمنٹ سنٹرس بھی قائم کیے جائیں جو ان کے لیے مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس دہلی، 23 نومبر 2015

چوتھا بین الاقوامی شاعری میلہ

لکھنؤ: سوسائٹی برائے شعر و ادب (سوسائٹی فار پوئٹری اینڈ لٹریچر) کے زیر اہتمام چوتھے بین الاقوامی شاعری میلے کا انعقاد ہندی سنستھان واقع حضرت گنج میں کیا گیا۔ پروگرام کے پہلے اجلاس میں 'جشن ادب' کے تحت ایک مذاکرہ بعنوان 'میڈیا کا بدلتا چہرہ' میں پاکستان سے آئے شاعر و صحافی عطاء الحق قاسمی، معروف شاعر فرحت احساس اور صحافی سدھیر کمار (ایڈیٹر، نو بھارت ٹائمس) نے حصہ لیا۔ نظامت کے فرائض جموں و کشمیر سے آئے زمرد مغل نے انجام دیے۔ فرحت احساس نے کہا کہ میڈیا کا فرض

ہے کہ وہ چیزوں کو اپنی عینک سے نہ دیکھے۔ لیکن اب عموی طور سے ایسا نہیں ہورہا ہے۔ اب الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا دونوں ہی جگہ یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ خبروں کو اپنے نظریہ کی عینک سے دیکھا جارہا ہے اور اسی انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہ صحافتی ایمانداری نہیں ہے۔ سدھیر مشرا نے کہا کہ گاندھی جی کے زمانے میں صحافت ایک مشن تھا۔ لوگ گھر بیچ کے اخبار نکالتے تھے لیکن اب صحافتی رویے بدل گئے ہیں۔ اس کا معیار بدل گیا ہے۔ یہ تبدیلی معاشرے میں بھی آئی ہے۔ لوگوں کی ترجیحات بدل ہوگئی ہیں ان کا طرز فکر بھی بدلا ہے۔ اس لیے صحافت میں بھی کچھ ترجیحات اور رجحانات بدلے ہیں لیکن میڈیا نے اپنی ذمے داری سے منہ نہیں موڑا ہے۔ آج کی صحافت میں چیلنجز زیادہ ہیں۔ پاکستانی مہمان عطاء الحق قاسمی نے اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کل اور آج کی صحافت میں بڑا فرق ہے۔ پہلے صحافی اخبار نکالتے تھے اور آج سیٹھ لوگ اخبار نکالتے ہیں۔ جو صحافیوں کے اخبار اور چینل ہیں وہاں صحافتی قدریں زندہ ہیں لیکن جو تاجروں اور کارپوریٹ گھرانوں کے اخبارات اور چینل ہیں انھوں نے ایک مقصد کے تحت میڈیا میں داخلہ لیا ہے۔ وہ ہر چیز کو فروخت کرتے ہیں۔ دوسرے اجلاس میں 'رشتوں کو بہتر بنانے میں زبان کا کردار' کے موضوع پر مذاکرہ ہوا جس میں پدم شری اشوک چکردھر، عطاء الحق قاسمی، شرد پردھان اور زہرہ مثل نے حصہ لیا۔ یہاں بھی یہ بات ابھر کر سامنے آئی کہ زبان کی دو شکلیں ہیں ایک وہ ہے جو روزمرہ کی عام بول چال میں انسان استعمال کرتا ہے۔ دوسری وہ ہے جسے تخلیقی زبان کہا جاتا ہے۔ اسی زبان میں شعروادب لکھا جاتا ہے۔ تخلیقی زبان میں الفاظ زیادہ گہرائی میں اترتے ہیں۔ جب بے حسی بڑھنے لگے تو شعروادب ہی وہ کردار ادا کرتے ہیں کہ انسان دوسروں کا درد محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس لیے ادب ہر سماج کے لیے بہت ضروری ہے۔ رشتوں میں بہتری لانے کا سب سے اہم ذریعہ زبان ہے اور زبان میں سب سے زیادہ موثر شاعری ہے۔ شرد پردھان نے کہا کہ صحافت اور ادب کی زبان الگ الگ ہے صحافت میں سیدھا تخاطب ہوتا ہے جبکہ ادب میں سیدھا تخاطب نہیں ہوتا۔ وہ بہت گہرائی میں جاکر انسان کی روح سے تخاطب ہوتا ہے۔

پروگرام کے تیسرے اور آخری حصے میں جشن اشوک چکردھر اور انڈو پاک مشاعرہ بھی ہوا جس کی صدارت پدم شری گوپال داس نیرج نے کی۔ مہمان اعزازی کے طور پر پاکستانی شاعر عطاء الحق قاسمی نے شرکت کی۔ یکے بعد دیگرے اشوک چکردھر، ادے پرتاپ سنگھ، عطاء الحق قاسمی (پاکستان)، حسن عباس (پاکستان)، عزیز احمد (پاکستان)، احسان شاہد (لندن)، فرحت احساس دہلی، خورشید سنگھ شاد، قیصر خالد، منیش شکلا، مونکا سنگھ، بھارت بھوشن پنت، تارا اقبال، زہرہ مثل، مینا کمار، کنور رنجیت سنگھ چوہان نے اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ اردو صحافت دہلی، 19 نومبر 2015

دہلی:

دہلی میں پانچ روزہ اردو وراثت میلہ

نئی دہلی: پورے ملک کی شناخت لال قلعہ اور اردو زبان ہے۔ ہمیں ایسا نہیں لگتا کہ کوئی بچہ بغیر اردو اور اردو

کے شعر کے بغیر جوان ہوجاتا ہے۔ اردو واقعی محبتوں کی زبان ہے۔ ہندوستان تہذیب کا گہوارہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار لال قلعہ کے باہر سبزہ زار پر اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام 'اردو وراثت میلے' کا افتتاح کرتے ہوئے دہلی کے وزیر برائے فن، ثقافت والسنہ کپل مشرا نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج بابا گرونانک کے موقعے پر اردو وراثت میلے کا افتتاح کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر دہلی کے وزیر خوراک ورسد عمران حسین نے بہ حیثیت مہمان اعزازی شرکت کی۔ اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اردو کی وراثت کو بچانا ہے، اردو ہماری تہذیب ہے زندگی ہے اور ہماری زبان ہے۔ ہندی اور اردو دونوں بخشش ہیں ان کے بغیر ہماری تہذیب وثقافت زندہ نہیں رہ سکتی۔ عمران حسین نے کہا کہ اردو محبت، امن اور قومی یکجہتی کی زبان ہے۔ اس پروقار اردو وراثت میلے میں لوگوں کی اتنی تعداد ہونی چاہیے کہ حکومت دہلی اردو وراثت میلے کو کرانے پر مجبور ہوجائے۔ وراثت میلے کی افتتاحی تقریب کے بعد سورتر شنا گروپ نے اردو ترانہ اور قومی گیت پیش کیے اور دیو سماج اسکول، سکھ دیو وہار کے بچوں نے صوفی کلام، غزلیں اور قوالی پیش کی۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض اطہر سعید اور ریشماں فاروقی نے انجام دیے۔ اردو اکادمی کے سکریٹری ایس ایم علی نے اظہار تشکر پیش کیا۔

'اردو وراثت میلے' کے دوسرے دن دہلی اردو اکادمی نے مختلف ثقافتی پروگراموں کا اہتمام کیا جن میں غزل گائیکی، قوالی کی محفلیں، صوفیانہ محفل، چہار بیت اور مشاعرہ شامل تھے۔ مختلف فنون کی نمائش جس میں خطاطی، روایتی دست کاری، مہندی، چوڑی اور روایتی کھانوں کا اور بچوں کے لیے کٹھ پتلی، جادوگری، بائی اسکوپ و چھوٹے جھولوں کا بھی انتظام کیا گیا۔ دہلی کے اسکولوں اور کالج کے طلباو طالبات نے بھی اس موقعے پر روزانہ اپنی ثقافتی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ دوسرے دن ثقافتی پروگرام کے سلسلے میں رامپور کے معروف قوال جاوید حسین خاں چشتی و ہمنوا نے قوالیاں پیش کیں۔ ممبئی کی معروف صوفی گلوکارہ محترمہ اندرا نائک نے صوفیانہ کلام پیش کیا۔

اردو وراثت میلے کے تیسرے دن ماڈرن گرلز پبلک اسکول اور ذاکر حسین اسکول جعفرآباد کے بچوں نے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ بچوں نے صوفی کلام، غزلیں اور قوالی پیش کیں۔ نظامت کے فرائض اطہر سعید اور ریشماں

فاروقی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی وزیر برائے ٹرانسپورٹ گوپال رائے کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس موقعے پر خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ گوپال رائے ایک شخص نہیں بلکہ شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی پوری زندگی خدمت خلق میں گزری ہے۔ ثقافتی پروگرام میں معروف غزل گلوکار انیس احمد خاں نے غزلیں پیش کیں اور محفل قوالی میں چنچل بھارتی نے قوالیاں پیش کیں اور آخر میں ممتاز قوال اسلم صابری نے اپنے فن کا مظاہرہ کرکے لوگوں کو جھومنے پر مجبور کر دیا۔ جبکہ شعبۂ کتابت وخطاطی کے استاذ حافظ وسیم احمد اور ان کے شاگرد محمد اسماعیل اظہر نے شائقین کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، جسے دیکھ کر لوگ محظوظ ہوئے۔

اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام جاری 5 روزہ 'اردو وراثت میلہ' کے چوتھے دن دہلی کے اسکولوں اور کالج کے طلبا وطالبات نے ثقافتی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز سید عابد حسین جامعہ سینئر سکنڈری اسکول کے بچوں نے کیا اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے صوفیانہ کلام، غزلیں اور قوالی پیش کیں۔ اس کے بعد سینٹ اسٹیفنس کالج 'بزم ادب' کے طلبا نے تمثیلی مشاعرہ پیش کیا۔ بطور مہمان خصوصی کرشنا نگر کے ممبر اسمبلی ایس کے بگا نے شرکت کی۔ ایس کے بگا کا استقبال اردو اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی اور سکریٹری ایس ایم علی نے کیا۔ اس موقعے پر معروف غزل گلوکار رمن دیو گن نے غزلیں پیش کیں۔ 'داستان گوئی' کی محفل بھی آراستہ کی گئی، محفل داستان گوئی میں مشہور داستان گو فوزیہ و فضل رشید نے داستان پیش کی۔ حیدرآباد کے ممتاز ومعروف قوال عتیق حسین بندہ نوازی اور ہمنوا نے قوالی پیش کی۔ نظامت کے فرائض اطہر سعید اور ریشماں فاروقی نے انجام دیے۔

اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ 5 روزہ 'اردو وراثت میلہ' نہایت ہی تزک واحتشام کے ساتھ اختتام پذیر ہو گیا۔ جس میں پانچ دنوں تک مختلف قسم کے ادبی و ثقافتی پروگراموں کا اہتمام کیا گیا۔ اختتامی پروگرام میں دہلی اسمبلی کے اسپیکر رام نواس گوئل نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس موقعے پر مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت وزیر خوراک و رسد عمران حسین نے کی۔ مشاعرے میں شریک ہوئے شعرائے کرام میں راحت اندوری، منظر بھوپالی، جوہر کانپوری، قاسم امام، رئیس انصاری، بجے مصرا شوق، فرحت شہزاد، پاپولر میرٹھی، چیلو لکھنوی، ملکہ نسیم و دیپتی مشرا، مشاعرے کی نظامت مشہور ومعروف ناظم مشاعرہ انور جلال پوری نے کی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 26 تا 30 نومبر 2015

اردو کی تعلیم کیوں اور کیسے؟

نئی دہلی: عالمی یوم اردو اور علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقعے پر یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام بستی حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکادمی میں 'تعلیمی اداروں میں اردو کی تعلیم۔

کیوں اور کیسے' کے عنوان پر ایک روزہ سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مولانا ثناء اللہ امرتسری کی حیات و خدمات پر سہیل انجم کے ذریعے مرتب مجلہ کی رسم اجرا مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مولانا محمد رحمانی نے اس موقعے پر کہا کہ جنگ آزادی میں اردو کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا 'انقلاب زندہ باد' اردو زبان کا نعرہ تھا جس نے انگریزی حکومت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ انھوں نے کہا کہ آج ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے گھروں سے اردو غائب ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حکومت کے سامنے اردو میڈیم اسکولوں کے قیام اور اردو اساتذہ کی بحالی کے لیے مضبوطی کے ساتھ اپنا موقف رکھیں۔ سابق ممبر اسمبلی چودھری متین احمد نے اس موقعے پر کہا کہ حکومتیں اگر کسی زبان کو پسند کریں تو وہ پھل پھول سکتی ہیں۔ ہمیں ذمے داری کے ساتھ اردو کے تحفظ کے لیے کھڑا ہونا پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو محض مشاعروں اور سیمیناروں تک سمیٹ کر رکھا جا رہا ہے یہ فکر کی بات ہے اس سلسلے میں بیٹھ کر لائحہ عمل بنا کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ منصف دہلی، 10 نومبر 2015

اخترالایمان صدی تقریبات جلسے میں مائک پر صدیق الرحمٰن قدوائی، اسٹیج پر ڈاکٹر سید رضا حیدر، پروفیسر شمیم حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی

اخترالایمان صدی تقریبات

نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے زیر اہتمام اردو نظم کے عہد ساز شاعر اخترالایمان کی صدی تقریبات کا اوّلین جلسہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ پروگرام کی نظامت غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے کی۔ انھوں نے نظامت کے دوران اخترالایمان کی شاعری کی عصری معنویت پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر معروف نقاد اور دانشور شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ اخترالایمان کا اردو ادب پر بڑا احسان ہے۔ ان کے عہد میں کئی بڑے شعرا اور ادبا تھے لیکن ان کی شاعری سب سے منفرد ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اقبال کے بعد اخترالایمان ہی وہ شاعر ہے جس نے شاعری میں ڈرامائی عناصر کو پیدا کیا ہے۔ اخترالایمان کے بغیر اس نظم کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس کے نمائندہ میراجی، ن م راشد اور فیض احمد فیض ہیں۔ اخترالایمان کے بعد جو چند اہم شعرا سامنے آئے ہیں وہ اخترالایمان کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے پروفیسر ایمریٹس پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ ان کی شاعری ایک طرح سے چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ شاعری کے ساتھ تنقید کا رچا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی نظموں کو غزل کے پیرائے سے ہٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ اخترالایمان کی شاعری میں عصری عناصر فطری طور پر آفاقی آہنگ اختیار کر لیتے ہیں، اسی لیے اکثر اوقات ان کی نظموں پر الگ الگ عصریت اور آفاقیت کا گمان ہوتا ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ دہلی کی ادبی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے

ڈاکٹر حسین ایوننگ کالج میں اختر الایمان صدی لیکچر سیریز

جب اختر الایمان کی شاعری پر گفتگو کرنے کے لیے اتنے اہم لوگ جمع ہوئے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر درویش ورما نے اختر الایمان کی نظموں کو جس انداز سے پڑھا وہ نظموں کی ساخت سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ اخیر میں یہ اعلان کیا گیا کہ انجمن کے ادبی مجلے 'اردو ادب' کا آئندہ شمارہ اختر الایمان کے لیے مخصوص ہوگا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 3-2 نومبر 2015

اختر الایمان صدی لیکچر سیریز

نئی دہلی: شعبہ اردو ڈاکٹر ذاکر حسین دہلی کالج ایوننگ 'بزم ادب' کے زیر اہتمام منعقدہ 'اختر الایمان صدی لیکچر سیریز' کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مظہر احمد نے انجام دیے۔ ایوننگ کے پرنسپل ڈاکٹر مسرور احمد بیگ نے استقبالیہ کلمات پیش کیے جس میں خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نوشاد عالم نے تمام مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ 2015 وہ صدی ہے جس میں کئی ادیبوں کی صدی تقریبات منعقد ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ سو برس قبل جن ادبا کا جنم ہوا وہ ادب میں جتنی اہمیت کل رکھتے تھے آج بھی رکھ رہے ہیں۔ اختر الایمان وہ شاعر رہے جس نے شعری منظرنامے پر اپنی منفرد راہ نکالی تھی وہ اہم اور منفرد شاعر تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہی ادیب ممتاز اور منفرد ہوتا ہے جو معاصرین کی لیک سے ہٹ کر لکھتا ہے لہٰذا ہمیں اپنی شناخت منفرد بنانی چاہیے۔ پروفیسر انور پاشا نے 'اردو ناول فن و تکنیک'، ڈاکٹر خالد جاوید نے 'اردو افسانہ فن و تکنیک'، ڈاکٹر ریاض احمد نے 'اردو میں ناول نگاری' اور ڈاکٹر شاہد تسلیم نے 'پریم چند کی افسانہ نگاری' پر مقالے پیش کیے۔ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر فرحت کمال اور ڈاکٹر نوشاد عالم نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ روزنامہ خبریں دہلی، 7 نومبر 2015

آندھرا پردیش:

کرنول میں اردو یونیورسٹی کی منظوری

حیدرآباد: آندھرا پردیش کے کرنول ضلع میں اردو یونیورسٹی قائم کرنے کے حکومت کے فیصلے کے ساتھ ہی محبان اردو کرنول میں مسرت کی لہر دیکھی جا رہی ہے۔ سنگ بنیاد کے سلسلے میں ضلع کلکٹر کرنول نے ڈسٹرکٹ مائناریٹی ویلفیئر افسر کرنول جناب شیخ مستان ولی کی نگرانی میں اپنی رہائش گاہ پر مسلمانان کرنول کے درمیان ایک مشاورتی اجلاس منعقد کیا۔ اس موقعے پر ضلع کلکٹر کرنول مسٹر وجے موہن نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی منظور ہونا بڑی بات نہیں اس کو جلد سے جلد قائم کرلینا اہم بات ہے۔ انھوں نے یقین دہانی کروائی کہ بہت ہی جلد اس کی تعمیر مکمل کرلی جائے گی۔ ضلع کلکٹر نے کہا کہ یونیورسٹی کی تعمیر کے لیے حیدرآباد روڈ پر اور کل کے پاس ایک وسیع اراضی مختص کی گئی ہے۔

روزنامہ صدائے دکن حیدرآباد دہلی 7 نومبر 2015

اتر پردیش:

ہم عصر اردو غزل: سمت و رفتار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ہم عصر

اردو غزل: سمت و رفتار' پر دو روزہ قومی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر شکیل احمد قاسمی نے کہا کہ اردو غزل نے قاری کی کوکھ سے جنم لیا۔ اردو میں غزل ہی سب سے ممتاز صنف ہے اور غزل اردو شاعری کا سرمایہ حیات ہے۔ اردو غزل کی خوبی اس کے حسن اختصار اور اجمال میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ 1960 کے بعد کی غزل نے اظہار کے نئے طریقے دریافت کیے ہیں۔ افتتاحی جلسے میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ غزل کی صنف ایک ایسی صنف ہے جس کی کلاسیکی شعریات پہلے سے متعین ہے جس پر گذشتہ بیس سالوں میں بے انتہا مباحث پیش ہوتے ہیں۔ اردو غزل میں اس کی جمالیات، رسومیات اور ابلاغی تصور فکر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ انھی تصورات نے غزل کا قالب اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اردو غزل کے ارتقا اور تبدیل ہوتے موضوعات اور رجحانات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کلاسیکی شعرا نے اردو غزل کی جس روایت کا آغاز کیا تھا وہ ولی سے میر، سودا اور غالب سے ہوتے ہوئے دور جدید تک پہنچی اور عصر حاضر میں وہی شاعری کامیاب اور مقبول ہوئی جس نے ماضی سے اپنا رشتہ قائم رکھا۔ انھوں نے کہا کہ غزل کے لہجے میں عہد بہ عہد آئی تبدیلی اور تقسیم ہند کے بعد رونما ہونے والے واقعات و حالات کی وجہ سے انسانی اقدار کی پامالی کو ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی اور ابن انشا وغیرہ نے اپنی شاعری کے موضوعات میں شامل کیا۔ انھوں نے کہا کہ جدیدیت نے جس طرح پوری دنیا کے مسائل کو اوڑھ لیا تھا وہ بڑی مصنوعی ثابت ہوئی اور اسی وجہ سے اس رجحان نے دم توڑ دیا۔ اس سے قبل شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر سید محمد ہاشم نے اپنے افتتاحی خطبے میں ہم عصر غزل کی سمت و رفتار کا تعارفی خاکہ پیش کیا۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے خدا بخش لائبریری کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے کہا کہ اردو غزل میں ہماری تہذیب کا خلاصہ ہے۔

'ہم عصر اردو غزل: سمت و رفتار' کی افتتاحی تقریب میں پروفیسر قدوس جاوید نے ریسرچ اسکالروں سے ادبی مباحثے میں شرکت کرنے کی تلقین کی جبکہ فرحت احساس نے کہا کہ پہلے علی گڑھ سے ہی جدیدیت پر عہد ساز سیمینار کا انعقاد ہوا تھا اور اب ہم عصر اردو غزل پر سیمینار کا انعقاد قابل مبارکباد ہے۔ دہلی سے آئے پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی نے کہا کہ اسلاف کی روایت کو شعبہ اردو نے برقرار رکھا ہے۔ اس موقعے پر صدر شعبہ اردو پروفیسر سید محمد ہاشم نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ریشما پروین، ڈاکٹر مہتاب

علی گڑھ میں میں اردو میلے کے افتتاح کا منظر

حیدر نقوی وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ نظامت کے فرائض سیمینار کے کنوینر پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 22 نومبر/ راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 نومبر 2015

علی گڑھ میں اردو میلہ

علی گڑھ: شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے یوم پیدائش کے تعلق سے جامعہ اردو علی گڑھ میں عظیم الشان دو روزہ 'اردو میلہ' منعقد کیا گیا جس کا افتتاح جامعہ اردو کیمپس میں مشترکہ طور پر جامعہ اردو مشاورتی کونسل کے چیئرمین پروفیسر رضاء اللہ خاں، رجسٹرار مسٹر شمعون رضا نقوی، او ایس ڈی جامعہ اردو مسٹر فرحت علی خاں، اور ڈائرکٹر ڈاکٹر جسیم محمد نے سرخ فیتہ کاٹ کر کیا۔ اپنے افتتاحی خطبے میں پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کہا کہ علامہ اقبال صرف اردو اور فارسی کے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک عظیم محب وطن، فلسفی اور قومی رہنما کا بھی درجہ رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال کے اشعار میں حب الوطنی اور اسلامی فلسفہ کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے او ایس ڈی فرحت علی خاں نے کہا کہ اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا لیکن پھر بھی اردو مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو روزگار سے جوڑے جانے کی سخت ضرورت ہے اور جامعہ اردو علی گڑھ اس سمت میں سرگرم عمل ہے اور اس نے جو کورسیز شروع کیے ہیں وہ بازار کی مانگ کے مطابق ہیں اور طلبا کو براہِ راست روزگار سے جوڑیں گے۔ جناب شمعون رضا نقوی نے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ نے ہمیشہ اردو کی ترقی کے لیے کام کیا ہے اور اس قسم کے پروگرام اردو زبان کو عوام میں مقبول بنانے کا اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔ اردو میلے میں منعقدہ بیت بازی، مذاکرے، غزل سرائی، شعر خوانی وغیرہ مقابلوں میں چلڈرنس پبلک اسکول، علی گڑھ پبلک اسکول، جامعہ آکسفورڈ پبلک اسکول اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سمیت شہر کے متعدد اسکولوں، کالجوں اور اداروں کے طلبا و طالبات نے حصہ لیا۔ اردو میلے میں مختلف اسٹال لگائے گئے جن میں سرسید بک ہاؤس، علیشا پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، تہذیب الاخلاق اے ایم یو، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ اردو علی گڑھ اور صدائے انصاری نے اپنے اسٹال لگائے جن پر محبان اردو نے بڑی تعداد میں اردو کتب، رسائل اور اخبارات کی خریداری کی۔

روزنامہ 'منصف' دہلی، 9 نومبر 2015

اردو ذریعہ تعلیم ایک جمہوری حق، مسائل اور امکانات

حسن پور: ضلع کی معروف، تعلیمی، تہذیبی تنظیم عبدالمجید میموریل جونیئر ہائی اسکول، حسن پور میں اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کے اشتراک سے ایک سیمینار بعنوان 'اردو ذریعہ تعلیم، ایک جمہوری حق، مسائل اور امکانات' عبدالمجید میموریل جونیئر ہائی اسکول، حسن پور میں منعقد ہوا۔ سیمینار میں ضلع کی ادبی، علمی، دینی و سماجی، سیاسی شخصیات کے علاوہ، ڈگری کالج میں زیر تعلیم طلبہ و یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔ صدارت ڈاکٹر رضاء الرحمن عاکف سنبھلی نے فرمائی اور نظامت معروف صحافی، شاعر ندیم راہی و ضلع بجنور کی معروف سماجی، سیاسی، ادبی شخصیت الیاس انجم نے مشترکہ طور پر کی۔ سیمینار کی کنوینر سلمہ انصاری نے اپنے استقبالیہ کلمات میں تمام مہمانوں کا تعارف کرایا و گل پوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ کسی قوم کے لیے اس کی مادری زبان اس کا بیش قیمتی سرمایہ ہوتی ہے۔ دوسرا بیش قیمتی سرمایہ اس کی تہذیب ہوتی ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ مادری زبان اور تہذیب کے ذریعہ انجینئرنگ، میڈیکل، مینجمنٹ وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ڈاکٹر اسما خان نے کہا کہ جب ہم قوموں اور ملکوں کی بڑھتی ہوئی ترقی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے پیچھے ان کی اپنی مادری زبانوں کا ہاتھ رہا ہے۔

ڈاکٹر ناصر پرویز نے کہا کہ اردو سماج کے بارے میں کئی غلط فہمیاں ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اترپردیش میں اردو مرچکی ہے۔ اس منفی سوچ سے بہت نقصان ہوا ہے۔ اسے ہم لسانی دہشت گردی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس موقع پر دیگر شرکا نے بھی اپنے بیش قیمتی خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 نومبر 2015

مولانا آزاد کا 127 واں یوم پیدائش

ٹانڈہ رامپور: انجمن ترقی اردو اترپردیش کا ایک جلسہ کاشانۂ وقاء الرحمن جامعی میں مقامی یونٹ کے صدر حافظ محمد زاہد ٹانڈوی کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مجاہد آزادی اور بھارت رتن

مولانا ابوالکلام آزاد کے 127 ویں یوم پیدائش کو یوم اردو صحافت کے طور پر منایا گیا۔ اس موقع پر انجمن ترقی اردو اترپردیش کے جنرل سکریٹری و سابق میونسپل چیئرمین محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ نے کہا کہ مولانا آزاد نے اپنی تمام زندگی اندرون ملک و دیگر ممالک میں آپسی میل جول اور تعلق کو بڑھانے پر زور دیا۔ رحمانی نے کہا کہ مولانا آزاد کی فکر اس معاملے میں واضح تھی کہ وہ عصری اور دینی تعلیم کے امتزاج کو ضروری سمجھتے تھے تاکہ دین و دنیا کا فائدہ ہوسکے۔ مولانا آزاد اس حقیقت سے واقف تھے کہ اسلام میں عصری و دینی تعلیم کی تفریق نہیں ہے اور علم کے ذریعے ہی دنیا کی قیادت کی جاسکتی ہے۔ اس سے قبل انجمن کے صوبائی خازن شوق امروہی نے کہا کہ مولانا آزاد نے تعلیم کے میدان میں دین و دنیا دونوں کا توازن قائم کرکے ملک و ملت کو اچھے راستے پر پہنچا کر قومی، ملی و ملکی خدمات انجام دیں، سماجی کارکن انجمن کے سرگرم رکن محمد عثمان سیفی نے کہا کہ اہل اردو کو اردو کی بقا کے لیے خود لڑائی لڑنی ہوگی مولانا عبدالمعبود قاسمی نے کہا کہ اسمبلی میں لینگویج ایکٹ میں تبدیلی کرکے اردو کو قانونی درجہ دیے جانے کی ضرورت ہے، زاہد ٹانڈوی نے کہا کہ اردو کے لیے ابھی بہت کام کیا جانا باقی ہے۔ کاغذی یا زبانی سطح پر سرکاری زبان کا درجہ مل جانے سے کسی بھی زبان کا فروغ

نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے کہا کہ آج مولانا کے یوم اردو صحافت کے موقعے پر ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلنے کی ضرورت ہے۔ مولانا آزاد کی بے لوث خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ اردو قوموں، مذہبوں اور دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔ اب یہ پوری دنیا میں رابطے کی زبان بن کر ابھر رہی ہے۔ اس موقعے پر رفیق سیفی، ماسٹر محمد اکرام، حافظ محمد حنیف، پرنسپل محمد لقمان، نوید اظفر، ماسٹر محمد عرفان، قاری محمد جنید، ضمیر الدین، اختر علی وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض محمد شکیل سیفی نے انجام دیے۔

پریس ریلیز: محمد اظفر رحمانی، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو اترپردیش، 11 نومبر 2015

اردو کے بغیر معاشرہ کی ترقی ناممکن

مراد آباد: اترپردیش اردو اکادمی و انجم ویلفیئر سوسائٹی کے اشتراک سے 'اردو کے بغیر معاشرہ کی ترقی ناممکن' موضوع پر سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ رستوگی دھرم شالہ میں منعقد اس سیمینار میں بطور مہمان خصوصی سماجی خدمت گزار حاجی نسیم الحسن باقری ایڈووکیٹ نے شرکت کی جبکہ بطور مہمان ذی وقار سردار گروبند سنگھ موجود رہے۔ مہمان خصوصی حاجی نسیم الحسن نے کہا اردو ایک مذہب کی زبان نہیں بلکہ سبھی مذاہب کی زبان ہے۔ یہ زبان تہذیب کی زبان کہلاتی ہے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہیے، جس سے بھائی چارے کو مزید فروغ مل سکے۔ سردار گروبند سنگھ نے کہا کہ اردو زبان ہر جگہ عام کرنا چاہیے۔ انھوں نے بچوں کو دیگر زبانوں کو ساتھ اردو کی تعلیم دلائے جانے پر بھی زور دیا۔ سیمینار میں مقالہ پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر شفیق الرحمن برکاتی و ڈاکٹر علی جان، ڈاکٹر شاکر علی و ڈاکٹر ایم اے معروف، ترنم پروین، صائمہ بختاور نے اپنے گراں قدر مقالے پیش کیے۔ صدارت کر رہے اترپردیش اردو اکادمی کے رکن و سینئر صحافی سید محمد ہاشم نے کہا کہ اردو کے بغیر معاشرہ کی ترقی ناممکن ہے۔ ہم کو اردو کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہیے۔ سمیتی کی صدر انجم پروین نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 نومبر 2015

اردو زبان کا ماضی حال اور مستقبل

سنت کبیر نگر: اترپردیش اردو اکادمی، مولانا آزاد ایجوکیشنل اینڈ ہیومن سائنس سوسائٹی رجسٹرڈ کے باہمی اشتراک سے تسنیم النساء گرلس انٹر کالج محلہ قاضی پور مگہر میں 'سنت کبیر نگر میں اردو زبان کا ماضی حال اور مستقبل' کے عنوان پر یک روزہ قومی سیمینار منعقد کیا گیا جس کی سرپرستی الحاج بدر عالم انصاری بصدارت مولانا و مفتی وسیم احمد قاسمی نے کی۔ اس موقعے پر قلم فورم گورکھپور کے سکریٹری عبدالباقی حاصل نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور مہمانان ذی وقار میں ماسٹر ناصر علی خاں، مولانا امان اللہ، ماسٹر محمد ذکیم وغیرہ شامل تھے۔ سیمینار کا آغاز مولانا امان اللہ کی نعت پاک سے ہوا۔ مقامی مقالہ نگاروں نے اردو زبان کے ماضی حال اور مستقبل پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اپنے خطاب میں مہمان خصوصی نے کہا کہ اردو کی تعلیم کے لیے گھر گھر پہنچ کر لوگوں سے رابطہ کیا جائے کہ لوگ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم سے آراستہ کرائیں کیونکہ اردو وہ زبان ہے جس میں محبت روانی اور مٹھاس ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے اسکول اور کالجوں میں الگ سے کلاس چلانے کا حکم ہونا چاہیے تاکہ ہندوستان میں پیدا اس زبان کا بھی اس کو حق مل سکے۔ مفتی وسیم نے کہا کہ دنیا کی کوئی بھی زبان سیکھنے پر کوئی ممانعت نہیں ہے۔ سیمینار کے کنوینر قاضی عدیل احمد نے کہا کہ اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے لیکن اس کے پروان چڑھنے میں ہماری کاوش کی ضرورت ہے۔ اخیر میں محمد اعظم صدیقی نے کہا کہ تعلیم سے انسان سربلند ہوتا ہے اور اردو کی تعلیم لوگوں کو تہذیب یافتہ بناتی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 نومبر 2015

مانو لکھنؤ کیمپس میں توسیعی خطبہ

لکھنؤ: اردو صرف زبان نہیں ہے بلکہ یہ ایک شناخت، تہذیب اور تاریخ سے عبارت ہے۔ آج جو لوگ اس زبان کو ختم کرنا چاہتے ہیں وہ دراصل زبان نہیں بلکہ ایک

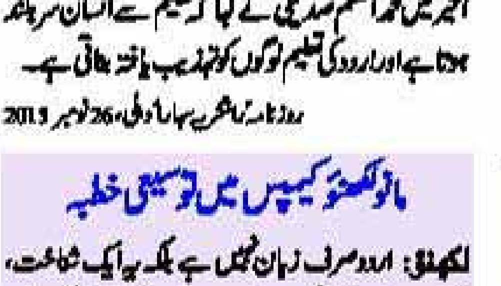

پوری تہذیب، تاریخ اور طرز معاشرت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے ممتاز ادیب اور شاعر پروفیسر خالد محمود نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں توسیعی خطبے کے دوران کیا۔ کیمپس کی انچارج ڈاکٹر وسیم بیگم نے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر خالد محمود نے ہر جگہ اردو زبان اور تہذیب کی وکالت کی ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے پروفیسر خالد محمود کے علمی کارناموں سے طلبہ کو روشناس کرایا۔ ڈاکٹر عشرت ناہید نے شکریے کے کلمات ادا کیے۔ انھوں نے کہا کہ طلبہ کے لیے یہ ایک سنہری موقع ہے کہ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت سے ملاقات کر رہے ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اردو زبان کی جو موجودہ صورت حال ہے اس کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ ہم نے اپنے گھروں سے اس زبان کو نکالا ہے۔ انھوں نے طلبہ سے کہا کہ حالات کا شکوہ کرنے کے بجائے محنت اور کوشش کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مجاہد الاسلام، ڈاکٹر نور فاطمہ موجود تھیں۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' علی گڑھ، 18 نومبر 2015

جشن اردو تقریب کا اہتمام

شاہجہاں پور: شاعر مشرق اور ماہر تعلیم علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے یوم پیدائش پر یہاں عربی فارسی مدارس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام جشن اردو تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں محبان اردو نے جوش و خروش کے ساتھ شرکت کی۔ اس موقعے پر اردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں رول ادا کرنے والی شخصیات کو اعزازات سے نوازا گیا۔

ایجان میرج لان جھنڈا کلاں میں پیر کو منعقد جشن اردو کا آغاز قاری امین مخشی نے تلاوت قرآن پاک سے کیا۔ مہمان خصوصی اترپردیش اردو اکادمی کے سابق چیئرمین ڈاکٹر یاسین علی عثمانی نے کہا کہ اردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ ایک پوری تہذیب ہے۔ اردو کے فروغ میں ہر فرد کو کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے فروغ میں مدارس عربیہ کے کردار پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مدارس اسلامیہ نے محمد علی جوہر، سرسید احمد خاں، مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے عظیم رہنما اس ملک کو دیے۔

مدارس کی تعلیم کا ہی اثر ہوتا ہے کہ وہاں مدرس، معلم، حافظ، امام، انسان بن کر نکلتے ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال کی شاعری کو آفاقی شاعری قرار دیا۔ ضلع اقلیتی بہبود افسر وریندر کمار نے کہا کہ اردو کی اہمیت سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ انھیں اس بات کی خوشی ہے کہ وہ ایک ایسے محکمہ کے افسر ہیں جو مدارس کی نگرانی کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ ان کی کوشش ہوگی کہ مدارس کے ذریعے مزید اردو کے فروغ کا کام انجام دیا جاسکے۔ صدر جلسہ شہر قاضی سید مسعود حسن نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ

مبارکپور گرلس ڈگری کالج میں بچوں کے مشاعرے کا منظر

شادی کی تقریب کے کارڈ اردو زبان میں شائع کرائیں۔ اس سے بھی اردو کو فروغ ملے گا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 11 نومبر 2015

سکندر آباد میں عالمی یوم اردو کا اہتمام

سکندر آباد: شاعر مشرق علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے تعلق سے عالمی یوم اردو بڑے ہی تزک و احتشام سے

منایا گیا۔ پروگرام کا انعقاد فیاض بیگم مسلم گرلز انٹر کالج میں کیا گیا جس کی صدارت حاجی عبدالحکیم ایڈووکیٹ نے کی جبکہ نظامت کے فرائض محترمہ عفت صاحبہ نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے حاجی آفاق الرحیم خاں نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہماری تہذیب قومی یکجہتی کی گواہ اردو ہے اردو ایک شیریں، سب کو گلے لگانے والی اور معاشرہ کی روح رواں ہے۔ اردو کو کسی مخصوص فرقے سے جوڑنا ایک گناہ عظیم ہے کیونکہ اردو کو سب نے اپنایا اور سبھی کو اردو نے عزت بخشی ہے۔ حاجی راشد علی صدر انجمن نے کہا کہ اردو نے بھائی چارے کے ساتھ جنگ آزادی کے پرچم کو بھی لہرایا۔ پروگرام کے صدر حاجی عبدالحکیم ایڈووکیٹ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ ہمارا سماج دہلی، 11 نومبر 2015

بچوں کا مشاعرہ

مبارکپور / اعظم گڑھ: اترپردیش اردو اکادمی کے زیر تعاون اور ملت گرلس انٹر کالج کے زیر اہتمام مبارکپور گرلس ڈگری کالج میں بچوں کے مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت چیئرمین نگر پالیکا ڈاکٹر شمیم احمد اور نظامت صبا آفرین نے کی۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا مشاعرہ تھا جس کی وجہ سے متعدد اسکول و کالج کی سیکڑوں طالبات نے اس میں شرکت کرکے ملت گرلس اور مبارکپور گرلس ڈگری کالج کی طالبات کے شیریں کلام سے لطف حاصل کیا۔ اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس میں صحافت سے تعلق رکھنے والے کئی افراد کی عزت افزائی کی گئی۔ طالبات نے معروف شعرا مخدوم محی الدین، بشیر بدر، احمد فراز، فیض احمد فیض، مرزا غالب، علامہ اقبال، تاجور سلطانہ اور شینہ ادیب کے کلام پیش کرکے داد و تحسین حاصل کی۔ آخر میں صحافی دنیش کمار موریہ، امجد منوشرما، مولانا جاوید چشتی، مولانا رحمت اللہ مصباحی اور ابوالفیض خلیلی وغیرہ کو ان کی صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے چیئرمین نگر پالیکا ڈاکٹر شمیم احمد کے بدست انعامات سے نوازا گیا۔ ساتھ ہی مشاعرے میں کلام پیش کرنے والی طالبات کو بھی انعامات و اسناد سے نوازا گیا۔ مشاعرے کا اختتام صدر مشاعرہ کے خطاب اور ہدیہ تشکر پر ہوا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 19 نومبر 2015

بہار:

ایک شام قاضی عبدالستار کے نام

پٹنہ: میری یادداشت میں شکیلہ آپا، اختر اورینوی اور کلیم الدین احمد کی یادیں سمائی ہوئی ہیں۔ انھیں یادوں کے سہارے بہار اردو اکادمی اور مشتاق احمد نوری کے پیہم اصرار نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کیا۔ بہار اردو اکادمی میں میری جس طرح پذیرائی کی گئی، میری پوری زندگی میں کبھی بھی ایسی پذیرائی نہیں ہوئی جس کے لیے میں اردو اکادمی کا ممنون ہوں۔

بہار اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ ایک شام قاضی عبدالستار کے نام پروگرام سے خطاب فرماتے ہوئے پروفیسر قاضی عبدالستار نے مذکورہ باتیں کہیں۔ انھوں نے اپنے مزاج اور فن کار کے مزاج کی بات کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ انانیت کوئی حتمی شے نہیں ہے، اس کا تعلق صلاحیت اور لیاقت سے براہ راست طور پر دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انانیت عذاب الٰہی نہیں بلکہ وہ رحمت الٰہی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انانیت کے بغیر تخلیق ممکن نہیں، تخلیق انانیت کی پابند ہے اور ادب کی ترقی انانیت کی محتاج ہے۔ اس یادگار شام سے خطاب کرتے ہوئے قاضی عبدالستار نے اپنے فکر و فن کی جالی انجانی گرہیں کھولیں اور اپنی زندگی کے نشیب و فراز میں سامعین کو جھانکنے کا موقع فراہم کیا۔ ان پر دو ڈاکیومنٹری فلمیں، اٹھارہ سے زیادہ تحقیقی مقالے، اٹھارہ ایوارڈ اور ایک درجن سے زائد کتابیں، ان کی خدمات کے سلسلے میں منظر عام پر آچکی ہیں۔

اپنے خطبہ استقبالیہ میں مشتاق احمد نوری، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے عظیم آباد کی سرزمین پر قاضی صاحب کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ قاضی صاحب کا بہار اردو اکادمی آنا ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہو گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ قاضی عبدالستار کی زندگی شہرت، عزت اور محبت کے محور کے ارد گرد گھومتی رہی ہے۔ شہرت اور عزت تو ان کے گھر کی داسی رہی ہے۔ لیکن محبت کے معاملے میں ان کی زندگی میں آج بھی ایک خلا محسوس ہو رہا ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ قاضی صاحب کی بیاسی سالہ زندگی میں صرف پینتالیس دن ایسے ہیں جو ان کی زندگی کے لیے خاص ہیں اور یہ وہ دن ہیں جو انھوں نے اپنی آخری بیوی تاجم سلطان کے ساتھ گذارے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ خلفشہ بہت ضروری ہے اور اس خلفشہ کو شروع سے آخر تک نبھانے والے شخص کا نام قاضی عبدالستار ہے۔

پروگرام کے شروع میں وزیر محترم جناب نوشاد عالم کی پذیرائی مومنٹو دے کر کی گئی، پھر قاضی عبدالستار کو وزیر محترم نے مومنٹو پیش کیا، اعجاز علی ارشد نے شال اوڑھائی اور مشتاق احمد نوری نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ایک خوبصورت سند کے ساتھ ایک خطیر رقم پیش کی۔ مہمانوں کی گل پوشی کے بعد علی گڑھ سے تشریف لائے ڈاکٹر راشد انور راشد نے قاضی صاحب پر ایک خوبصورت مقالہ پیش کیا جس میں ان کی زندگی اور مزاج کے تعلق سے بہت سی باتیں بتائی گئیں جس سے قاضی صاحب کی زندگی کو سمجھنے میں مدد ملی۔

اس موقعے پر پروفیسر اعجاز علی ارشد، جناب شفیع مشہدی، پروفیسر حسین الحق، پروفیسر عبدالصمد اور جناب شوکل احمد کے علاوہ جناب صفدر امام قادری نے بھی قاضی صاحب کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا جس سے قاضی صاحب کے فن اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملی۔ اس موقعے پر جناب حسن نواب حسن نے بھی اپنے تاثراتی کلام سے نوازا۔

اپنے صدارتی خطبے میں وزیر محترم جناب نوشاد عالم نے بہار اردو اکادمی کی ادبی اور علمی سرگرمیوں کی تعریف کرتے ہوئے اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری کے کام کی ستائش کی اور قاضی صاحب کی یہاں آمد کو ان کا ایک کارنامہ بتایا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بہار اردو اکادمی کو جو گرانٹ ملی ہے اس میں وزیر اعلیٰ محترم جناب نتیش کمار کی شفقت کا سب سے بڑا دخل ہے۔ انھوں نے اس بات کی امید کی کہ بہار اردو اکادمی ایسے پروگرام گاہے بگاہے کرتی رہے گی جس سے اکادمی کے ساتھ سرکار کا سر بھی اونچا ہوتا رہے گا۔ اس موقعے پر راشد انور راشد کی غزلوں کے البم کا اجرا وزیر محترم کے ہاتھوں کیا گیا اور پروگرام کے اخیر میں جناب جگ موہن نے کلیم عاجز، عالم خورشید اور راشد انور راشد کی غزلوں کو ساز اور آواز سے پیش کیا۔ اس موقع پر اردو اور سماجی حلقے سے بڑی تعداد میں لوگ موجود رہے۔

پریس ریلیز: مشتاق احمد نوری، سکریٹری بہار اردو اکادمی، 7 دسمبر 2015

تلنگانہ:

اردو یونیورسٹی جاب میلے میں 412 طلبہ کا انتخاب

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور یاتھوے ہیومن ریسورس پرائیویٹ لمیٹڈ کے اشتراک سے منعقدہ جاب میلے میں مختلف کمپنیوں نے مجموعی طور پر 412 طلبہ کو منتخب کیا ہے۔ اس جاب میلے میں 72 طلبہ صرف اردو یونیورسٹی سے منتخب ہوئے، جبکہ دیگر مقامات کے 340 طلبہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ پروفیسر عبدالواحد، ڈین اسکول آف کمپیوٹر سائنس اینڈ انفارمیشن ٹکنالوجی نے بتایا کہ اس جاب میلے میں 1,151 طلبہ نے حصہ لیا۔ اس میں اردو یونیورسٹی کے علاوہ تلنگانہ اور آندھرا پردیش، دونوں ریاستوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ بھی شامل تھے۔ 412 طلبہ منتخب ہوئے جن کا فیصد 35.79 رہا۔ جاب میلے میں مختلف شعبۂ حیات مثلاً آئی ٹی، مارکٹنگ، بینکنگ، فارمیسی، انجینئرنگ سے متعلق 35 سے زائد کمپنیوں نے حصہ لیا جن میں بطور خاص ایچ سی ایل ٹیکنالوجیز، آئی سی آئی سی آئی بینک، ایکسس بینک، فلپ کارٹ، ریلائنس، ہیکس (یو ایس)، ایکسیچر، ٹی سی ایس، کروی، پولارس اینڈ ورٹیکس وغیرہ شامل ہیں۔ حصہ لینے والے طلبہ کا تعلق ایم بی اے، ایم سی اے، ایم کام، آئی ٹی آئی، پالی ٹیکنیک، بی ٹیک، ایم ٹیک اور دیگر شعبہ جات سے رہا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 23 نومبر 2015

تفہیم آزاد عصری تناظر میں

حیدرآباد: مولانا نے ہندوستانی سیاست کو وہ قوت بخشی جس کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ سیدھے اور سچے راستے پر چلنا ان کا شیوہ تھا۔ وہ ایک عظیم مفکر، مدبر، اسکالر، ادیب، صحافی، عالم دین اور سیاست داں تھے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ ان کے ہر پہلو پر آج کام کرنے اور انھیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اردو یونیورسٹی میں مولانا آزاد و قارئین کے سلسلے میں منعقد کیے گئے سمپوزیم میں ملک کے نامور مفکر اور تاریخ داں اے جی نورانی نے کیا۔ وہ یہاں 'تفہیم آزاد عصری تناظر میں' موضوع پر خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نے اپنے شروعاتی دنوں ہی سے مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ وہ وہاں کی آزادی کی تحریکوں کو دیکھ چکے تھے۔ وہ اسلام کے اُس اصول پر کاربند تھے کہ کسی برائی کو ہوسکے تو ہاتھ سے روکیے، اس کے خلاف آواز اٹھائیے اور اگر یہ بھی نہیں ہوسکتا تو اسے اپنے طور پر برا سمجھیے۔

مولانا آزاد نے ہمیشہ ہندو-مسلم اتحاد کے لیے کام کیا اور گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیا۔ وہ متحدہ قومیت کے نظریے کے حامی تھے اور ملک کی تقسیم کے خلاف تھے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نے ہمیشہ سیکولر ایجوکیشن، مشترکہ قومی اقدار اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت پر زور دیا۔ پروفیسر عائشہ فاروقی، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، عثمانیہ یونیورسٹی نے کہا کہ مولانا آزاد ایک غیر معمولی اور چیلنج کو قبول کرنے والے مفکر و مدبر تھے۔ پروفیسر وہاب قیصر، ڈی ڈی ای نے 'فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور مولانا آزاد' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر آمنہ کشور، کوآرڈینیٹر پروگرام نے سمپوزیم کے عنوان پر روشنی ڈالی اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ محترمہ سلمیٰ اشرف، ریسرچ فیلو، آزاد چیئر نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ جدید خبر دہلی، 6 نومبر 2015

کرناٹک:

اکیسویں صدی میں اردو نظم

بنگلورو: 28 نومبر 2015 بروز سنیچر ساہتیہ اکادمی دہلی کے زیر اہتمام بنگلور کے معروف الامین کالج کیمپس میں 'اکیسویں صدی میں اردو نظم' کے عنوان سے ایک روزہ سمپوزیم منعقد ہوا جس میں دہلی سے حقانی القاسمی،

کرناٹک گلبرگہ سے سلیمان خمار، شموگا سے آفاق عالم صدیقی، بنگلور سے ماہر منصور، زبیدہ بیگم نے اپنے فکر انگیز مقالے پیش کیے۔ جلسے کی صدارت حیدرآباد سے تشریف لائے ہوئے مصحف اقبال توصیفی نے کی جو ایک نامور شاعر بھی ہیں جبکہ بنگلور کی معروف شاعرہ شائستہ یوسف اور معروف افسانہ نگار سلمیٰ صنم، مشہور ادیبہ حلیمہ فردوس اور خلیل احمد اور دیگر شاعر و ادیبوں نے بھی شرکت کی۔ اس سمپوزیم کو ساہتیہ اکادمی کی رکن محترمہ شائستہ یوسف نے نہایت خوبی سے آرگنائز کیا۔

بحوالہ: اردو نیٹ، جاپان، 30 نومبر 2015

مہاراشٹر:

یوم اردو تعلیم

جڑچرلہ: علامہ اقبال ایک بڑے مفکر اور عظیم المرتبت شاعر تھے اپنی شاعری کے ذریعے انھوں نے قوم کی

رہنمائی کی اور قوم کو ایک پیغام دیا۔ علامہ اقبال نے اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے انسانیت کی رہنمائی کی ان کی شاعری انسانی زندگی کو راہ راست پر لگانے کا ایک بہترین کارگر وسیلہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر عزیز سہیل لیکچرار ایم وی ایس ڈگری کالج محبوب نگر نے ادارہ ادب اسلامی جڑچرلہ میں یوم اردو و یوم تعلیم کے موقعے پر گورنمنٹ ضلع پریشد ہائی اسکول بادے پلی سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولانا آزاد کی شخصیت بہت بلند تھی اور وہ مجاہد آزادی تھے انھوں نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اپنی تحریروں وتقاریر کے ذریعے قوم میں جوش وولولہ انگیزی نے پیدا کی۔ اس جلسے سے خطاب کرتے ہوئے محمد علی دانش صدر ادارہ ادب اسلامی جڑچرلہ نے طلبا وطالبات کو مشورہ دیا کہ وہ ان عظیم شخصیات کی زندگیوں کا مطالعہ کریں اور اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے سخت محنت وجستجو سے اپنے مقصد کو حاصل کریں۔ جلسے کی صدارت رئیس فاطمہ معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول بادے پلی نے انجام دی۔

پریس ریلیز: جلیل رضا ادارہ ادب اسلامی، محبوب نگر، 14 نومبر 2015

اعزاز و اکرام:

شمیم طارق کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

نئی دہلی: اردو کے ممتاز نقاد وشاعر اور کالم نگار شمیم طارق کو ان کی تنقیدی کتاب 'تصوف اور بھکتی' پر ساہتیہ

اکادمی ایوارڈ 2015 دینے کا اعلان کیا گیا۔ اردو کے معاصر تنقیدی منظرنامہ پر شمیم طارق کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک وسیع المطالعہ ادیب و نقاد ہیں۔ اب تک ان کی ڈیڑھ درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ہر کتاب اپنے موضوع اور انداز تحریر کے اعتبار سے مختلف ہے۔ تصوف اور بھکتی کی ادبی شعری روایت نے اردو ہی نہیں ہندوستان کی تمام زبانوں کی ادبی شعری روایت کو مستحکم کرنے میں اپنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ شمیم طارق نے اپنی کتاب 'تصوف اور بھکتی' میں تصوف اور بھکتی کے حقیقی مفاہیم تک رسائی کے علاوہ دونوں کا تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا حاصل یہ ہے کہ تصوف اور بھکتی کا مذہبی اور تاریخی پس منظر الگ الگ ہے۔ دونوں میں مالک وخالق کا تصور بھی الگ الگ ہے۔ لیکن صوفیوں اور بھکتوں نے جس مذہبی رواداری، انسان دوستی اور وسیع المشربی کا مظاہرہ کیا ہے اس میں بڑی مشابہت ہے۔ اس مشابہت سے ان کی اس دردمندی کا اظہار ہوتا ہے جو ان کے دلوں میں انسان اور دیگر مخلوقات کے لیے ہے۔ انھیں کئی اداروں نے اپنے انعامات واعزازات سے بھی نوازا ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2015 کے لیے اردو کے جیوری ممبران میں عبدالصمد، اختر الواسع اور پرتپال سنگھ بیتاب شامل تھے۔ میٹنگ کی صدارت اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندربھان خیال نے کی۔

پریس ریلیز: ستیش ورما، پروگرام آفیسر ساہتیہ اکادمی نئی دہلی 17 دسمبر 2015

غالب انعامات 2015

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایوارڈ کمیٹی کی ایک اہم میٹنگ 18 نومبر کو ایوان غالب میں جسٹس آفتاب عالم کی صدارت میں ہوئی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر شریف حسین قاسمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر میٹنگ میں موجود تھے۔ اس اہم موقعے پر تمام ممبران نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے پروقار غالب انعامات 2015 کے 6 اہم انعامات پر فیصلہ کیا۔ اردو کے ممتاز ناقد ودانشور، کئی اہم کتابوں کے مصنف اور شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ پروفیسر انیس اشفاق کو ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تحقیق وتنقید اعلان کیا گیا۔ فارسی کے نامور اسکالر اور ذاکر حسین کالج دہلی یونیورسٹی کے فارسی کے سابق استاد ڈاکٹر محمد مرسلین (دہلی) کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تحقیق وتنقید کے لیے منتخب کیا گیا۔ معروف افسانہ نگار جناب شفیع جاوید (پٹنہ) کا نام غالب ایوارڈ برائے اردو نثر کے لیے طے کیا گیا۔ عہد حاضر کے نامور شاعر سلطان اختر (پٹنہ) کا نام غالب انعام برائے اردو شاعری کے لیے تجویز کیا گیا۔ ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈرامہ کے

ڈاکٹر محمد مرسلین

پروفیسر انیس اشفاق

شفیع جاوید

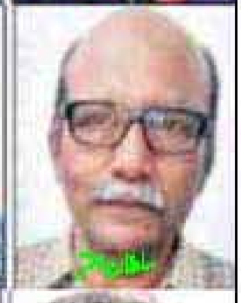

سلطان اختر

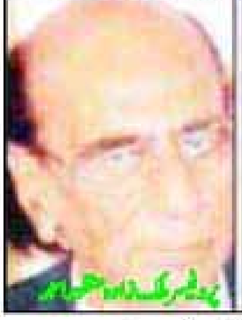

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

اسلم پرویز

لیے مشہور ڈرامہ نگار اور اپنی تحریر کے ذریعے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اپنا اہم کردار ادا کرنے والے ڈرامہ نویس جناب اسلم پرویز (دہلی) کے نام پر اتفاق ہوا اور مجموعی ادبی خدمات کے لیے ممتاز شاعر، کئی کتابوں کے مصنف اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق استاد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے نام پر میٹنگ میں بیٹھے تمام لوگوں نے اتفاق کیا۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 20 نومبر 2015

ندیم ماہر سرلیش اور چندوسوی کو انعام

نئی دہلی: بزم فراز ادب کے زیر اہتمام دوحہ قطر سے آئے شاعر ندیم ماہر اور سرلیش چندوسوی کے اعزاز میں استقبالیہ شعری نشست کا غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں انعقاد کیا گیا جس کی صدارت آصف اعظمی نے کی اور نظامت کے فرائض انیس فیضی نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر معراج الدین شکیل شفائی، ملک زادہ جاوید اور آدیش تیاگی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ادبی وسماجی خدمات کے اعتراف میں بزم کی جانب سے سرفراز احمد فراز دہلوی، اسعد امروہوی اور نوشاد احمد کے ہاتھوں ندیم ماہر، سرلیش چندوسوی، راجندر کلکل، آصف اعظمی اور راکیش شرما کو ایوارڈ پیش کیا گیا اور ندیم ماہر کی تصنیف 'دستکوں کے نشان' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ملک کے نامی گرامی شعرا نے اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 6 نومبر 2015

سید عبدالرافع کو ایوارڈ

پٹنہ: معروف صحافی سید عبدالرافع کو ان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں بہار اردو اکادمی کے صحافتی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ اردو اکادمی کے نائب صدر سلطان اختر کے ہاتھوں یہ ایوارڈ انھیں دیا گیا۔ نائب صدر نے انھیں مجموعی خدمات کے لیے مومنٹو اور مشتاق احمد نوری سکریٹری اکادمی نے انھیں توصیفی سند کے ساتھ 51 ہزار کا چیک بھی مرحمت فرمایا۔ اس موقعے پر صحافی سید راشد احمد بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 26 نومبر 2015

سردار سلیم کو ایوارڈ

حیدرآباد: نامور شاعر، ادیب، نقاد، صحافی اور کالم نگار سردار سلیم کو ان کی کتاب 'چناچور' کے لیے تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکادمی نے انعام سے نوازا ہے۔ منتخب انشائیوں پر مشتمل سردار سلیم کی یہ آٹھویں تصنیف ہے۔ قبل ازیں راگ بدن، دھیان کی رحل، رات رانی، خواب نگر (غزل نظم) اور پلکوں سے چن کر (حمد و نعت) کے علاوہ تحقیق و تنقید میں ان کی دو کتابیں 'مکاشفات' اور 'کوکب حیدرآبادی شخصیت اور شاعری' شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کو ریاستی اردو اکادمی نے اور دیگر قومی اداروں نے گراں قدر انعامات سے نوازا ہے۔ مسٹر سردار سلیم شہر حیدرآباد کے مشہور روزنامہ 'اعتماد' کے بچوں کے ضمیمہ 'پھلواری' اور 'بچپن' کے انچارج کے علاوہ کالم نگار بھی ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 ستمبر 2015

ڈاکٹر مسرور الحسن بہار فراق ایوارڈ سے سرفراز

گورکھپور: 29 نومبر ادبی ادارہ راز سوشل کمیٹی کے سلور جبلی کے موقعے پر معروف شاعر بہار گورکھپوری گورکھپور کے پریس کلب ہال میں ڈاکٹر عزیز احمد کے بدست فراق ایوارڈ 2015 سے نوازے گئے۔ مذکورہ پروگرام کی صدارت گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر محمد رضی الرحمن صاحب نے کی۔ نظامت کمیٹی کے جنرل سکریٹری راز اعظمی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عزیز احمد نے فراق گورکھپوری کی شخصیت و شاعری پر بھرپور روشنی ڈالی۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر محمد رضی الرحمن صاحب نے ڈاکٹر بہار گورکھپوری کو فراق ایوارڈ پانے پر مبارکباد پیش کی اور بہار گورکھپوری کا شعری مجموعہ 'نوائے بہار' کی رسم اجرا پر انھیں بہت بہت مبارکباد دی۔ راز سوشل کمیٹی کے صدر ہری بنس سنگھ ہربنش نے شعرا و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

راز اعظمی، جنرل سکریٹری، راز سوشل کمیٹی، جعفرا بازار، گورکھپور، 29 نومبر 2015

صحافیوں اور شعرا کو ایوارڈ

دیوبند: اردو ادبی تنظیم چراغ ادب کے زیر اہتمام ایک پروگرام کا انعقاد بھائیلہ روڈ پر سٹی کلب میں کیا گیا جس کا افتتاح سماجی کارکن ایوب بیگ نے کیا، شمع روشن جمعیۃ علماء ہند دیوبند کے جنرل سکریٹری عمیر عثمانی نے کی جبکہ صدارت نامور ادیب و شاعر تاجدار تاج نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر میونسپل بورڈ کے سابق چیئرمین انعام قریشی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر علاقہ کے چنندہ شعراء، ادبا اور صحافی حضرات کو اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر تاجدار تاج نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو زبان کسی خاص مذہب یا کسی خاص طبقے کی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے ہر شہری کی زبان ہے جو عوامی رابطوں کو مضبوط کرتی ہے اور محبت کے جذبات کو بیدار کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کچھ لوگ سیاست کے تحت اسے مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں مگر زبان کسی کی جاگیر نہیں ہوتی۔ نامور قلم کار و معروف ادیب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے اردو کے حوالے سے کہا کہ اردو زبان آپسی بھائی چارہ اور پیار و محبت کی علمبردار ہے۔ جنگ آزادی میں اس زبان نے اہم کردار ادا کیا۔ پروگرام کے کنوینر شمس دیوبندی نے کہا کہ یہ سچ ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے مشاعرہ بڑے پلیٹ فارم ہیں جو اردو کو غیر اردو داں کے قریب لے جاتے ہیں۔ جو اردو سیکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، اردو صرف زبان نہیں ہے بلکہ ایک شناخت، تہذیب سے عبارت ہے۔ جو اپنی مثال آپ ہے اس لیے یہ زبان خاص و عام میں مقبول ہوئی اور وقت نے دیکھا کہ یہ زبان سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے پوری دنیا میں مقبول ہوئی اور اب بھی کچھ لوگ جو اس زبان کی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ ہمارے لیے قیمتی اثاثہ اور سرمایہ ہیں اور وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ شمس دیوبندی نے کہا کہ ادبی تنظیم چراغ ادب نے صحیح سمت میں قدم اٹھایا ہے۔ اس دوران نامور ادیب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کو چراغ ادب ایوارڈ برائے ادب و صحافت، شاعر ماسٹر نسیم کرچھوی، محشر آفریدی کو برائے شعری خدمات ایوارڈ سے نوازا گیا جبکہ صحافیوں میں وسیم عثمانی، رضوان سلمانی، عارف عثمانی، سید ہاشمی، فہیم اختر صدیقی، سمیر چودھری، فیروز خان کو اردو صحافت میں نمایاں خدمات انجام دینے پر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آخر میں کنوینر شمس دیوبندی نے بھی حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 نومبر 2015

رسم اجرا:

اردو ادب کے ارتقا میں دارالمصنفین کا حصہ

نئی دہلی: 'اردو ادب کے ارتقا میں دارالمصنفین کی خدمات' بے مثال ہیں۔ دارالمصنفین علم و ادب کی دنیا میں ایک بیش قیمت ادارے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بانی علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت لاجواب تھی جنھوں نے اس ادارے کی تعمیر و تشکیل میں اپنی بہترین صلاحیتیں

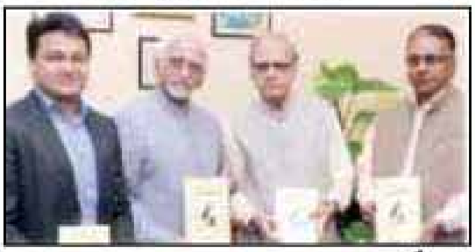

صرف کیں۔ ان خیالات کا اظہار نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری نے معروف محقق اور صحافی ڈاکٹر خاور ہاشمی کی کتاب 'اردو ادب کے ارتقا میں دارالمصنفین کا حصہ' کے اجرا کی تقریب کے دوران کیا، جو نائب صدر کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی تھی۔ اس موقعے پر صاحب کتاب ڈاکٹر خاور ہاشمی نے کہا کہ دارالمصنفین کے بانی علامہ شبلی نعمانی پہلے ادیب ہیں جنھوں نے یہ محسوس کیا کہ تصنیف و تالیف ایک جزوقتی مشغلہ نہیں ہے بلکہ یہ ادیب کی مکمل توجہ، انہماک اور یکسوئی چاہتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "زیر نظر کتاب میں اس ادارے کے 1979 تک کے تصنیفی کارناموں کا جائزہ شامل ہے جو سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اس موقعے پر سینئر صحافی اور ادیب معصوم مرادآبادی نے کہا کہ اردو زبان و ادب کی گذشتہ دو ڈھائی سو سال کی تاریخ میں علامہ شبلی کی شخصیت خاص امتیازات کی حامل رہی ہے۔"

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 نومبر 2015

اردو کے بہترین افسانے

علی گڑھ: اترپردیش اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ فکشن اپنے دور کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اردو فکشن نے ہر دور میں سماج کی مثبت رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ وہ جامعہ اردو علی گڑھ میں علینا پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹیڈ کی شائع کردہ اردو کے ممتاز قلم کار اویس جمال شمسی کی ترتیب کردہ کتاب 'اردو کے بہترین افسانے' کا اجرا اردو کے عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ ہمیشہ مثبت سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ رجسٹرار مسٹر مضمون رضا نقوی نے توقع ظاہر

کی کہ علیزا پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع یہ کتاب اردو ادب کے قارئین کے لیے ایک قیمتی تحفہ ثابت ہوگی۔ اردو کے بہترین افسانے کے مرتب مسٹر ویلی بھال شمسی نے مہمانان، علیزا پبلی کیشنز اور جامعہ اردو علی گڑھ کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ جدید خبر دہلی، 20 نومبر 2015

مصادر سیرت نبوی

نئی دہلی: ”مصادر سیرت نبوی علمی اور تحقیقی کتاب ہے اس سے طالب علموں کے ساتھ ساتھ اساتذہ کو بھی اصل

ماخذ اور مصادر سے استفادے کا موقع ملے گا اور فائدہ ہوگا۔“ ان خیالات کا اظہار نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری نے اپنی رہائش گاہ پر آئی او ایس کے ذریعے شائع کردہ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی کی کتاب ’مصادر سیرت نبوی‘ کا اجرا کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز (آئی او ایس) کا یہ پروجیکٹ اگر مکمل ہو جاتا ہے تو ایک انسائیکلو پیڈیا تیار ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب کی پہلی جلد کے پہلے صفحے پر ہی اسلامی تاریخ کے اسلامی مورخین کا ذکر ہے جس سے مستقبل میں تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب کافی مفید ثابت ہوگی۔ آئی او ایس چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم نے اسے ادارے کے لیے تاریخی لمحات بتاتے ہوئے کہا کہ نائب صدر جمہوریہ نے سیرت کی اس کتاب کا اجرا کیا۔ انھوں نے کہا کہ آئی او ایس نے 1986 میں اپنے قیام سے اب تک کم و بیش 400 اہم علمی و تحقیقی منصوبوں کو پورا کیا ہے۔ 1200 عالمی علاقائی کانفرنس اور سیمینار کا انعقاد کیا۔ 400 سے زائد وقیع کتابوں کو شائع کیا۔ جمعیۃ العلما ہند کے ترجمان و سکریٹری مولانا عبدالحمید نعمانی نے کہا کہ اس طرح کی کتاب کسی بھی زبان میں نہیں ہے۔ 49 اصل ماخذ و مصادر کے تعارف کے ضمن میں 273 کتابوں کو اس کتاب میں موضوع بحث بنایا گیا جو بڑا کام ہے۔ جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا سید جلال الدین عمری نے مصادر سیرت کو اردو میں سب سے جامع کوشش بتاتے ہوئے کہا کہ تحقیق و تنقید کے ساتھ اس کتاب کے ماخذ کی عملی حیثیت کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے ناظم عمومی مولانا اصغر امام مہدی سلفی نے اسے قابل قدر کارنامہ بتاتے ہوئے کہا کہ سیرت دنیا اور سماج کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے کہا کہ سیرت کا موضوع ایسا ہے جس پر کتابوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا اور یہ رونق دنیا تک باقی رہے گا۔ اکیسویں صدی میں اس موضوع پر جو کتابیں آئی ہیں ان میں پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کی مصادر سیرت نبوی بہت اہم کتاب ہے۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی نے کتاب پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

روزنامہ جدید خبر دہلی، 21 نومبر 2015

ضرب احساس

لکھنؤ: ادبی تنظیم ’شہر ادب‘ کے زیر اہتمام معروف شاعر رہبر جونپوری کے پہلے شعری مجموعے ’ضرب احساس‘ کی رسم اجرا پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے دست مبارک سے ان ہی کی رہائش گاہ واقع سیمانت نگر کلیان پور میں عمل میں آئی۔ معروف شاعر و ادیب انور جلال پوری بحیثیت مہمان خصوصی اور مہمان اعزازی رہبر جونپوری کے علاوہ دوسرے خصوصی شرکا میں ڈاکٹر احسن رضوی، قومی ایکتا فورم کے صدر ارشد اعظمی اور انیس قادری کے نام قابل ذکر ہیں۔ تقریب اجرا کی صدارت سیاسی و سماجی رہنما اور اردو تحفظ و ترقی بورڈ کے چیئرمین وسیم حیدر نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ہارون رشید نے انجام دیے۔ اس موقعے پر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ رہبر جونپوری غزلوں میں بندش الفاظ کے نگینے جڑ کر صرف مرصع سازی نہیں کرتے بلکہ ہمارے افکار و خیالات کی تربیت بھی کرتے ہیں۔ انور جلال پوری نے رہبر جونپوری کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ رہبر کی غزلوں اور نظموں میں خوبصورت فنی اور فکری اظہار کے علاوہ ایک مثبت پیغام بھی موجود ہے جو ان کی شاعری کو لائق اعتبار و احترام بناتا ہے۔ وسیم حیدر نے کہا کہ رہبر جونپوری کے کلام میں عظمت رفتہ کی تاریخ کا اس طرح بیان ملتا ہے کہ اس سے ذہنوں میں قوت عمل اور حرکت عمل کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ ان کے یہاں قومی، ملی اور اجتماعی انسانی فکر کا اظہار ہے۔ رہبر جونپوری نے اپنے تاثرات میں کہا کہ ’ضرب احساس‘ غزلوں اور نظموں پر مشتمل میرا پہلا شعری مجموعہ ہے، اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری کتاب عالمی شہرتوں کے حامل پروفیسر ملک زادہ منظور احمد جیسی عظیم ادبی شخصیت کے دست مبارک سے منصۂ شہود پر آرہی ہے۔ تقریب میں پرویز ملک زادہ، عابد علی اعظمی، محمد جاوید اقبال، ممتاز احمد، راجیو پرکاش ساحر، غفران قدوائی، سید اشفاق، پشتم خان اور جناب حیدر علی پوری وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ سیاسی تقدیر دہلی، 24 نومبر 2015

عکس حیات

نئی دہلی: جنوبی دہلی کے گرین پارک میں ڈاکٹر جگدیش جین کی رہائش گاہ پر حلقہ تشنگان ادب کی 477 ویں ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر جگدیش جین کو 94 ویں یوم پیدائش پر شرکا نے مبارکباد دی۔ عکسی فکر وانچی نے آپ کو شال اوڑھا کر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ آپ کے پہلے مجموعۂ کلام عکس حیات کا رسم اجرا بھی ڈاکٹر جی آر کنول، وقار مانوی، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی اور حلقے کے سکریٹری سیماب سلطانپوری کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ عکس حیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ظفر نے کہا کہ جگدیش جین اصل اردو کے سپاہی ہیں۔ آپ کی ہر دل عزیزی ان کی غیر متنازعہ شخصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اردو کو اوڑھنا بچھونا بنانے والا شاعر آج اردو زبان و ادب سیکھنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ شرکا نے مہر فاؤنڈیشن دہلی مہاراشٹر سے زیور طباعت سے آراستہ ہونے پر مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 24 نومبر 2015

باران رحمت

نئی دہلی: المدد فاؤنڈیشن اور آئی آر اے ڈی ایجوکیشن کے زیر اہتمام غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں سیمینار و کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر معروف شاعرہ محترمہ تسیم نیازی کے شعری مجموعے ’باران رحمت‘ کا رسم اجرا مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت اعظم گڑھ سے تشریف لائے پرنسپل جج سید جمال الدین نے کی جبکہ نظامت کے فرائض انس فیضی نے انجام دیے۔ المدد فاؤنڈیشن کی تعلیمی سرگرمیوں کی ستائش کی۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم ترقی کا زینہ ہے اور سب کو مل کر تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرنا چاہیے۔ راشدہ باقی حیا نے تمام

مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے المدد فاؤنڈیشن کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ مہمانان میں چوتھی دنیا کی ایڈیٹر محترمہ وسیم راشد، سلامت اللہ عرفان اعظمی، اشہر ہاشمی، پرمود کمار اشر نے شرکت کی۔ اس موقعے پر فاؤنڈیشن کی جانب سے احمر جلیسری کو سپاس نامہ پیش کیا گیا جسے معروف شاعر اسیر امروہوی نے پڑھ کر سنایا۔ آخر میں کنوینر سلمان علی اور ارم سلمان نے مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 28 نومبر 2015

جذبات دل

آگرہ: میر اور غالب جیسے شاعروں کی ادبی زمین آگرہ میں یوں تو موجودہ وقت میں بہت شاعر ہوئے ہیں، جو اپنے قلم کے ذریعے اردو زبان کا پیغام عالمی سطح تک پہنچا رہے ہیں اور اردو ادب کی زمین کی بنیاد مضبوط کرنے میں مصروف ہیں، ان میں ایک خاص نام ہے ساگر فتح پوری جن کا قلم اور کتاب شہر کے ساتھ دیگر شہر میں بھی مشہور ہے۔ اردو ڈے کے مبارک موقعے پر ان کی نئی کتاب 'جذبات دل' کا اجرا شہر کے مشہور تعلیمی ادارہ صغیر فاطمہ گرلس کالج صدر بھٹی پر ہوا، جس میں مہمانان کے طور پر اتر پردیش کانگریس کے نائب صدر اوپیندر سنگھ نے شرکت کی۔ صدارت حاجی

جمیل الدین قریشی نے کی، کتاب کا اجرا کرتے وقت اوپیندر سنگھ نے کہا کہ اردو زبان گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے، کچھ سیاسی لوگ اردو زبان کو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں، جبکہ یہ غلط ہے یہ ہماری ملک کی زبان ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو آپس میں محبت پیدا کرتی ہے۔ شاعر ساگر فتح پوری نے کہا کہ ہمیشہ میری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے قلم کے ذریعے عوام کو کوئی نہ کوئی پیغام دوں۔ اس میں بہت حد تک کامیاب ہوں۔ روزنامہ 'خبریں' دہلی، 10 نومبر 2015

عیدگاہ سے واپسی

میرٹھ: بزم اردو، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور سید اطہر الدین میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے نئے افسانوی مجموعے 'عیدگاہ سے واپسی' کا اجرا مہمان خصوصی عزت مآب عزیز قریشی (سابق گورنر اتراکھنڈ، اترپردیش، میزورم) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس پروقار تقریب کی صدارت شیخ الجامعہ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی،

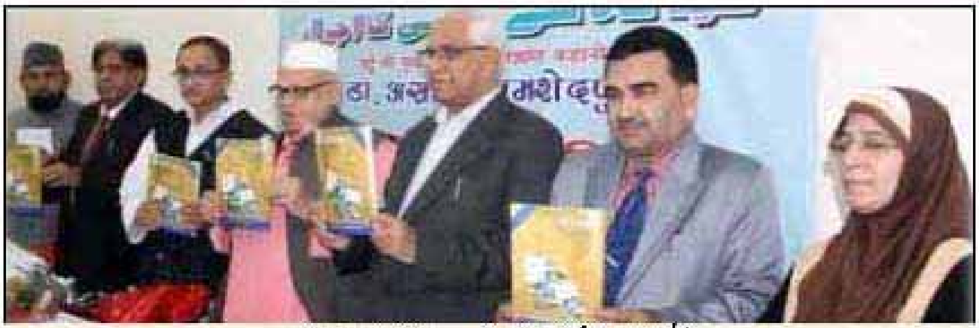

اسلم جمشید پوری کی کتاب 'عیدگاہ سے واپسی' کے اجرا کا منظر

پروفیسر این کے تنیجا نے کی اور مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے سابق وزیر حکومت اتر پردیش ڈاکٹر معراج الدین اور نائب شہر قاضی محترم زین الراشدین شریک ہوئے جب کہ خصوصی مقرر کے طور پر راجستھان سے تشریف لائے پروفیسر فاروق بخشی (صدر شعبۂ اردو، اودے پور یونیورسٹی) نے شرکت کی۔ استقبال ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت کے فرائض ڈاکٹر فرقان سردھنوی اور شکریہ کی رسم سید اطہر الدین میموریل سوسائٹی کے صدر، محترم سید معراج الدین نے ادا کی۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کی جانب سے قومی اتحاد کے علمبردار محترم عزیز قریشی کو پہلے "منشی پریم چند قومی ایوارڈ 2015" سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ انھیں چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر این کے تنیجا نے پیش کیا۔ محترم عزیز قریشی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسلم جمشید پوری کی کہانیاں سماج کا موجودہ منظرنامہ ہیں۔ خصوصاً گاؤں اور قصبات کو انھوں نے جس طرح سے کہانیوں کا موضوع بنایا ہے اس سے پریم چند کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ میں انھیں 'عیدگاہ سے واپسی' کی اشاعت پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' علی گڑھ، 22 نومبر 2015

کویت میں ادبی پیش رفت

نئی دہلی: اردو زبان نے اب برصغیر کی سرحدوں کو پار کرکے نئی بستیاں بسا لی ہیں۔ یوروپ اور امریکہ کے علاوہ خلیجی ممالک اب اردو کا گہوارہ ہو چکے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے شائقین کی ایک بڑی آبادی ان ممالک میں مقیم ہے اور آئے دن ادبی و شعری محفلوں کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ غیر ممالک میں اردو کی ادبی پیش رفت پر اکثر و بیشتر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ کویت میں مقیم معروف شاعرہ نثر نگار مسز افروز عالم نے 'کویت میں ادبی پیش رفت' کے عنوان سے ایک مبسوط کتاب ترتیب دی ہے۔ دہلی کی ادبی، تعلیمی و ثقافتی تنظیم 'معراج' کے زیر اہتمام مذکورہ کتاب کا اجرا 13 نومبر 2015 شام چھ بجے غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں بدست مسٹر عمران حسین، وزیر برائے خوراک و رسد، حکومت دہلی اور ڈاکٹر ماجد دیوبندی، وائس چیئرمین اردو اکادمی، دہلی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 19 نومبر 2015

وفیات:

جمیل الدین عالی

کراچی: معروف شاعر اور ادیب جمیل الدین عالی کراچی میں انتقال کر گئے۔

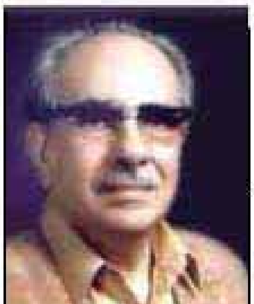

جمیل الدین عالی کے والد اور دادا بھی شاعر تھے۔ وہ معروف کالم نگار اور بینکر بھی رہے۔ جمیل الدین عالی 20 جنوری 1926 کو دہلی میں پیدا ہوئے اور قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرکے کراچی آئے۔ ان کی عمر 89 برس تھی۔ جمیل الدین عالی کو کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ان کی نماز جنازہ اور تدفین 24 نومبر بروز منگل کراچی میں کی گئی۔ ان کے انتقال پر صدر ممنون حسین، وزیر اعظم نواز شریف اور سیاسی رہنماؤں نے تعزیت کی اور گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 نومبر 2015

محبوب الرحمٰن فاروقی

نئی دہلی: ماہنامہ 'آجکل' کے سابق ایڈیٹر محبوب الرحمٰن فاروقی کا 30 نومبر 2015 کو انتقال ہوگیا۔ وہ 73 برس کے تھے۔

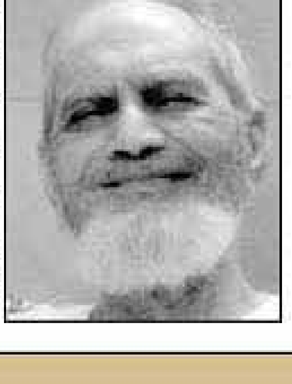

پسماندگان میں اہلیہ ثریا فاروقی کے علاوہ 3 بیٹے محمود فاروقی، مسعود فاروقی اور مشہود فاروقی ہیں۔ بعد نماز ظہر ان کی نماز جنازہ جامعہ ملیہ

اسلامیہ کی جامع مسجد میں ادا کی گئی اور قبرستان بٹلہ ہاؤس میں انھیں سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کردیا گیا۔ محبوب الرحمٰن فاروقی 1942 میں مشرقی یوپی کے شہر گورکھپور میں پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے کریئر کا آغاز 1970 میں سینٹرل انفارمیشن سروس سے کیا تھا۔ وہ 1974 سے 1977 تک گورکھپور میں فیلڈ پبلسٹی آفیسر کے طور پر تعینات رہے۔ انھوں نے وزارت اطلاعات ونشریات کے محکمے پی آئی بی میں بھی خدمات انجام دیں۔ 1979 سے 1990 تک وہ آل انڈیا ریڈیو گورکھپور سے وابستہ رہے اور سینٹرل مانیٹرنگ سروس نئی دہلی میں بھی خدمات انجام دیں۔ 1990 سے 2002 تک انھوں نے پبلی کیشن ڈویژن کے ادبی ماہنامے 'آجکل' کے ایڈیٹر کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ ان کے اداریوں اور متفرق مضامین کے دو مجموعے 'مکالمہ' اور 'مضامین ہفت رنگ' منظر عام پر آئے۔ انھوں نے حفیظ جونپوری پر ایک مونوگراف بھی ترتیب دیا تھا۔ وہ ایک غریب پرور اور خدا ترس انسان تھے۔ مرحوم کے جنازے میں ممبر پارلیمنٹ پرویز ہاشمی کے علاوہ پروفیسر کنول احمد فاروقی، پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر ابرار رحمانی، دارین شاہدی، معصوم مراد آبادی، انیس اعظمی، حسن ضیاء، اطہر فاروقی، عابد کرہانی، شاہد انور، خورشید اکرم اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے دیگر نمائندے شریک تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 دسمبر 2015

سعید جعفری

نئی دہلی: بالی ووڈ اور برٹش سنیما کے بزرگ اداکار سعید جعفری 86 سال کی عمر میں اتوار کے روز انتقال کرگئے۔ اداکار کی موت کی خبر ان کی بھانجی شاہین اگروال نے فیس بک پر دی۔ ان کے لواحقین میں تین بیٹیاں ہیں۔ جعفری کو گاندھی، شطرنج کے کھلاڑی، حنا، رام تیری گنگا میلی، دل، کرشن کنہیا، گھر ہو تو ایسا، راجہ کی آئے گی بارات، دیوانہ مستانہ، محبوبہ، جب پیار کسی سے ہوتا ہے، آنٹی نمبر ون، الیلا جیسی فلموں میں ان کی بہترین اداکاری کے لیے جانا جاتا ہے۔ تقریباً نصف صدی پر محیط جعفری نے تقریباً 200 فلموں میں اداکاری کی۔ انھوں نے جان ہوسٹن، جیمز آئیوری، ڈیوڈ لین، رچرڈ اٹن برو اور اسٹیفن فریئرز سمیت کئی معروف ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا۔ وہ گاندھی (ولبھ بھائی پٹیل کا کردار)، دی مین ہو ووڈ بی کنگ اور اے پیسیج ٹو انڈیا میں اپنی اداکاری کے باعث مغربی فلم بینوں میں کافی مقبول ہوئے کے ساتھ ساتھ بالی ووڈ میں بھی انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں اور ستیہ جیت رے کی 'شطرنج کے کھلاڑی' اور اندر کمال کی 'دل' کے علاوہ چشم بددور اور معصوم جیسی کئی ہندی فلموں سے خوب نام کمایا۔ سعید جعفری برطانیہ کے ٹی وی کردار کے طور پر بھی کافی مشہور رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 نومبر 2015

اشفاق اعظمی

نئی دہلی: قومی آواز کے سب ایڈیٹر اشفاق اعظمی کا 16 نومبر 2015 کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وہ کافی دنوں سے ذہنی تناؤ کا شکار تھے۔ انھیں بعد نماز عشا بٹلہ ہاؤس قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ نماز جنازہ بلال مسجد کے امام مولانا نعیم نے پڑھائی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 17 نومبر 2015

سماجی کارکن ماسٹر فرید احمد کا انتقال

نئی دہلی: اردو اور اردو اساتذہ کے حق کی لڑائی لڑنے والے سماجی کارکن ماسٹر فرید احمد کا 12 دسمبر 2015 کو دل کا دورہ پڑنے سے اچانک انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 52 سال تھی۔ پسماندگان میں دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ ماسٹر فرید احمد چودھری ہاؤس واقع

سرودیہ بال ودیالیہ میں ٹیچر تھے۔ دریا گنج میں ایک کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ، دہلی پبلک اسکول، انگلش میڈیم اسکول نیو پبلک اسکول ان ہی جدوجہد کا ثمرہ ہیں۔ ماسٹر فرید احمد کو اردو کا سپاہی کہا جاتا تھا، انھوں نے اردو زبان اور اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے مسلسل جدوجہد کی اور کئی اردو اداروں اور اردو والی حضرات کے ساتھ مل کر غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ کئی سیاسی، سماجی اور مذہبی تقریبات کے انعقاد میں پیش پیش رہتے تھے۔ لوک سبھا الیکشن کے دوران انھوں نے دہلی الیکشن کمیشن کے ساتھ مل کر ووٹرس کو بیدار کرنے کی مہم میں بھی حصہ لیا تھا اور کئی سرکاری تقریبات میں نظامت بھی کی۔ اردو کے لیے کام کرنے والوں اور پڑھائی میں نمایاں نمبرس حاصل کرنے والے طلبہ کو بھی ان کی جانب سے ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ ان کے انتقال سے اردو حلقہ خاص طور سے پرانی دہلی میں غم کا ماحول ہے۔ سابق کونسلر محمود ضیاء اور قومی محاذ کے صدر حافظ جاوید نے ان کے انتقال پر رنج وغم کا اظہار کیا۔ سیرت النبی کمیٹی کے صدر حاجی قیام الدین، عمر دین، حاجی شاہ محمد نعیم، عالم بھائی، منصور ضیاء نے بھی ماسٹر فرید کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی مغفرت کی دعا کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 دسمبر 2015

خراج عقیدت:

مولانا آزاد کے یوم پیدائش پر تقریب

نئی دہلی: امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے 127 ویں یوم ولادت کے موقعے پر دہلی کی آئی سی سی آر کی جانب سے انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب میں شامل ہونے

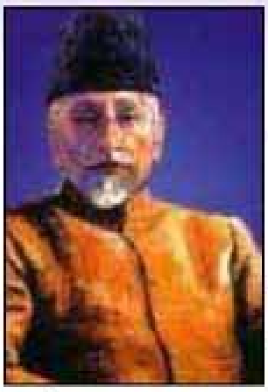

والوں میں آئی سی سی آر کے ڈائرکٹر جنرل سی راج شیکھر، ڈپٹی ڈائرکٹر محترمہ نمرتا کمار، خانوادۂ آزاد کے چشم وچراغ اور معروف تعلیم داں فیروز بخت احمد، سماجی کارکن مولانا علیم الدین اسعدی اور معروف قانون داں بہار برقی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ان کی کارکردگیوں نیز نظریات آزاد پر اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی ابتدا قاری محمد ساجد کے تلاوت کلام پاک سے ہوئی۔ اس کے بعد قاری کے مدرسہ سے آئے طلبا کے ذریعے قرآن خوانی برائے ایصال ثواب مولانا ابوالکلام آزاد کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فیروز بخت احمد نے تفصیلی طور پر مولانا ابوالکلام آزاد، مسلمانوں کے تعلیمی حالات ودیگر مسائل پر روشنی ڈالی۔ آئی سی سی آر کے ڈائرکٹر جنرل سی راج شیکھر نے سلیس اردو زبان میں مولانا آزاد کے تعلق سے کہا کہ مولانا آزاد نے ملک کو تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر تعلیمی سرگرمیوں کا عملی خاکہ پیش کیا تھا۔ وہ آج تک لائق عمل وقابل تحسین ہے۔ انھوں نے بتایا کہ آئی سی سی آر کے علاوہ ملک کے آئی آئی ٹی، ساہتیہ اکادمی، مختلف زبانوں کی اکادمیاں ساہتیہ ونرتیہ کلا اکادمی آئی سی ایس آر وغیرہ جیسے ادارے قائم کرکے ملک کو ترقی کی قومی شاہراہ پر گامزن کیا۔ اس موقعے پر معروف دانشور ومعروف قانون داں بہار برقی کے علاوہ مولانا علیم الدین اسعدی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 13 نومبر 2015

علامہ شبلی نعمانی کے یوم وفات پر جلسے کا انعقاد

اعظم گڑھ: علامہ شبلی نعمانی کو سب سے بڑا خراج عقیدت یہ ہوگا کہ علامہ کے مشن و مقصد کو سمجھا جائے اور اس کے

مطابق اپنی ذمے داری کو بحسن و خوبی انجام دیا جائے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے منیجر نیاز احمد جمالی نے علامہ شبلی نعمانی کے یوم وفات پر کالج میں منعقد ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ مولانا عمیر الصدیق ندوی نے کہا کہ آج علامہ شبلی نعمانی کی معنویت و پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ شبلی نعمانی نے کہا تھا کہ تاتاریوں نے مسلمانوں کا جو قتل عام کیا، اس کا غم نہیں ہے، لیکن 1857 میں جو انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیب، زبان و ادب، علوم وفنون اور مذہب پر حملہ کیا ہے وہ ہلاکو اور چنگیز کے حملے سے بھی خطرناک ہے، کیونکہ کسی قوم کی جب تہذیب مٹ جاتی ہے تو اس کا کچھ نہیں بچتا۔ ڈاکٹر علاء الدین صدر شعبہ تاریخ نے کہا کہ قومی و ملی خدمات میں سرسید اور شبلی نعمانی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ہندوستان میں جدید تعلیم کے تعلق سے جو بیداری مسلمانوں میں ہے وہ سرسید اور شبلی نعمانی کی بدولت ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کے سامنے ایک عظیم الشان یونیورسٹی کا تصور تھا اور آج شبلی کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کی بے حد ضرورت ہے۔ اس موقعے پر محمد ناظم اصلاحی نے شبلی نعمانی کے نظریات پر تقریر کی۔ الف بانو نے پروگرام میں ایک مقالہ پیش کیا اور طالب علم محمد ہاشم نے شبلی کی نظم شہر آشوب اسلام پیش کی۔ انتظامیہ کمیٹی کے صدر رضوان احمد فاروقی نے پروگرام کی صدارت اور ڈاکٹر شباب الدین نے نظامت کی۔ پروگرام کا آغاز حافظ غیاث الدین کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں انتظامیہ کمیٹی کے ذمے داران، اساتذہ، طلبا اور معززین شہر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 نومبر 2015

علامہ اقبال کو خراج عقیدت

دیوبند: شاعر مشرق علامہ اقبال کے یوم پیدائش پر شعرا و دانشوران نے اس عالمی یوم اردو پر محبان سے اپیل کی ہے کہ وہ اردو کی بقا و تحفظ کو یقینی بنانے کی خاطر اپنے گھروں اور عوامی بول چال میں اس لطافت آمیز زبان کو

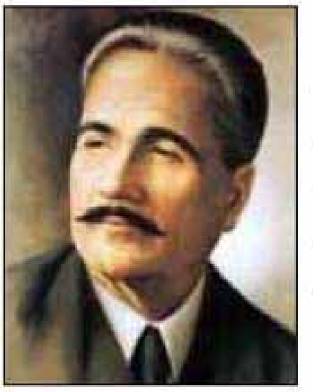

رواج دیں، تا کہ نئی نسل اس شیریں زبان کی تاریخ اور اس کی افادیت سے صحیح طریقے پر آشنا ہوسکے۔ اس بابت عالمی شہرت یافتہ شاعر و اردو اکادمی یوپی کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے یوم اردو پر برادران وطن کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ زبان نہ صرف ہماری تہذیب و روایت کی امین و ترجمان ہے بلکہ جنگ آزادی اور آزاد ہندوستان کی تعمیر و تشکیل میں اس زبان نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور یہ ان اعلیٰ و ارفع قدروں کی ترجمانی کرتی ہے جو ملک میں قومی یکجہتی و جذباتی ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہیں اور جس کو مذہب وملت سے اوپر اٹھ کر تمام شریف و ادب پسند انسانوں نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ محبان اردو کو چاہیے کہ وہ اس کی ترویج واشاعت میں بھرپور کردار ادا کریں، تا کہ ہمارے ملک میں ایک ایسا صالح معاشرہ جنم لے جس کا خواب مجاہدین آزادی نے دیکھا تھا۔ پروفیسر حامد حسین نے یوم اردو پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال کے عہد میں متحدہ ہندوستان تھا اور ان کی وفات کے بعد یہ سانحہ ہوا کہ ہندوستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ علامہ اقبال کو یہی سچی خراج عقیدت ہوگی کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علمبردار اردو کی تعمیر و ترقی کے لیے محبان اردو مثبت جدوجہد کریں۔ ممتاز ادیب و نامور قلمکار مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے کہا کہ محبان اردو اردو رسم الخط کو حتی الامکان فروغ دیں اس سے ہماری اردو کا مستقبل محفوظ ہوگا اور نئی نسل خود اس کی تاریخ اور حلاوت سے بہتر طریقے پر آشنا ہوسکتی ہے۔ دیگر شرکا کے علاوہ فیض یوتی سینٹر کے صدر و شاعر ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے کہا کہ یوم اردو ہمیں اقبال کی حب الوطنی اور قوم پرستی کا درس دیتا ہے جس پر چل کر ہمیں اردو زبان و ادب کی خدمت کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ سچا خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ہم زیادہ سے زیادہ علامہ اقبال کے پیغام کو پوری دنیا میں پھیلائیں۔

روزنامہ 'منصف' دہلی، 9 نومبر 2015

ڈاکٹر محمد مظہر عالم کی وفات پر تعزیتی نشست

نئی دھلی: شعبۂ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر محمد مظہر عالم کے انتقال پر آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس اور شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کی مشترکہ تعزیتی نشست شعبۂ عربی کے سیمینار ہال میں منعقد کی گئی۔ صدارت ایسوسی ایشن کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے کی۔ ڈاکٹر اصغر محمود کی تلاوت کلام پاک سے نشست کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر سید حسنین اختر استاذ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے کہا کہ ڈاکٹر مظہر عالم ایک کامیاب و محنتی استاذ کی حیثیت سے طلبہ میں مقبول تھے۔ ان کا بیشتر وقت طلبہ کے افادے کے لیے وقف تھا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نعیم الحسن اثری نے بتایا کہ ڈاکٹر مظہر عالم مغربی چمپارن کے بتیا ضلع میں واقع سرا گاؤں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کرنے کے بعد ندوۃ العلما سے فراغت حاصل کی۔ بعدازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ گذشتہ کئی برسوں سے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری، جموں و کشمیر میں شعبۂ عربی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ پروفیسر محمد نعمان خان نے کہا کہ ڈاکٹر محمد مظہر عالم نے دوران تدریس عربی زبان و ادب سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اس موقعے پر شعبے کے اساتذہ ڈاکٹر مجیب اختر، ڈاکٹر محمد اکرم، ڈاکٹر ظفیر الدین قاسمی، ڈاکٹر ریاض احمد ریاضی کے علاوہ شعبے کے اسٹاف فہیم اختر ندوی، مسٹر محمد سلیم، اشیش کمار، چودھری سمیر سنگھ اور شعبے کے طلبہ و ریسرچ اسکالر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 نومبر 2015

صحافی باقر حسین شاذ کے انتقال پر اظہار تعزیت

نئی دھلی: آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس نے اپنے آرگنائزنگ سکریٹری اور روزنامہ 'ساز دکن' حیدرآباد کے ایڈیٹر محمد باقر حسین شاذ کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ کانفرنس کے صدر اور سابق ممبر پارلیمنٹ م افضل نے کہا کہ مرحوم باقر حسین شاذ انتہائی بے باک اور سرفروشانہ طبیعت کے صحافی تھے۔ انھوں نے کبھی مصلحت کوشی اور مفاد پرستی کو اپنا شعار نہیں بنایا اور تمام عمر اعلیٰ صحافتی اقدار کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے سکریٹری معصوم مرادآبادی نے کہا کہ باقر حسین شاذ اردو صحافیوں کی اس نسل کے آخری نمائندے تھے جس نے صلے اور ستائش کی تمنا کے بغیر ملک و قوم کی خدمت کی اور کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوئے۔ اسی موقعے پر مودود صدیقی نے بھی اظہار تعزیت پیش کی۔ خیال رہے کہ ان کا گذشتہ دنوں طویل علالت کے بعد حیدرآباد میں انتقال ہوا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 دسمبر 2015

کتاب میلے کی تصویری جھلکیاں

URDU DUNIYA Monthly, January-2016, Vol.18, Issue:01
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication 24/12/2015
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

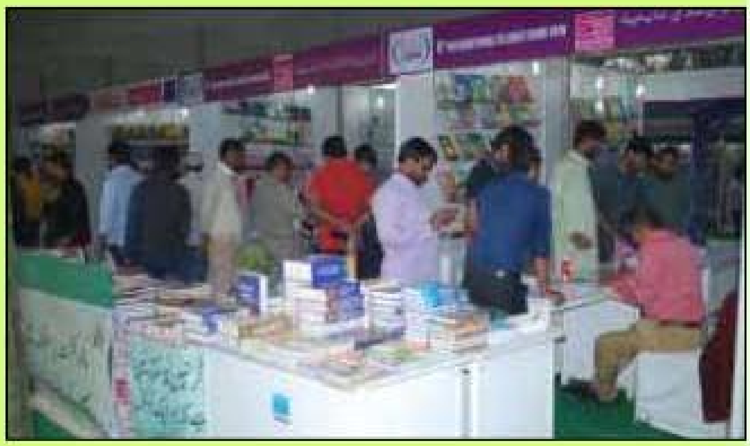

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025